قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ 2022 قیمت 15₹

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

2021

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

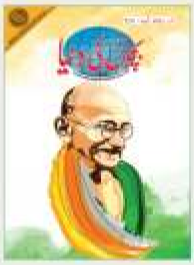

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 040 - 24415194

ماہنامہ اردو دنیا دھلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:24،شمارہ:03،مارچ2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین:عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPULاور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhiکے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات		4

خطوط

ربط والتفات	قارئین کے خطوط	5

زبان و تعلیم

املا، ہجا، ہکاری، مصمتے اور تشدید کا عمل	یحییٰ نشیط	8
مناظر احسن گیلانی کا نظریہ تعلیم	وارث مظہری	11

ادب: زاویے اور جہات

اردو سفرنامہ: فن اور روایت	ضیاء الرحمٰن صدیقی	13

قصیدے کی تدریس اور ظفر احمد صدیقی	مشیر احمد	18
ظہیر دہلوی کی شعری کائنات	صابر علی سیوانی	22
خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری	محمد نوشاد احمد	27

جائزہ

2021 کا فکشن اور فکشن تنقید	اسلم جمشید پوری	30

خاکہ رنگ و روپ

عارف خورشید: نو رنگ خاکہ نگار	قاضی نوید	35
اردو کا پہلا خاکہ اور خاکہ نگار	ارشاد آفاقی	37

لعل و گہر

فخر مالوہ: عمیق حنفی	غلام حسین	41
پروفیسر فارق اور عربی اردو ترجمہ نگاری	محمد اکرم السلام اعظمی	45

ولی الرحمٰن کاکوی: حیات اور ادبی کاوشیں	محمد مجاہد حسین	48

تاریخ و تہذیب

ہندوستان میں فارسی تاریخ نگاری کا آغاز وارتقا	شہناز بیگم	51
فورٹ ولیم کالج کی تاریخی تصنیفات کا جائزہ	حنا کوثر	55

خصوصی گفتگو

پروفیسر مجاور حسین (ابن سعید) سے خصوصی ملاقات	ساجد جلالپوری	58

کتاب دریچہ

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا	رفیع الدین ناصر	61

ٹیکنالوجی

پروسیس اپروچ اردو زبان میں لکھنے کی صلاحیت میں اضافے کا باعث	جرار احمد	63

نیا آسماں نئے ستارے

مابعد نوآبادیاتی اجبار اور برصغیر کا ثقافتی منظرنامہ	ظہور احمد گنائی	67
خواجہ جاوید اختر کا شعری اور ادبی تخیل	شاہد علی	70

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ	ادارہ	72

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں	ادارہ	82

ہماری بات

اردو ہمارے ملک کی وہ زبان ہے جو اپنے عہد کے تقاضوں سے ہمیشہ ہم آہنگ رہی ہے اور عصری مطالبات کا اس زبان نے خاص طور پر التزام رکھا ہے۔ جب ملک کو آزادی کی ضرورت تھی تو اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے آزادی کے لیے آواز اٹھائی اور باشندگانِ ہند کے سینوں میں آزادی کی روح پھونکی۔ جب محبت، یگانگت اور اتحاد و یکجہتی قائم کرنا وقت کا اہم تقاضا ٹھہرا تو اردو نے گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ملک و سماج سے جڑا ہوا شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر اردو میں کچھ نہ لکھا گیا ہو۔ حتیٰ کہ صنعت و زراعت، باغبانی اور دیگر موضوعات پر بھی اردو میں کتابیں تحریر کی گئیں، لیکن اب صورت حال قدرے تبدیل ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ اب ان موضوعات پر اردو میں کم لکھا جارہا ہے جو آج کی ضرورت ہیں۔ یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے اور ہم ڈیجیٹل ایج میں جی رہے ہیں۔ لوگ زمین کی سطح سے اوپر اٹھ کر خلاؤں میں پرواز کررہے ہیں اور دوسرے سیاروں پر زندگی کی تلاش میں مصروف ہیں۔ سائنسی ایجادات و اکتشافات کا ایک طویل سلسلہ اس دور میں قائم ہو چکا ہے۔ اسی کے ساتھ سماجی علوم و فنون کا بھی ہر طرف بول بالا ہے۔ اس لیے اب ہمیں عصری تقاضوں اور مطالبات کا خیال رکھتے ہوئے ان موضوعات پر زیادہ توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے جن سے ہمارے ملک اور معاشرے کو فائدہ پہنچے اور یہاں کے مکینوں کو نئی راہ، نئی روشنی ملے۔ اس سے نہ صرف سماجی اور سائنسی تقاضوں کی تکمیل ہوگی بلکہ اردو کی ان نثری اور شعری اصناف کا بھی احیا ہو پائے گا جو مردہ ہو چکی ہیں یا ہونے کے قریب ہیں، افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کے اس سائنٹفک عہد میں بھی اردو کے بہت سے ادبا و شعرا وقت کے اہم مطالبات پر کان دھرنے کی بجائے جام و سبو، گل و بلبل اور زلف و رخسار یا موضوعاتی تکرار میں الجھے ہوئے ہیں۔ موضوعات میں تکرار و یکسانیت کی وجہ سے اب بہت سے لوگوں کو وحشت سی ہونے لگی ہے۔ نئے زاویے کی جستجو کا رجحان تقریباً ختم ہوتا جارہا ہے۔ وہی موضوعات اور مباحث جن پر سیکڑوں کتابیں اور مقالے لکھے جاچکے ہیں ان کے اعادے کی ہی کوشش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے اردو زبان و ادب کا دائرہ موضوعاتی سطح پر سمٹتا اور سکڑتا جارہا ہے۔ جب کہ آج وسائل کی فراوانی ہے اور بہت سی راہیں بھی کھلی ہوئی ہیں ایسے میں ضرورت ہے کہ موضوعاتی سطح پر وسعت پیدا کی جائے اور نئے نئے موضوعات تلاش کیے جائیں تاکہ اردو زبان و ادب کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو، مگر المیہ یہ ہے کہ عصری دانش گاہوں میں بھی بہت سے تحقیقی مقالے ایسے لکھے گئے ہیں اور لکھے جارہے ہیں جن کے موضوعات میں بھلے ہی لفظوں کی معمولی تبدیلی نظر آتی ہو، مگر مشمولات حقیقی معنوں میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال صرف تحقیقی مقالوں ہی کی نہیں بلکہ ان مضامین کی بھی ہے جو ادبی رسائل کے لیے لکھے جارہے ہیں اور شائع ہو رہے ہیں۔ اس کا اندازہ مختلف ادبی رسائل کو سامنے رکھ کر بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ عام طور پر یہ مضامین چند مشہور شخصیات اور ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ جب کہ قریات اور قصبات میں بہت سی باکمال شخصیات ہیں جو گمنام ہیں مگر ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایسی شخصیات کی قدر شناسی آج کے وقت کی اہم ضرورت ہے۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارا ادب صرف چند ناموں میں محصور و محدود ہو کر رہ گیا ہو۔ اس محدودیت سے اردو زبان و ادب کو نکالنا چاہیے۔ صرف چند ہی تخلیقات، تنقیدی گفتگو کا موضوع بنتی ہیں یہ بھی ایک افسوس ناک رویہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو کی عظیم شخصیات کے حوالے سے کچھ نہ لکھا جائے، ضرور لکھا جائے مگر نئے زاویے اور گوشے تلاش کیے جائیں۔

اردو میں بہت سے ادبی رسائل نکلتے ہیں۔ ہر رسالے کا اپنا ایک معیار، منہج اور مزاج ہوتا ہے۔ اس کی اپنی پالیسیاں اور ترجیحات ہوتی ہیں۔ رسائل کا مقصد علمی اور ادبی مباحث کے ذریعے لوگوں کے تنقیدی شعور کو بیدار کرنا ہوتا ہے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے قلمکار رسالے کے مزاج، منہج اور معیار سے آگاہ نہیں ہو پاتے اور ایسی تخلیقات رسائل میں بھیجتے ہیں جن کی اشاعت میں بہت سی تکنیکی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا بھی اپنا ایک مزاج ہے۔ یہ تمام تر نظریاتی تنازعات سے پاک اور صاف رسالہ ہے۔ یہاں ان مباحث کے لیے قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے جن سے غیر ضروری تنازعات جنم لیں۔ صاف ستھرا، شفاف، فکر انگیز اور معنی خیز ادب پیش کرنا ہی ماہنامہ 'اردو دنیا' کا مقصد اور منشور ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

✉ فروری کے شمارے کے اداریے میں مدیر صاحب نے اردو زبان، بالخصوص کتاب کلچر کے فروغ میں زیادہ سے زیادہ سرگرمی لانے کی فوری ضرورت کی جو خط کشی کی ہے، وہ دورِ حال کا فوری تقاضا ہونے کے سبب لائق صد ستائش ہے۔ اسلم آزاد صاحب نے اپنے مضمون میں مخدوم محی الدین کی شاعری میں عشق ومحبت اور انقلابی تصور کا محاکمہ کیا ہے۔ محترمہ سیدہ نسیم سلطانہ نے اپنے معیاری مقالے میں 8 ناول نگاروں کے تمام اہم ناولوں کے موضوعات کا تجزیہ پیش کرنے میں کوئی بھی کمی نہیں کی۔ ان کے تمام ناولوں میں تقسیم ہند و پاک کے دردناک المیے کو نشان زد کیا گیا ہے۔ سماجی تعصب کے نقصانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مضمون میں معدودے چند اغلاط عجلت میں درآئی ہیں مثلاً ص 26 پر دوئم کالم میں 'کو کی بجائے' 'کی' لفظ درکار تھا۔ اگلے ص پر 'اسکالر' لفظ کی جگہ 'اسکالرز' لفظ ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر مسرت جہاں نے بہار کے اردو فکشن کی تنقید، روایت اور صورت حال پر کیا ہے۔

کیپٹن ایم ایم شیخ نے عالم و فاضل ادیب عبدالودود انصاری کے ساتھ جو مشافہ (مصاحبہ) پیش کیا ہے، اس میں ان کے سائنسی موضوع پر مضامین بچوں کے استفادہ کے لیے بے بہا خدمات دستاویزی اہمیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی شمارے میں آخری مضمون (مصنف سنیل کمار) '1857 کے بعد اردو شاعری میں حب الوطنی کا تصور' ہے۔

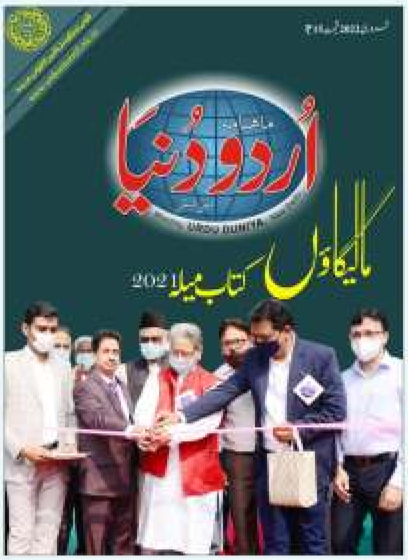

اگرچہ یہ مضمون مضمون نگار کی شب و روز کی عرق ریزی کا ایک نمایاں ثبوت فراہم کرتا ہے، تاہم مضمون کی سرخی میں 'حب الوطنی' (حالانکہ اردو زبان میں یہ غلطی سے مروجہ بھی ہو چکا ہے) لفظ کی بجائے 'حب الوطن' صحیح لفظ درکار تھا۔

آخری صفحہ 98 پر اردو کے شہرۂ آفاق شاعر ابراہیم اشک کے جنت نشین ہو جانے کی اذیت ناک خبر ہے۔ موصوف نے اردو زبان کے علاوہ ہندی میں بھی متعدد کتب تصنیف کی تھیں۔ نظموں، غزلوں، دوہوں اور افسانوں کی کتب ان کے ذوق وشوق کا ثبوت دیتی ہیں۔ ان کا یہ ایک شعر ہی ان کی شعری عظمت و منزلت کا صاف و شفاف آئینہ ہے۔

خدا کا ذکر کریں یا تمھاری بات کریں ہمیں ہے عشق سے مطلب کسی کی بات کریں

زبیر الحسن غافل کا یہ شعر (ص 40) ان پر کاملاً صادق آتا ہے۔

بے نام آدمی جو سرِ شام ہو گیا سورج کے شہر میں وہ اندھیرا ہی کر گیا

ڈاکٹر کرشن بھاوک : کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

✉ 'اردو دنیا' جنوری 2022 نئے سال کی دعاؤں بھری مبارکباد کے ساتھ وصول پایا۔ سرورق پر ابھرتا سورج اور خوبصورت عبارت بڑا دلفریب منظر پیش کر رہے ہیں۔ یہ پیام بھی دلکش ہے کہ ہم اپنے اہداف کے حصول میں پورے سال سرگرم رہیں۔ اردو پڑھیں، پڑھائیں اور محفلیں آراستہ کریں۔ نظمیں اور بیانیے تحریر کریں۔ مگر آج کل قارئین کم اور مصنفین ان سے زیادہ ہوتے جارہے ہیں۔ بڑی دشوار صورت حال ہے۔

98 صفحات کے اس بھاری بھرکم مجلّے میں کوئی 16 اصناف سخن اور ان کے ذیل میں کم و بیش 28 ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ 'ربط و التفات' میں چار خطوط ہیں۔ 'ادب' کے تحت پانچ مضامین ہیں، پہلا مضمون 'اردو ادب میں خواتین کی نیرنگیاں' (ص 9) میں پہلا جملہ ''........ معاشرہ وجودِ زن کے بغیر نامکمل'' ہے۔ اس میں نامکمل کے بجائے 'ناپید' یا 'لاوجود' رکھا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ باقی مضمون ہمدردانہ ہے لیکن تمام مرد و زن یکساں نہیں ہوا کرتے۔ 'تحقیق میں اخلاقیاتی ملحوظات' (ص 16) بہت عمدہ

مضمون اور حسب حال ہے، لیکن کچھ نکات میں تفصیل طوالت اختیار کرگئی ہے۔ ان کے بعد باقی مضامین جیسے 'تیج بہادر سپرو.....' (ص 13) 'قاضی عبد الغفار.....' (ص 20) 'کرشن چندر.....' (ص 22) میں شخصیتوں کے گن گان ہیں۔ اسے سراہا جاسکتا ہے لیکن ان میں مصنف پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ تحریر ایسی ہو کہ قاری مصنف پر غور کرے۔

'افسانہ سمت اور امکانات' میں 'بیسویں صدی کا افسانوی ادب.....' (ص 25) یہ دراصل بیسویں صدی میں افسانوی ادب کی مختصر مگر تقریباً مکمل روداد ہے جسے بڑے سلیقے سے بیان کیا گیا ہے۔ 'اردو اور ادب اطفال' میں تین اچھے مضامین شامل ہیں۔ ان میں 'سیوان میں ادب اطفال.....' بچوں کے ادب کی گویا مختصری تاریخ ہے۔ ویسے 'کامکس اور ادب اطفال' (ص 38) میں اچھے نکات اٹھائے گئے ہیں۔ اس مضمون سے بچوں پر لکھے جانے والے ادب میں رہنمائی ہوسکتی ہے۔ 'زبان و تعلیم' کے ذیل میں مضمون 'مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور قومی تعلیمی پالیسی' (ص 43) میں یہ خوش آئند اطلاع ہے کہ ہر بچے کو اس کی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دی جائے۔ قوی توقع ہے کہ اس میں وہ بچے بھی شامل ہوں گے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ 'خراج عقیدت' میں مضمون 'سحر سعیدی: ایک وضعدار شخصیت' (ص 45) عظیم ادیب ڈاکٹر عظیم راہی کا لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر عظیم راہی سے راقم الحروف کی گہری اور طویل واقفیت ہے۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ نہایت عمیق و عریض ہے۔ ان کی کتابوں کے حوالے ملک و بیرون ملک کے کئی ادیبوں کی تحریروں میں بطور ثبوت پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب بعنوان 'اردو میں افسانچہ کی روایت' میں تو ڈاکٹر عظیم راہی نے تحقیق و تنقید کی گہرائی و گیرائی کے حدود کو ناپ لیا ہے۔ ان سے ایسے ہی کسی معیاری مضمون کی توقع تھی۔ شخصیات پر توانائی صرف کرنے سے کون فائدہ حاصل ہوگا۔ 'سلسلۂ صحافت' میں 'اردو صحافت کی خشتِ اول' جام جہاں نما' (ص 48) اس مضمون میں 'جام جہاں نما' کلکتہ کو اولین اردو اخبار گردانا گیا ہے۔ یہ 1822 یعنی اب سے دو سو سال قبل شائع ہوا تھا۔ مگر خریداروں کی کمی کی وجہ سے فارسی میں جاری کیا گیا تھا۔ اگر فی الواقعی ایسا ہے تو اسے اولین اردو اخباروں میں شامل کرنے سے کیا امر مانع ہے۔ 'کتب خانے' (ص 51) میں 'امیر الدولہ پبلک لائبریری' کی ترقیاتی منازل کا ذکر ہے۔ 'سائنس اور سماجیات' میں دو قابل غور مضامین درج ہیں۔ 'دوسری زبانوں سے' میں 'احمقوں کی ٹولی' (ص 60) شامل ہے۔ 'عالمی ادبیات' میں 'بنارس میں فارسی ادب'' (ص 63) اچھا مضمون علمی انداز لیے ہوئے ہے۔ 'خصوصی گفتگو' (ص 66) میں جناب نوشاد عالم ندوی نے اُردو ادب کی مشہور و معروف شخصیت پروفیسر صادق سے لیا گیا انٹرویو پیش کیا ہے جس میں انھوں نے درحقیقت پروفیسر صادق کی صفات کے کئی ایسے روشن پہلو واضح کیے ہیں جن سے فی الواقعی کئی لوگ ناواقف تھے۔ 'نئے آسمان نئے ستارے' (ص 68) میں پھر ایک شخصیت کا ذکر خیر ہے کہ پروفیسر اکبر حیدری نے کئی دیوان، تذکرے اور شخصیتوں پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ 'کتابوں کی دنیا' (ص 73) کے تحت کوئی نو مطبوعات کا تعارف و تبصرے درج ہیں تاکہ منتخب کتاب/کتابوں کے حصول میں آسانی رہے۔ آخر میں 'خبرنامہ' (ص 81) میں اُردو دنیا کی کھٹی میٹھی خبریں درج ہیں۔ یہ تمام مواد مہینے بھر میں ذہنی مخزن معمور کرنے کے لیے کافی ہے۔

مصطفیٰ ندیم خان غوری: بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

'اردو دنیا' باقاعدگی کے ساتھ رو بروقت مل رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اچھا لگتا ہے کہ اس کی آن بان اور شان اسی طرح قائم ہے بلکہ کہا یہ جانا چاہیے کہ پچھلے دنوں اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ آپ کے گوش گزار میں یہ کردینا چاہتا ہوں کہ 'اردو دنیا' میں تخلیقی ادب کے لیے بھی گنجائش نکالی جانی چاہیے۔ وہ اس لیے کہ قریب قریب تمام مضامین، تبصرے اور خبریں وغیرہ آخر تو تخلیقی ادب کے سبب ہی ہیں۔ برسوں پہلے کا زمانہ یاد آتا ہے جب دہلی سے ہی ہزاروں کی تعداد میں شائع ہونے والا ادبی ماہنامہ 'بیسویں صدی' نکلتا تھا۔ اس کے سالنامے لاجواب اور یادگار ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والی نیم ادبی و فلمی 'شمع' نکلتی تھی۔ ان دونوں ہی ماہناموں میں اردو کے صف اول کے ادبا و شعرا کی تخلیقات ہوا کرتی تھیں۔ نئے لکھنے والے بھی ان میں دیکھے جاسکتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کیوں ایسا نہیں کرسکتے؟ ــــ یا تازہ شمارے میں تخلیقی ادب کے تحت عربی کہانی 'احمقوں کی ٹولی' (توفیق الحکیم، مترجم محمد قطب الدین) سے اس کی ابتدا مان لی جائے؟ مجھے یقین ہے کہ زیادہ تر قارئین ایسا ہی چاہتے ہیں۔

حبیب کیفی: عیدگاہ، جودھ پور، راجستھان

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

سید یحییٰ نشیط

املا، ہجا، ہکاری مصمتے اور تشدید کا عمل

انسان حیوان ناطق ہے۔ اپنی قوت گویائی کو عملاً برتنے کے لیے اس نے زبان ایجاد کی تا کہ وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکے۔ تبادلۂ خیالات کر سکے۔ ابتداء وہ اپنے خیال کی ترسیل کے لیے جسمانی حرکات (اشارات) اور منہ سے نکالی ہوئی مختلف قسم کی آوازوں کا استعمال کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ فطری آوازیں بولیوں میں تبدیل ہوئیں، لیکن ان بولیوں کو ثبات حاصل نہیں تھا۔ اس لیے انسان نے اپنے اطراف میں فطرت کے ذریعے بولیوں کے الفاظ کو متشکل کیا۔ یہی ابتدائی تصویری تحریر تھی۔ عرصے بعد یہ تصویری تحریروں نے ترقی کرتے کرتے رسم الخط کی صورت اختیار کر لی اور جغرافیائی و تمدنی حالات کے مطابق مختلف زبانوں کی مختلف تحریریں وجود میں آئیں۔ چنانچہ تقریباً 1800 ق۔م میں شام، فلسطین، کنعان اور سینا میں آباد سامی قوم نے رسم خط ایجاد کیا۔ یہ ابتدائی رسم الخط قدیم زمانے کے مٹی کی ٹھکریوں، برتنوں اور سنگی تختیوں پر پایا گیا لیکن رسم الخط کے ان حروف کے تلفظ اور ان کے ہجوں سے ہم تا حال بے خبر ہیں۔ اسی سامی رسم الخط سے عرصے بعد عبرانی، یونانی، آرامی فنیقی، لاطینی پہلوی، عربی وغیرہ رسم الخط وجود میں آئے۔ ادھر ہندوستان میں سنسکرت زبان کے رسم الخط براہمی، دیوناگری، موڑی، کیتھی، مہاجنی وغیرہ کو فروغ حاصل ہوا اگرچہ کہ دیوناگری ہی کا عام چلن رہا۔ مگر ہمارے لیے بڑا مسئلہ ان کی قرأت یا ان کے نظام ہجا کا ہے۔ اس بحث سے تو ہم اس نتیجے پر پہنچ ہی چکے ہیں کہ رسم الخط اور تلفظ میں باہم ربط ہے۔ قدیم رسم الخط حروف ہجا پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ ان حروف کو جوڑنے کے عمل سے الفاظ بنے اور ان کے صحیح تلفظ کے لیے اعراب یا حرکات پر غور کیا گیا اور ان کی شکلیں متعین کی گئیں۔ حرکات کے سہارے تلفظ بیانی علم ہجا کہلائی اور حروف کے صحیح جوڑ کی تکنیک کو املا کہا جانے لگا۔ اس طرح صحیح زبان دانی کے لیے املا، ہجا اور اعراب کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ بالخصوص مبتدیوں کے لیے ان کا سیکھنا ضروری قرار دیا گیا۔ چنانچہ زبان سکھانے والے مدرسین طلبا کی مؤثر تدریس، ان کی تفہیمی صلاحیت کو پروان چڑھانے اور تسہیل کاری کے عمل کو بڑھانے کے لیے املا اور ہجوں پر خصوصی توجہ دینے لگے۔

ہر زبان کی لفظ سازی کے لیے حروف تہجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حروف اعضائے نطق سے نکلی ہوئی آوازوں کی علامت ہیں۔ ہر زبان کی اپنی علاحدہ حروف تہجی ہوتی ہے۔ لفظ کی تشکیل سازی میں اعراب (حرکات وسکنات) کی مدد سے لفظ کے تلفظ کو متعین کیا جاتا ہے عربی، فارسی اور اردو میں یہ اعراب زبر یا فتح (َ) زیر یا کسرہ (ِ) اور پیش یا ضمہ (ُ) کہلاتے ہیں۔ قدرت نے انسان کو جو اعضائے نطق (حلق، صوتالہ یا حنجرہ، لہات، زبان، تالو، ناک، دانت، ہونٹ) بخشے ہیں، انھیں تلفظ کی صحیح ادائیگی کے لیے یہ اعراب ہی حرکت دیتے ہیں۔ گویا ہر زبان کا نظام تہجی اعراب ہی کے تابع ہوتا ہے۔ اس نظام تہجی کے دائرے میں جب زبان کے تکلمی عمل پر غور کیا جاتا ہے تو اسے 'علم ہجا' کہتے ہیں اور جب الفاظ کو اعراب کے مطابق ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے تو 'املا' کہلاتا ہے۔ حرکات وسکنات کی ان تین قسموں کے علاوہ مد (~) تشدید (ّ) تنوین (ً) بھی ہیں۔ تنوین کی علامتیں دو زبر، دو زیر یا دو پیش (ً ٍ ٌ) ہوتی ہیں اور جزم (ْ) بھی ایک

علامت ہے۔

ابتداء اردو کے کل 37 حروف تہجی تسلیم کیے گئے تھے۔

اب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض

ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ (ھ) ء ی ے (کل میزان 37)

ان کے علاوہ ہندی کی بعض آوازوں کو بھی اردو حروف تہجی میں شامل کر لیا گیا ہے۔انھیں دوچشمی ھ والےمخلوط حروف کہا جاتا رہا ہے۔ یہ حسب ذیل ہیں:

بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ رھ ڑھ کھ گھ لھ مھ نھ وھ اور یھ (کل میزان ۱۷)

بعد میں ماہرین لسانیات نے ان ہندی الاصل آزاد ہکاری بندیشیوں کو آزاد صوتیوں کے طور پر قبول کر لیا یعنی اب وہ مخلوط نہیں سالم آوازیں ہیں۔اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ پہلے جسے ب ھ (بھ) اور پ ھ (پھ) پڑھا جاتا تھا اب صرف بھ، پھ کہا جائے گا۔اس تبدیلی کی وجہ سے اردو حروف تہجی کے 'ب' اور 'بھ'، 'ت' اور 'تھ' 'چ' اور 'چھ' اپنی جگہ علاحدہ علاحدہ مصمتے شمار کیے گئے۔اردو املا کے تعلق سے یہ تمام سفارشات کمپیوٹر کی ایجاد سے پہلے کی ہیں بعد میں جب تحریر کے لیے کمپیوٹر کا استعمال ہونے لگا اور اردو KeyBoard بنانے کی نوبت آئی تو 'ن' اور 'ں' نونِ غنہ دو الگ الگ حروف تسلیم کیے گئے۔اس طرح مقتدرہ قومی زبان کے اجلاس 2004 میں کمپیوٹر، کتابت اور اشاریہ سازی کا خیال رکھتے ہوئے ڈاکٹر عطش درانی کے ایما پر اردو حروف تہجی کی کل تعداد 58 تسلیم کی گئی اور علامات میں زبر زیر پیش، کھڑا زبر، کھڑا زیر، مد اور تنوین کو شامل کیا گیا لیکن ان میں تشدید کا کہیں ذکر نہیں۔حالانکہ یہی وہ علامت ہے جو ہکار آوازوں کو آزاد مصمتے سمجھنے کی حالت میں تشدید کے استعمال سے ہجوں کے عمل میں مسئلہ پیدا کر دیتی ہے اور اس مسئلے کا حل سوائے ان ہندی الاصل حروف کو مخلوط حروف سمجھنے کے کچھ بھی نہیں۔

الفاظ کا اعراب یا حرکات کی مدد سے تلفظ کرنے کے عمل کو 'ہجے کرنا' کہا جاتا ہے۔ابتدائی جماعتوں میں زبان کی تدریس کا یہ مؤثر عمل مانا گیا ہے۔عربی مدارس میں ابتدائی قاعدے (کتابیں) اسی نہج پر پڑھائی جاتی ہیں، حتیٰ کہ دیوناگری کا نظام ہجا کو جسے عرف عام میں 'بارہ کھڑی' کہا جاتا ہے اسے بھی 'کانا'، 'ماترا'، 'ایکار'، 'اوکار' (علامتوں) کی مدد ہی سے پڑھایا جاتا ہے۔ بہرحال! تحریر کی اسی صورت گری کے لیے املا Orthography اور ہجے Spelling نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر املا اور ہجا درست نہ ہوں تو عبارت غیر معتبر اور عیب دار ہوگی۔اس لیے علم ہجا اور املا کے قواعد کا افہام ضروری ہے۔

جب سے ماہرینِ لسانیات نے اردو میں ہکاری مخلوط آوازوں کو آزاد مصمتوں کی حیثیت سے قبول کر لیا، تب سے ان کے جوڑ سے بننے والے مشدد الفاظ کے ہجے کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن سا ہو گیا ہے۔ذیل میں عمل تشدید کی اس غیر یقینی صورت حال کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔تشدید کے متعلق رشید حسن خاں فرماتے ہیں:

''تشدید حرف کی تکرار کو ظاہر کرتی ہے۔(چونکہ) تشدید بھی ایک حرف کی نمائندگی کرتی ہے اور اس لحاظ سے اصلاً وہ بھی لازماً جزوِ املا کی حیثیت رکھتی ہے، مگر شروع سے کچھ ایسی صورت رہی ہے کہ ایسے اکثر لفظ، جن میں حرفِ مشدّد موجود ہوں، تشدید کے بغیر ہی لکھے جاتے ہیں۔۔۔اب صورت یہ ہے کہ اصولاً تو تشدید شاملِ املا ہے مگر عملاً وہ شاملِ کتابت کم ہوتی ہے۔'' (رشید حسن خاں: 'اردو املا' ترقی اردو بیورو دہلی 1974، ص 520)

جب سے اردو املا کی اشاعت عمل میں آئی اردو املا پر کئی بار غور خوض کیا گیا۔ادھر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی نے اردو سافٹ ویَر اور کمپیوٹر اردو کتابت میں بھی پہل کی ہے۔ ان کوششوں سے اردو تحریر و طباعت کے بہت سے مسائل حل ہونے میں مدد ضرور ملی لیکن اردو املا میں تشدید کے عمل میں پیش آنے والی دشواری پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔

اس سمت میں ڈاکٹر عصمت جاوید بھی اپنی کتاب 'نئی اردو قواعد' میں سرسری طور پر آگے بڑھ گئے ہیں۔انھوں نے صرف تشدید کی تعریف پر اکتفا کر لیا۔وہ کہتے ہیں:

''کسی لفظ میں ایک مصمتہ متصل شکل میں آئے تو تحریر میں اسے علامتِ تشدید (ّ) سے ظاہر کرتے ہیں اور وہ لفظ مشدّد کہلاتا ہے۔''

(ڈاکٹر عصمت جاوید 'نئی اردو قواعد'، ترقی اردو بیورو دہلی 1985، ص 273)

مولوی سید احمد دہلوی فرہنگ آصفیہ میں 'تشدید' کی اس طرح تعریف کرتے ہیں۔

''حروف کو مشدّد کرنا، ایک جنس کے دو حروف کو ایک لکھنا اور پڑھنا، جیسے 'تکلّف' کا 'لام' اور 'توقّف' کا قاف۔''

سلیم شہزاد نے فرہنگ ادبیات میں تشدید کی تعریف اس طرح کی ہے:

''تشدید حرف کی صوتی تکرار کو ظاہر کرنے کے لیے حرف کے اوپر لگائی جاتی ہے۔اس صوتی تکرار میں پہلی صوت ساکن اور دوسری پر زبر، زیر، پیش میں سے کوئی طویل، مختصر یا مجہول، معروف حرکت ہوتی ہے جو سکون کے بعد آنے والے مصوتے پر منحصر ہے۔''

> تشدید حرف کی تکرار کو ظاہر کرتی ہے۔ (چونکہ) تشدید بھی ایک حرف کی نمائندگی کرتی ہے اور اس لحاظ سے اصلاً وہ بھی لازماً جزو املا کی حیثیت رکھتی ہے، مگر شروع سے کچھ ایسی صورت رہی ہے کہ ایسے اکثر لفظ، جن میں حرف مشدّد موجود ہوں، تشدید کے بغیر ہی لکھے جاتے ہیں...اب صورت یہ ہے کہ اصولاً تو تشدید شاملِ املا ہے مگر عملاً وہ شاملِ کتابت کم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید نے تشدید کے عمل کو صرف مصمتے ہی پر موقوف رکھا ہے جبکہ مصوتوں پر بھی تشدید کا عمل ہوتا ہے۔غالب نے تفتہ کو لکھے اپنے خط میں اس صرفی قاعدے کی وضاحت کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اس قاعدے کے ذیل میں ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ وہ لفظ جن کے آخر میں یائے معروف ہوتی ہے اضافت کی صورت میں، ایسے لفظ یائے مشدّد کے ساتھ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ استعمال شاعری میں عام ہیں۔جیسے ذاق کا مصرع: سردیِ حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک یا جیسے یہ مصرع: زندگیِ بے وفا تجھ سے محبت کیا کریں۔'' (بحوالہ، اردو املا ص 4-403)

رشید حسن خاں نے مصوتہ یائے معروف پر تشدید کے عمل کی بہت ساری مثالیں اردو شاعری سے دی ہیں جیسے

ع ہے عرق ریزیِ خجلت جوششِ طوفانِ عجز
ع ہے ہوس محمل بہ دوشِ شوخیِ ساقیِ مست
ع سرخیِ رنگِ رخ سے چمک اور بڑھ گئی

ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تشدید کا عمل صرف مصمتوں (حروف صحیح) ہی پر نہیں یائے معروف (حرفِ علت) پر بھی ہوتا ہے۔لیکن 'الف' اور 'واؤ' اگر حروف علت کی بجائے حروف صحیح کے مقام پر ہوں تو ان پر تشدید کا عمل نہیں ہوتا۔

تشدید کے عمل کی ان ساری وضاحتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ''تشدید' ایک جنس کے دو حرف کو ایک بار لکھ کر ان کی تکرار کو ظاہر کرنے کے لیے یہ علامت لگا دی جاتی ہے۔ یہ علامت مشدّد حرف کا دوبار تلفظ کرنے کا

اشارہ ہے۔ امّاں=ام۔ماں، ابّو=اب۔بو، بچّہ = بچ۔چہ، رسّا = رس۔سا وغیرہ۔ بایں صورت مشدد حرف کی پہلی آواز ساکن اور دوسری متحرک ہو جاتی ہے۔ کھڑی بولی میں ساکن آواز سے مراد مصوۃ الآخر مصوتے کو ساقط کرنا ہے۔ ہندی میں جتنے بھی مصمتے یعنی حروفِ صحیح ہیں ان کے آخر میں الف (اَ) کی آواز شامل ہوتی ہے۔ ساقط کر کے دو ہم آوازیں جوڑ دی جاتی ہیں اسے ہندی میں 'سنیوگ دویتو' کہتے ہیں۔ اس عمل سے حروف کو جوڑ کر لکھا جاتا ہے جیسے پتّھر، بچّا، کانھا، بچّا، رسّی، بتّی وغیرہ۔ لیکن تشدید کا یہی عمل اگر ہندی الاصل الفاظ کا املا اردو رسم الخط میں لکھا جائے تو اس کے ہجے Spelling کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہندی میں چونکہ 'ک' مصمتہ ہے تو 'کھ' ہکاری حرف ہے۔ اسی طرح 'گ' کے ساتھ گھ، 'چ' کے ساتھ چھ، 'ج' کے ساتھ جھ، 'ٹ' کے ساتھ ٹھ، 'ڈ' کے ساتھ ڈھ، 'ت' کے ساتھ تھ، 'د' کے ساتھ دھ، 'پ' کے ساتھ پھ، 'ب' کے ساتھ بھ آزاد مصمتے ہیں اردو میں ان کی شکل جڑواں ہے یعنی متعلقہ مصمتے کے ساتھ دوچشمی ھ کو جوڑا جاتا ہے۔ اس لیے ہندی کے 'سنیوگ دویتو' والے الفاظ کو اردو میں تشدید کے دائرے میں نہیں لیا جا سکتا کیونکہ ان الفاظ کے ہجے ہم کر ہی نہیں سکتے۔ مثلاً لفظ:

پتّھر:

'پتّھر' کے ہجے ہم پ ث زبر پَت، تھ ر زبر تھر کیوں کر کر سکتے ہیں جبکہ تشدید اگر 'تھ' پر دی گئی ہے تو حرف 'ت' کدھر گیا اور تشدید کے عمل سے کون سا حرف مشدد اور کون سا ساکن ہوا اس لیے یہاں لفظ 'پتھر' کے ہجے دشوار ہی نہیں ناممکن ہو جاتے ہیں۔ ہاں البتہ لفظ پتھر سے بنیں صفات میں پہلا 'ت' زائل ہو جاتا ہے اور اس کی آواز مدغم ہو جاتی ہے اس لیے ان الفاظ میں تشدید کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ جیسے پتھر سے پتھریلا/ پتھریلی یا محاورہ 'آنکھیں پتھرا جانا' میں لفظ 'پتھرا' وغیرہ۔

ہتّھا/ ھتّھا:

یہ دونوں الفاظ آصفیہ اور نور اللغات میں بغیر دو چشمی ھ کے اور ھ کے ساتھ بھی لکھے گئے ہیں۔ دوچشمی ھ کے ساتھ پہلے لفظ کے ہجے کچھ اس طرح ہوں گے:

دَث =ہَت، تھا = تھا=ہتھا ویسا ہی 'ہتھا' کا بھی معاملہ ہے۔

ڈبھّر، بھبھّڑ، بھتّھی اور تھتّھا:

ڈبھر یہ دیسی اردو لفظ ہے جو گارے مٹی اور پتھر کا کام کرنے والے معمار دیوار کی بنیاد بھرنے کے لیے بیڈول اور اوبڑ کھابڑ پتھروں کا استعمال کرتے ہیں انھیں ڈبھر کہا جاتا ہے۔ اس کے ہجے کرنے میں بھی وہی دشواری پیش آتی ہے جو اوپر کے الفاظ میں آئی تھی۔ یعنی ڈبھر کے پہلے ساکن 'ب' کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

بھبھڑ شور وغل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ نور اللغات میں بھٹھی، ٹ پر تشدید کے ساتھ بھی ہے اور ٹھ کے ساتھ بھی۔ اس کے معنی لوہاروں کا آتش دان ہے۔ ٹھٹھا بھی اسی قبیل کا لفظ ہے۔

خچّر اور مچّھر: یہاں پہلے لفظ 'خچّر' کے ہجے کرتے ہوئے تشدید کے عمل کے مطابق حرف 'چ' کی صوتی تکرار تو کی جا سکتی ہے، مگر دوسرے لفظ 'مچھر' میں ''چ'' کی صوتی تکرار کس طرح کریں گے؟ کیونکہ یہاں تشدید مچھر کے حرف 'چھ' پر ہے یعنی حرف چھ مشدد ہے تو تکرار اسی حرف کی ہو گی۔ جبکہ مچھر کا تلفظ ''چ چھ'' ہے۔ اس کے برخلاف 'خچّر' کے 'چ' پر تشدید ہونے کی وجہ سے 'چ' کو بالتکرار پڑھا جا سکتا ہے۔

اچھّا اور سچّا: خچر اور مچھر کی طرح اچھا اور سچا کے ہجے کا بھی وہی مسئلہ ہے۔ یعنی یہاں بھی سچا کی 'چ' مشدد ہو کر دوبار پڑھی جائے گی۔

مکّہ اور مکّھی: یہاں 'مکّہ' کی کاف مشدد ہے لیکن مکھی کی 'کھ' مشدد سمجھی جائے تو مکھی کا تلفظ ''کھ'' دوبار ادا کرنا پڑے گا۔

بگھّی، گھگھیانا اور لکڑبگھّا:

ان تینوں الفاظ میں حرف 'گھ' پر تشدید ہے۔ بگھی کے معنی نور اللغات نے گھوڑا گاڑی لکھے ہیں جس کے اوپر چھت ہوتی ہے لیکن آصفیہ نے اس کے معنی گھوڑوں کو دق کرنے والی بڑی مکھی کے بتائے ہیں۔ گھگھیانا کے معنی مارے خوف کے حلق سے آواز کا رک رک کر نکلنا ہوتے ہیں۔ لکڑ بگھا مردار خور جنگلی جانور جو کتے کے مشابہ ہوتا ہے۔

ہجوں کا مسئلہ بھی اسی طرح باقی ہے جس طرح ان سے قبل الفاظ کے ہجوں میں آیا ہے۔ بھدّا، مدّھم، ننّھا، ننھیال، ملّھار، کُلّھڑ، کلھاڑی، ملّتھی، گڑھا، تمھارا، گیارھواں، تیرھواں، انھیں، جھجھر (شہر/علاقے کا نام) کُھلکُھل، پھوپھی، پھوپھا، بھنبھوڑھنا، جانگھیا وغیرہ کئی الفاظ ایسے ہیں جن کے ہجوں میں رکاوٹ آتی ہے۔ ان ہندی الاصل 'ھ' سے مخلوط حروف میں رھ، ڑھ، لھ، مھ، نھ، وھ' ایسے مصمتے ہیں جو ہندی دیو ناگری رسم الخط میں جڑواں حروف سے مل کر ہی بنے ہیں۔ ان کے لیے الگ سے کوئی آزاد حرف نہیں۔ لفظ میں استعمال ہونے والی ان مخلوط آوازوں کے لیے جڑواں حروف ہی استعمال کیے گئے ہیں لیکن ہندی والوں کے یہاں ان حروف کے لیے جڑواں حروف یا آزاد مصمتوں کی بحث نہیں ہوتی۔ وہاں یہ تمام حروف جوڑ حرفوں کے ذریعے لکھے جاتے ہیں بلکہ بعض ہندی کے مخلوط الصوت الفاظ جن کو اردو میں جڑواں حروف میں لکھا جاتا ہے ہندی میں وہ علاحدہ علاحدہ لکھے جاتے ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں بارھواں لکھنے پر اصرار ہے تو ہندی میں اسے بارہواں لکھا جاتا ہے وہاں تیرھواں کو تیرہواں اور سولھواں کو سولہواں ہی لکھا جاتا ہے۔ ہندی میں ایسی مخلوط آوازوں کو لکھنے کے لیے 'سنیوگ دویتو' یعنی مصمتے کے آخر کی (اَ) کی آواز کو ساقط کر دیا جاتا ہے۔ یہ عمل ہمارے یہاں تشدید کے ذریعے تو کیا جاتا ہے مگر جب ایک مصمتہ سادہ اور اس کے ساتھ دوسرا مصمتہ دوچشمی 'ھ' والا آجائے جیسا کہ اوپر مثالیں دی گئی ہیں تو ان پر تشدید کا عمل ناممکن ہوتا ہے۔ اس لیے ان آوازوں کو ہم ب ھ زبر بھ، پ ھ زبر پھ، ک ھ زبر کھ، ت ھ زبر تھ و قس علیٰ ھذا اعراب کے ساتھ پڑھیں تو مخلوط الحروف میں تشدید کے ساتھ ہجوں کا مسئلہ حل ہو سکے گا۔

■

Dr. Syed Yahya Nasheet
24, Kashana KALGAON
Dist. Yavatmal 445203 (MS)

مولانا مناظر احسن گیلانی کا نظریہ تعلیم اور اس کی عصری معنویت

وارث مظہری

ہندوستان کے علمی افق پر نمودار ہونے والی جن شخصیات نے تعلیم کو فکر و قلم کا موضوع بنایا، ان میں مولانا مناظر احسن گیلانی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مولانا کی شخصیت اس لحاظ سے 'جامع البحرین' تھی کہ انھوں نے روایتی اور عصری دونوں قسم کی دانش گاہوں کی علمی و فکری فضا سے کسب فیض کیا تھا۔ وہ غیر منقسم ہندوستان کے ان چند دانشوروں میں سے ایک تھے جو مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ پر گہری نظر اور اس کا تجزیاتی شعور رکھتے تھے۔ تعلیم کے حوالے سے انھوں نے خاص طور پر برصغیر ہند میں مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت کو اپنی تعلیمی فکر کا موضوع بنایا تھا۔ اپنی دیدہ وری اور محققانہ جستجو کی بنا پر وہ تعلیم کے میدان میں کیے جانے والے معاصر تجربات سے بھی بہت حد تک آشنا تھے۔ ان کی کتاب 'ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت' ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس موضوع پر مختلف اصحاب علم نے قلم اٹھایا ہے جن میں مولانا سید عبدالحی حسنی (الثقافة الاسلامية في الهند) اور شبیر احمد خاں غوری (اسلامی ہند میں علوم عقلیہ و دیگر کتابیں) وغیرہ شامل ہیں، لیکن دو جلدوں پر مشتمل مولانا گیلانی کی مذکورہ بالا کتاب جام جمشید کی حیثیت رکھتی ہے جس میں تمام ضروری مصادر سے استفادہ کرتے ہوئے اس موضوع کا ہر پہلو سے تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔

مولانا گیلانی تعلیم سے متعلق اپنی فکر میں شبلی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ شبلی مشرقی نظام تعلیم کے شدید حامی تھے۔ ان کا واضح نقطہ نظر تھا کہ مسلمانوں کا نظام مشرقی اور مغربی دونوں اجزا پر مشتمل ہونا چاہیے۔

(خطبات شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ص 163)

مولانا گیلانی بھی شبلی کی طرح اجتہادی بصیرت کے حامل تھے اور انھی کی طرح وہ ہر اس فکر و خیال کو، جسے وہ اپنے ذاتی مطالعہ و تحقیق کی بنا پر حق سمجھتے تھے، پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ اہل علم اور عوام کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ اپنے ایک مضمون میں وہ کھل کر ترکی کی تعلیمی اصلاحات کی اس طرح ستائش کرتے نظر آتے ہیں:

''ہم ترکوں کو ملحد کہنے کے عادی ہیں لیکن بہر حال انھوں نے اتنا پورے یقین کے ساتھ سمجھ کر طے کر لیا ہے کہ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو با مقصد قوم ہو کر زندہ رہنا ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے۔'' (معارف نمبر 3، جلد 32، 1/4)

مولانا گیلانی کے تصور تعلیم کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس حوالے سے قدیم صالح اور جدید نافع کو ایک ساتھ جمع کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ ایک طرف وہ جدید تعلیمی دھارے سے کٹ جانے اور قدیم روش پر جمے رہنے کو جمود و تقلید تصور کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں، تو دوسری طرف قدیم نظام تعلیم کی بہت سی خوبیوں کے معترف نظر آتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ موجودہ نظام تعلیم میں قدیم نظام تعلیم کی بعض خصوصیات کو شامل کرنا از بس ضروری ہے۔ چنانچہ ان کی نظر میں جدید نظام تعلیم میں رسمیات (Formalities) پر زیادہ زور ہے۔ قدیم نظام تعلیم میں جماعت بندی کے التزام کی موجودہ شکل نہیں پائی جاتی تھی جس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم اپنی خواہش کے مطابق جس کتاب سے جب چاہتا تھا استفادہ کر لیتا تھا۔ جدید تعلیمی نظام کے نقص کا ایک پہلو ان کی نگاہ میں یہ ہے کہ کم زور طلبہ اور ذہین طلبہ سب ایک ہی جماعت میں ایک ہی سبق کو جو استاد پڑھاتا ہے پڑھنے کے پابند ہوتے ہیں۔

(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ص 21)

قدیم نظام تعلیم میں ذی استعداد اور کم زور طلبہ کو اپنی اپنی ذہنی استعداد اور محنت کے مطابق پڑھنے اور آگے بڑھنے کے مواقع حاصل رہتے تھے۔ (ایضاً، ص 22)

اسی طرح وہ قدیم نظام تعلیم میں آموختہ کو ذہنی استعداد اور تعلیمی صلاحیت کے پروان چڑھانے میں بنیادی قدر کا حامل تصور کرتے ہیں۔ (ایضاً، ج 1، ص 440)

ان کے تعلیمی نظریات کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں جو ثنویت (Duality) پیدا ہو گئی ہے وہ اسلامی تعلیمی و تدریسی روایت کے برعکس ہے۔ وہ ماضی کے مسلم علما و مفکرین کا یہ بڑا کارنامہ تصور کرتے ہیں کہ انھوں نے اس تعلیم کی دوعملی کو اور تقسیم کو شدت سے روکے رکھا۔ (ایضاً، ص 343)

ماضی میں ایک ہی نظام تعلیم سے فلسفی بھی پیدا ہو رہے تھے اور ریاضی داں، مہندس، طبیب، شاعر و ادیب اور صوفی بھی۔ انھوں نے ابن رشد، رازی اور ابن سینا وغیرہ کی مثال دی ہے کہ وہ دونوں طرح کے علوم کے جامع تھے۔ اسلامی علمی روایت ایسی مثالوں سے پر ہے۔ ہندستان میں انگریزی حکومت سے قبل یہ تقسیم نہیں پائی جاتی تھی۔ مسلم حکومتوں میں تعلیم گاہیں صرف ایک نوعیت کی ہوتی تھیں۔ ان میں دینی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے اور وقت کے مروجہ علوم بھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسی ایک تعلیمی دھارے سے مختلف صلاحیتوں کے لوگ پیدا ہوتے تھے اور ان سے انسانی سماج کی نوع بہ نوع ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے کا مطلب تھا: مذہبی نظریے کی بنیاد پر تعلیم کی تقسیم۔ جو ان کی نظر میں بجائے خود اسلام کے عالمگیریت پسندانہ (Universal) نظریہ تعلیم کے خلاف عمل تھا۔ تعلیمی نظام کی اس دوعملی کی طرف مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی توجہ دلائی ہے۔ ہو سکتا ہے مولانا ندوی پر مولانا گیلانی کی فکر کا اثر ہو۔ لکھتے ہیں:

''تعلیم کی موجودہ ثنویت یا دوئی غیر اسلامی اقتدار کے عہد کی 'بدعت' ہے۔ پہلے ہمارا نظام تعلیم وحدانی اور سالمیت پر مبنی تھا۔ ہمارا قدیم نصاب تعلیم جس کی درس نظامی نمائندگی کرتا ہے، مسلمانوں کے عہد حکومت میں ملک کا واحد نظام تعلیم و ثقافت اور ذہنی تربیت کا واحد ذریعہ تھا۔ یہ جہاں محدث، فقیہ اور مدرس تیار کرتا تھا، وہاں سول سروس کے عہدہ دار اور ارکان سلطنت بھی مہیا کرتا۔ اس درس کی پیداوار جس طرح ملا محب اللہ بہاری اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ تھے۔ اسی طرح علامہ سعد اللہ وزیر سلطنت بھی تھے۔ یہی حال دوسرے ملکوں میں بھی تھا۔''

(عابد رضا بیدار 'برتے کہ بخود و پیچد میرد بسحاب اندر'، در 'عربی اسلامی مدارس کا نظام تعلیم' (ج 1)، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (مرتب و ناشر): پٹنہ: 1995، ص 12

موجودہ تفریق کے ساتھ تعلیمی نظام کا چلن دینی حلقوں میں باضابطہ طور پر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس (1866) سے شروع ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس اقدام اور رویے سے مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والا ایک بڑا طبقہ مطمئن نہیں تھا۔ غالباً اس کے ذہن میں بھی وہی سوال تھا جو آج قائم کیا جا رہا ہے کہ اس طرح تعلیم کی دوگانہ تقسیم اپنے دور رس فوائد و نتائج کے لحاظ سے کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے۔ اس کا جواب مولانا نانوتوی نے یہ دیا تھا کہ:

''آج کل تعلیم علوم جدیدہ بوجہ کثرت مدارس سرکاری، ترقی پر ہے۔ ہاں علوم قدیمہ کا ایسا تنزل ہوا کہ کبھی نہ ہوا ہوگا۔ ایسے وقت میں رعایا کا مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل حاصل نظر آیا اور صرف بجانب علوم نقلی اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ و استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے، ضروری سمجھا گیا۔''

(سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیو بند (ج 1) ص 268)

ان کا خیال تھا کہ دیوار کی جو اینٹ ابھی گری نہیں اس کی فکر بجز نادانی اور کیا ہے۔ مولانا نانوتوی کے یہ خیالات بظاہر اس وقت کے سیاسی حالات سے تاثر پذیری کا نتیجہ تھے۔ وہ اس وقت کے ماحول میں اسی نصاب اور منہج تعلیم و تدریس کے مطابق تعلیم کو زیادہ مفید اور بار آور تصور کرتے تھے لیکن دینی و عصری تعلیم کے درمیان تفریق کے موجودہ تصور سے ان کا ذہن قطعاً خالی تھا۔ اس بات کی تائید ان کے اس جملے سے ہوتی ہے کہ: ''اس کے بعد (دارالعلوم دیو بند سے تحصیل علم کے بعد) طلبہ مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ہوگی۔'' (ایضاً ص 208)

اس تقسیم کا نقصان مولانا کی نگاہ میں اس شکل میں سامنے آیا ہے کہ علما اور دانشوروں کے دونوں طبقوں کے درمیان ایک کشمکش کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو مطعون کرتے نظر آتے ہیں۔ (ایضاً، ج 1 ص 343)

یہ صورت حال مسلم سماج کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس طرح وہ دولخت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس تعلق سے سماج کو مزید خراب ہونے سے بچانے کی کوشش کی جائے جس کا طریقہ ان کی نظر میں یہ ہے کہ مسلم نظام تعلیم کو وحدانی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے نظری خاکے کو انھوں نے 'نظریہ وحدت تعلیم' کا نام دیا ہے۔

انھوں نے اپنے نظریہ وحدت تعلیم کو تفصیل کے ساتھ اپنی مذکورہ کتاب میں پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح پہلے مسلمانوں کی تعلیم میں دین کا عنصر ایک ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا، اس کو اس طور پر لازمی حیثیت دے دی جائے جس طرح مدارس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے۔ اس طرح بی اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے اس زمانے میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں۔ اس کا نتیجہ مولانا کے لفظوں میں یہ نکلے گا کہ:

''دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی۔ ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا اور ہر گریجویٹ عالم، ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ملا۔ عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔''

(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (ج 2) ص 404)

اس خاکے پر وارد ہونے والے سوالات و اعتراضات کا بھی انھوں نے تفصیل کے ساتھ جواب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ درس نظامی سے متعلق غلط طور پر لوگوں کے اندر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ وہ صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ اس میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی میں نظم و نثر و انشا کی بیسیوں کتابیں، مزید برآں حساب اور خطاطی کی بھی کتابیں شامل تھیں۔ اس سلسلے میں سب سے قابل لحاظ بات یہ ہے کہ 16-15 سالہ مدت تعلیم میں درس نظامی کے فضلا دینیات کی محض تین کتابیں پڑھا کرتے تھے یعنی جلالین، مشکاۃ اور شرح وقایہ اور ہدایہ کو ملا کر دونوں کے منتخب ابواب۔ البتہ بعض جگہوں پر تفسیر بیضاوی کے بھی ڈھائی پارے پڑھائے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ ساری کتابیں زبان، منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس، ادب عربی، علم کلام، اصول فقہ، معانی، بیان وغیرہ میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا۔ ان میں صرف منطق و فلسفہ کی کتابوں کی تعداد اخیر زمانے میں 50-40 سے متجاوز تھی۔ مولانا گیلانی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم میں منطق و فلسفے کو زیادہ اہمیت دے دی گئی تھی اور اس وجہ سے اس نصاب میں بے اعتدالی پائی جاتی تھی۔ وہ یونانی فلسفے کے خاصے ناقد نظر آتے ہیں حالانکہ عہد وسطیٰ کے اس ماحول میں یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ شاہ ولی اللہ جیسی شخصیت بھی اسلامی فکر کی تشکیل و توضیح میں اس فلسفے کی اسیر نظر آتی ہے؛ تاہم جہاں تک دینی علوم کے نصاب کا معاملہ ہے وہ سمجھتے تھے کہ تعلیمی نصاب کو انھی کے لیے وقف کر دینا مناسب نہیں ہے۔ ان کا خیال بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ دینی علوم کی تفصیلی تعلیم کو تخصص کی سطح پر رکھنا چاہیے۔ جب کہ اس کے بنیادی اور اہم حصے کو 'یونی ورسل' تعلیم کے ساتھ ضم کر دینا چاہیے تاکہ عہد وسطیٰ کی طرح تعلیم کا نظام دو متوازی حصوں میں منقسم نہ ہو۔

مولانا کی یہ بات سنجیدہ غور و فکر کی متقاضی ہے کہ:

''دینیات کی عمومی تعلیم کے لیے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت 'غیر دینی علوم' کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا تو آج بھی کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصے کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں، کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے، ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبول علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو انھی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔'' (ایضاً)

اس خاکے پر خود مولانا کی نگاہ میں یہ دو بنیادی اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا یہ عمومی دینی تعلیم حصول مقصد کے لیے کافی ہے؟ دوسرے یہ کہ عصری علوم کی تدریس کے تقاضوں کی گنجائش کس طرح اس نظام میں نکالی جا سکتی ہے؟ پہلے سوال کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ آخر ماضی میں یہ کیوں کر ممکن ہو سکا؟ دینی تعلیم کے اسی مختصر نصاب سے مذہبی علوم و افکار کی نمائندہ شخصیات پہلے پیدا ہو سکتی ہیں تو اب کیوں نہیں ہو سکتیں؟ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ قدیم نصاب تعلیم کا جو حصہ فرسودہ اور از کار رفتہ ہو گیا ہے اس کی جگہ عصری علوم کے کارآمد مضامین کو دی جائے۔ (ایضاً، ج 1، ص 404)

اگر مسلمان عمومی سطح پر اور اہل مدارس خصوصی سطح پر مولانا گیلانیؒ کے مشورے پر جزوی طور پر بھی عمل کرنے کی کوشش کرتے تو آج ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کا نقشہ شاید کچھ اور ہوتا۔ برصغیر اہم دینی و فکری حلقوں میں مدتوں سے یہ بحث جاری ہے۔ اگرچہ اس تعلق سے اب تک کوئی انقلابی پیش رفت نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ بنگلہ دیش میں جدید و قدیم نظام تعلیم کے دونوں دھاروں کو ہم آمیز کرنے کے حوالے سے زیادہ ارتقائی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ وہاں کی حکومت مدارس کے تعلیمی ڈھانچے پر کافی رقم خرچ کرتی ہے۔ سرکار سے منظور شدہ مدارس کے فارغین اہم سرکاری محکمہ جات میں پہنچ رہے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ مسلم سماج کی طرف سے انھیں معتبریت بھی حاصل ہے۔ یہ ایک اچھا اور قابل قدر ماڈل ہے۔ ہندوستان میں ایسا ہی کوئی ماڈل سامنے آنا چاہیے۔ ایسا ماڈل جس کی بنیاد پر عالم و دانشور یا مولانا گیلانی کے لفظوں میں ''مسٹر و ملا'' کی تفریق ختم کی جا سکے۔ اس تعلق سے بعض عرب ممالک کے تجربات کا بھی مطالعہ اور ان سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مولانا گیلانی کا نظریہ تعلیم جس کا اہم نکتہ تعلیم کی ہمویت کے خاتمے اور نظام تعلیم کی وحدت کے خاکے پر مشتمل ہے؛ کئی حیثیتوں سے منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ اسے من و عن منطبق کرنے کی کوشش کی جائے تاہم اس میں ضروری ترمیم و اضافے کے ساتھ اس کو آزمانے کی کوشش کرنا چاہیے جس کی افادیت اور نتیجہ خیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

■

Waris Mazhari
Dept of Islamic Studies
Jamia Hamdard
New Delhi -110062

ادب: زاویے اور جہات

اردو سفرنامہ
فن اور روایت

ضیاء الرحمن صدیقی

سفر انسان کو اپنی ذات کے پرکھنے اور معروضی تجزیہ کرنے کے بھی مواقع فراہم کرتاہے۔سفر کے ذریعہ عالمی سطح پر رابطوں کا دائرہ وسیع ترہوتاہے۔مشاہدات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔کیونکہ نقل مکانی ہر جاندار کی فطرت میں شامل ہے۔ انسان کی سیمابی کیفیت اور تحرک کا عمل،اُسے مسافت طے کرنے پر مجبور کرتا ہے اوریہی عمل سفر کہلاتا ہے۔

سفر نامہ کی روایت اگرچہ خاصی قدیم ہے،لیکن سفر نامہ اردو میں زیادہ قدیم صنف نہیں ہے۔ابتدامیں اسے صنف کا درجہ بھی حاصل نہیں تھا۔

انسان فطری طور پر تحرک پسند واقع ہوا ہے۔نقل مکانی اور سیاحت انسانی جبلت میں شامل ہے۔انسان کے مزاج کی سیمابی کیفیت کی وجہ سے سفر نامہ کا وجود عمل آیا۔

سفر کرنے سے انسانی ذہن وشعور نہ صرف یہ کہ بیدار ہوتا ہے بلکہ تہذیب وتمدن، تاریخ وثقافت،طرز معاشرت، تحقیق وتنقید اور تلاش وجستجو کا جذبہ بھی بیدار و برقرار ہوتا رہتا ہے۔

سفر انسان کو اپنی ذات کے پرکھنے اور معروضی تجزیہ کرنے کے بھی مواقع فراہم کرتا ہے۔سفر کے ذریعہ عالمی سطح پر رابطوں کا دائرہ وسیع تر ہوتا ہے۔مشاہدات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔کیونکہ نقل مکانی ہر جاندار کی فطرت میں شامل ہے۔انسان کی سیمابی کیفیت اور تحرک کا عمل،اُسے مسافت طے کرنے پر مجبور کرتا ہے اور یہی عمل سفر کہلاتا ہے۔

عربی زبان میں مسافت طے کرنے کو 'سفر' کہتے ہیں۔ نئے مقامات مناظر اورامکانات سے انسان کے ذہنی اور جمالیاتی ذوق کو تسکین ملتی ہے۔دیگر ممالک اور اقوام کی لسانی اور تمدنی زندگی سے دلچسپی لینا انسان کی ترجیحات میں شامل ہے لیکن ہر شخص سفر کا متحمل نہیں ہوتا، اس کے لیے شخصیت میں مخصوص اوصاف کا ہونا لازمی ہے۔بیشتر سیاح اپنے سفر کی روداد کو زبانی بیان کرتے تھے۔اس طرح عوام الناس کی دلچسپی سفرناموں کا محرک اوّل ثابت ہوا۔

سفر کی اہمیت اور افادیت

سفر درویشوں اور دانشوروں کا عمل ہے جہاں انھیں فطرت کی بے بہا فیاضیوں کے درمیان عرفان ذات اور روحانیت کے بلند درجات میسر آتے تھے۔

حضرت آدمؑ سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی نے دین کی تبلیغ اور اللہ کی رضا کے لیے سفر اختیار کیے۔رام چرت مانس کا مرکز ومحور رام چندر جی کے سفر کا بہترین بیانیہ ہے۔سیاحوں، دانشوروں، عالموں، مذہبی رہنماؤں نے سفر کے ذریعہ کامیابی وکامرانی حاصل کی۔ سلاطین کے سفر نامے تاریخ وتمدن اور تہذیب کا ناگزیر حصہ تصور کیے جاتے ہیں۔درویشوں کے سفر خلوت نشینی اور تنہائی میں طے ہوتے تھے۔عہد قدیم میں حکمرانوں اور شہزادوں کو بھی سزا کے طور پر اور کبھی قول کے پاس کی بنیاد پر سفر اختیار کرنا پڑے لیکن جب وہ سرخرو ہو کر واپس آئے تو ان کی عظمت اور رتبہ میں اضافہ ہوا بلکہ مشاہدات اور تجربات کا خزانہ بھی ساتھ لے کر آئے اور سفر کی یہ اذیتیں ان کی عظمت کا باعث بن گئیں۔

حضرت آدمؑ کا جنت سے کرۂ ارض پر قیام نقل مکانی کی شکل میں پہلا سفرنامہ تصور کیا جاتا ہے۔یعنی آدمؑ کے وجود ہی سے سفر کا آغاز ہوا،دنیا کا وجود سفر کی اساس پر قائم ہے۔

کرۂ ارض کی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا اور آبادیوں کی نقل مکانی نے قبیلوں قوموں، ریاستوں، قصبوں، شہروں اور ملکوں کی شکل اختیار کرلی اور آہستہ آہستہ نقل مکانی کی ضرورت پیش آنے لگی،اس طرح سفر نامے کا وجود بھی عمل میں آیا۔

دور قدیم میں سفر کا آغاز پیدل یا پھر گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں کی مدد سے ہوا جنگلوں، ریتیلے میدانوں، ندیوں کو عبور کرنے میں کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ موسموں کی سخت گیری، طوفان کے تھپیڑے، خونخوار جانوروں کا خطرہ دشوار گزار اور پرخطر راہوں سے گزرنا اور غیر متوقع فوق فطری اور اساطیری عناصر کا تصور نیز فریب نظر اس درجہ کہ دور دراز اور حد نظر تک پھیلے ہوئے ریتیلے میدان سے سمندر اور ندیوں کا گمان ہوتا تھا۔ پیاس کی شدت سے جان کا خطرہ بھی ممکن تھا۔

ابتدا میں سینہ بہ سینہ حکائی انداز میں زبانی سفر کے واقعات منتقل ہوتے رہے۔ بعد ازاں سفر کی روداد کو روز ناموں، تاثرات اور سفرناموں کو تحریری شکل میں منظر عام پر لایا گیا جو سرمایہ ادب اور تاریخ کا حصہ بن گئے۔

سفرنامہ کا فن

ادبی بیانیہ سفر نامہ نگار کا فنی امتیاز اور مخصوص وصف ہے جو ایک ادبی صنف کی انفرادیت میں اضافے کا متحمل ہوتا ہے۔سفر نامہ نگار کا معروضی اور غیر جانبدار ہونا ضروری ہے۔سفر نامہ نگاری ایک منفرد فن تسلیم کیا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار کو بیانیہ پر قدرت ہونا ضروری ہے۔ یہ ابتدا ہی سے ایک بیانیہ صنف قرار پائی۔ بیانیہ کے بغیر کامیاب

سفرنامہ کا تصور ممکن نہیں، اس کا مقصد فکشن نگاری، امیجری یا تصویر کشی نہیں ہے۔ سفرنامہ نگاری کا فن کسی اصول یا ضابطوں کا پابند بھی نہیں ہوتا، اس صنف میں کوئی مخصوص تکنیک یا تجزیہ کی گنجائش یا امکانات نہیں ہوتے۔ ہر سفرنامہ نگار کا اپنا ایک مخصوص اسلوب اور منفرد بیانیہ ہوتا ہے۔ اس میں ادبی عنصر کا ہونا ضروری نہیں ہے لیکن زبان میں متنی اسلوب (Bookish Langauage) کی بڑی اہمیت ہے۔ عالمی سطح پر بیشتر اسفار کسی خاص مقصد یا مہم کی تکمیل کے تحت عمل پذیر ہوئے۔ سفر کے اقسام اور سیاحوں کے مقاصد مختلف النوع انداز اور طرز کے ہوسکتے ہیں۔

ابتدا میں سفرنامے مذہبی، روحانی، سیاسی، تجارتی نیز نئی دنیا کی تلاش و جستجو اور فتح و نصرت کے لیے اختیار کیے جاتے تھے۔ روحانیت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے جنگلوں اور ویرانوں میں خلوت نشینی اختیار کرلی جاتی تھی۔

سفر ذاتی مشاہدے، تجربے اور تاثر پر مبنی ایک ایسی بیانیہ تحریر تصور کی جاتی ہے جو سفرنامہ نگار کے ذریعہ ماحول، منظر، واقعات وحادثات، تہذیب وتمدن اور تاریخ وثقافت جغرافیائی حالات یعنی (Topographical Situations) مناظر فطرت، دریاؤں، پہاڑوں اور موسموں کے حالات و کوائف کا بیان ملتا ہے۔ مغل بادشاہ بابر نے اپنے سفرنامہ 'تزک بابری' میں ہندوستان اور کابل کے حالات اور اشیا کا موازنہ بھی پیش کیا ہے اور افغانستان میں چار موسموں کا ذکر کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جاندار اور بے جان اشیا پر بھی اپنی رائے قائم کی ہے اپنے لفظوں میں سفر کا بیان سفرنامہ نگار کی علمیت، دلچسپی، عمل اور ردعمل پر معیار منحصر ہوتا ہے۔

سفرنامے میں تاریخ وتمدن کے ساتھ آپ بیتی بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔ سفرنامہ معلومات افزا اور کیفیت و انبساط کا باعث ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک تاریخ داں اور ایک سیاح کے بیانیہ میں فرق فطری عمل ہے۔ تاریخ داں صرف تاریخی شواہد پر مبنی معلومات فراہم کرتا ہے جبکہ سیاح گہرے مشاہدے، ذاتی تجربات، کیفیت اور ادبی انداز میں بیان کرتا ہے۔ سیاح اپنی تحریروں کے ذریعہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے، جبکہ تاریخ داں واقعات اور ان کے تاریخی شواہد پر مبنی گفتگو کرتا ہے۔ اگر ایک سفرنامہ نگار میں تخلیقی پیکر تراشی کا عنصر بھی شامل ہو تو اس کا قاری بیانیہ کے اس سیل رواں میں آخری منظر تک ساتھ رہتا ہے۔

تاریخ داں ایک مخصوص عہد کے نظام سلطنت کے واقعات، فتح و شکست نیز بحیثیت مجموعی دارالخلافہ کے مرکز ومحور تک ہی محدود رہتا ہے جبکہ سیاح اور سفرنامہ نگار جس باریک بینی ژرف نگاری سے سماج کی مختلف چیزوں اور دیہی علاقوں کی طرز معاشرت کو ایک فن کار کی نظر سے دیکھتا ہے اور پرکھتا ہے، تاریخ داں کی نظر وہاں تک عموماً نہیں جاتی۔

سیاح اور مسافر دو مختلف اشخاص ہیں اگرچہ دونوں کی منزل مقصود سفر ہے لیکن منزل اور مقاصد میں واضح فرق ہے۔ سیاح سفر کے ذریعہ لطف وانبساط سے حظ اٹھاتا ہے لیکن مسافر کسی خاص مقصد کے تحت سفر اختیار کرتا ہے۔

سفرنامے کی روایت :آغاز و ارتقا

ابتدائی سفرنامے داستانوی نوعیت کے تخیلاتی قصوں اور فوق فطری عناصر سے ماخوذ تصور کیے جاتے ہیں۔ عہد عتیق میں مسافروں کی آپ بیتیاں اور سفر بیتیاں سفرنامے کے آغاز کا نقش اول ثابت ہوئے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر فرضی، مشکوک، مسخ شدہ اور مبالغہ آمیزی پر مشتمل ہوتے تھے۔ لیکن یہی طرز اور داستانوی نوعیت کے قصے سینہ بہ سینہ طرز کی صورت اختیار کرتی گئی۔ بعد ازاں یہ قصے کہانیاں، واقعات، حادثات، خطوط، ڈائریاں، روزنامچے اور سفری گائڈ کتابوں کی شکل اختیار کرتے گئے۔

سفرنامے کے آغاز سے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ سفر مکمل ہونے کے بعد گھر واپس آنے والے مسافر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو سفر کے حالات و کوائف اور روداد سنایا کرتے تھے۔ بعد ازاں اسی روداد نے سفرنامے کی شکل اختیار کرلی۔

''ابتدا میں سب سے پہلے بحری سفر کے واقعات روزنامچے اور گائڈ بکوں کی شکل میں لکھے گئے، ایسے روزنامچے بحری سفر کے راستوں کی معلومات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئے۔''

(اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ص6)

قرین قیاس یہ بھی ہے کہ ابتدا میں سفر پیدل، گھوڑوں، اونٹوں، ہاتھیوں اور بگیوں پر کیا کرتے ہوں گے کیونکہ سواری کا واحد ذریعہ پیدل یا پھر جانور ہی ہوا کرتے تھے۔ بعد میں ان کی ترقی کے ساتھ بحری سفر کا طریقہ سامنے آیا اور سیاحوں نے سمندری راستوں کا سفر اختیار کیا جس کا ذکر گائڈ بکوں اور روزنامچوں کی شکل میں ملتا ہے۔ بحری گائڈ بکوں کے ذریعہ سفر کے دوران پیش آنے والے مسائل، مشکلات، دشواریوں اور حفاظت کے طریقے بہرحال موضوعات اور معلومات کے نقطۂ نظر سے سفرنامے ارتقائی منزلوں کی جانب گامزن ہوتے گئے۔

سفرنامے کی تحریری شکل کب سامنے آئی یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ ثبوت کے ساتھ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، البتہ ایک یونانی سیاح ہیروڈوٹس (Herodotus) کو پہلا سفرنامہ نگار کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں "Dictionary of Shiply Literature" میں ہے کہ ہیروڈوٹس (725 ق م) کو بابائے تاریخ اور سفرنامہ نگار کی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کا کوئی مستند ثبوت نہیں ملتا، دراصل وہ سفر کے مفصل حالات نہیں بلکہ ایسے نتائج بیان کرتا ہے جو جغرافیائی حالات و کوائف کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ہیروڈوٹس کی تحریروں کو سفرنامے کا نقش اول تو کہا جاسکتا ہے لیکن کلی طور پر وہ سفرنامے کے فن اور معیار پر پورا نہیں اترتا۔

ہندوستان میں سفرنامے اور سیاحت کی روایت کو اگر مذہبی کتابوں مثلاً مہابھارت، رامائن، ویدوں، پرانوں اور گیتا کے پس منظر میں مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں سیر وسیاحت اور سفر وحضر کا بہت رواج تھا لیکن یہ سفر تجارتی، جنگی اور پیشہ وارانہ ضرورتوں یا کسی مہم کے تحت اختیار کیے جاتے تھے کیونکہ وسائل کی کمی کے باعث سفر ایک دشوار گزار مرحلہ ہوتا تھا۔

دنیا کا اولین دریافت شدہ سفرنامہ جو تحریری شکل میں دستیاب ہے۔ یونان کے معروف سیاح میگستھینز کا سفرنامہ ہند (INDIC) ہے۔ میگستھینز نے (330 م ق) ہندوستان کا سفر کیا، یہ سکندر اعظم کے جانشین کی حیثیت سے چندرگپت موریہ کے عہد حکومت میں پاٹلی پتر (پٹنہ) آیا جو ان دنوں چندرگپت موریہ کی دارالسلطنت تھی۔ سبھی محققین اس سفرنامہ کو ہندوستانی تاریخ وتمدن اور تہذیب و ثقافت ہر پہلو سے نہایت معلومات افزا، اور مستند تاریخی ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی میں چینی راہب فاہیان، بکرماجیت کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا، وہ بڑا پر امن اور خوشحالی کا دور تھا۔ فاہیان نے بدھ مذہب کے مختلف مقامات مثلاً کپلوستو، پاٹلی پتر، ویشالی اور 'کشی نگر' وغیرہ جیسے مقدس مقامات کو دیکھا۔ وہ بدھ مذہب کی تعلیمات اور اس سے متعلق کتابوں کو بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے 'بدھ مذہب کے حالات' کے عنوان سے ایک کتاب بھی تحریر کی تھی۔ اس کتاب سے اُس کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا علم ہوتا ہے۔ تاریخ داں عموماً اس سفرنامے کے مستند حوالوں سے استفادہ کرتے ہیں۔

سلیمان کو پہلا عرب تاجر کہا جاتا ہے، جس نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں کا بہ نظر غائر مطالعہ اور مشاہدہ کیا اور چین کی طرز معاشرت رہن سہن اور بود وباش کا ہندوستان سے موازنہ کیا اور 1845 میں 'سلسلۃ التواریخ' کے نام سے اپنا سفرنامہ شائع کیا۔ عرب سیاحوں میں ابوالحسن مسعودی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ اس نے پچیس برس سیاحت میں گزارے۔ اس عرصہ میں اس نے شام، روم، عراق، افریقہ، تبت، لنکا، ایشیائے کوچک اور ہندوستان کا بھی سفر کیا اور متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اس کی سب

سے اہم کتاب 'مروج الذہب و معادن الجواہر' بتائی جاتی ہے۔ مسعودی نے عراق سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور اقوام عالم کی مختصر تاریخ کے ساتھ ہندوستان کا بھی مختصراً ذکر کیا۔

حکیم ناصر خسرو بلخی سفرنامہ نگاروں میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اصفہان کا رہنے والا تھا۔ غزنوی کے عہد میں ہندوستان آیا، اس کی مشہور کتاب 'زادالمسافرین' نہایت سادہ سلیس اور عام فہم زبان میں ہے۔

وسط ایشیا کے خوارزم کا ایک عظیم سیاح ابوریحان جو البیرونی کے نام سے مشہور ہے۔ البیرونی اپنے زمانے کا فلسفی، دانشور، ریاضی داں، ہیئت اور جغرافیہ کا ماہر تھا۔ اس نے محمود غزنوی کے عہد حکومت میں ہندوستان کا سفر کیا۔ اس کا بیشتر وقت ملتان میں گزرا اور کتاب 'الہند' کے نام سے اپنی گراں قدر تصنیف پیش کی۔ اس نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے باشندوں کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے نیز علمی و ادبی، سماجی و سیاسی اور معاشی صورت حال کا معروضی خاکہ غیر جانبدارانہ انداز میں منطقی اور عالمانہ طور پر پیش کیا ہے۔ اس سفرنامے میں منفرد اسلوب، بیانیہ اور خطابیہ دونوں طرز اختیار کیے گئے ہیں۔

ابن بطوطہ کے ذکر کے بغیر اردو سفرنامہ کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی 'عجائب الاسفار' کا مصنف شیخ عبداللہ جو ابن بطوطہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا پہلا ترجمہ 'سفرنامہ ابن بطوطہ' محمد حیات الحسن نے کیا جو 1901 میں امرتسر سے شائع ہوا۔ بعد ازاں رئیس احمد جعفری نے 1961 میں دوسرا ترجمہ کیا جو بہت مشہور ہوا۔ جبکہ 1829 میں اس کی تلخیص شائع ہوچکی تھی۔ چند برس بعد الجزائر میں مکمل کتابی صورت میں شائع ہوا۔

عجائب الاسفار کے ذریعہ متعدد تاریخی انکشافات اور تحیر کن واقعات کا علم ہوتا ہے جو زمانۂ قدیم سے پردۂ خفا میں تھے۔ علاوہ بریں داستانوی رنگ اور فکشن کے بیانیہ کے لحاظ سے اس کی اہمیت مسلم تسلیم کی جاتی ہے۔

ہیونگ سانگ ایک معروف چینی سیاح تھا۔ ہندوستان آیا اور تیرہ برس اس نے ہندوستان میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں اس پورے ملک کی سیاحت کی۔ ہیونگ سانگ چین کے ان سیاحوں میں سے تھا جو بدھ مذہب کی تعلیمات کے سلسلے میں ہندوستان آتے رہے۔ وہ ان مقدس کتابوں کے ملنے والے چینی ترجموں سے مطمئن نہیں تھا۔ 28 سال کی عمر میں اس نے طے کیا کہ وہ اصل کتابوں کا مطالعہ کرکے ہندوستان کے علما سے گفتگو کرے گا۔ ہیونگ سانگ ان مقدس مقامات کو بھی دیکھنا چاہتا تھا جہاں مہاتما بدھ کی زندگی میں بہت سے واقعات پیش آئے تھے۔ وہ ایک سچا راہب اور عالم فاضل تھا۔ ہندوستان سے واپس جاکر اس نے 657 کتابیں چین کے بادشاہ کو پیش کیں، جنھیں ترجمہ کیا گیا۔ عرب سیاحوں سے قبل بدھ مذہب کے راہب ہندوستان آچکے تھے۔ ہیونگ سانگ کا سفر ہمارے لیے تاریخی اور مذہبی ذخیرہ تصور کیا جاتا ہے۔

اردو میں سفرنامہ نگاری کا آغاز اور بتدریج ارتقا

پندرہویں صدی اور اس کے بعد کے سیاحوں نے ہندوستان کی دولت و حشمت کی خبریں سن کر مغربی ممالک کے سیاحوں نے ہندوستان کا رخ کیا، ان میں اولین نام مارکوپولو کا ہے جو تیرہویں صدی میں، غیاث الدین بلبن کے عہد میں چین سے مالا بار تک ہی پہنچ سکا۔ 1265 سے 1267 تک صرف دو سال ہندوستان میں مقیم رہا۔

دوسرا سیاح بارتھولومیوز 1486 میں پرتگال کے بادشاہ زرین کی ایما پر ہندوستان کے لیے روانہ ہوا، وہ اپنا سفر مکمل نہ کرسکا اور طوفان کے سخت تھپیڑوں کی وجہ سے واپس چلا گیا لیکن اس نے آنے والے سیاحوں کے راستوں کو ہموار ضرور کردیا۔

اسپین کے ایک مشہور سیاح کرسٹوفر کولمبس نے 1486 میں بادشاہ کی ایما اور سرپرستی میں ہندوستان کے لیے اپنا سفر شروع کیا لیکن وہ سمندری راستہ بھٹک گیا اور اس نے جنوب کی بجائے مغرب کی جانب سفر اختیار کرلیا، نتیجے کے طور پر وہ ہندوستان کے بجائے امریکہ پہنچ گیا اس طرح امریکہ کی دریافت عمل میں آئی۔

پرتگال کے بادشاہ نے 1498 میں واسکوڈی گاما کو ہندوستان کی تلاش میں ایک سو ساٹھ افراد پر مشتمل مالا بار سے روانہ کیا تھا۔ واسکوڈی گاما اپنے وفد کے ساتھ ہندوستان پہنچا اور ایک برس تک یہاں مقیم رہا۔

عہد مغلیہ میں متعدد یوروپی سیاحوں نے ہندوستان کا رخ کیا، جہانگیر کے عہد میں برطانوی کپتان ہاکنس اور سر طامس شاہ انگلستان کا ایک رقعہ اور قیمتی تحفے لے کر ہندوستان آئے تھے۔ سر طامس برطانیہ کے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان میں مقیم رہا۔ اس دور کا ٹیونیر 1639 میں شاہجہاں کے دور میں ہندوستان آیا بلکہ چھ بار ہندوستان آیا جواہرات کا مشہور تاجر تھا۔ اس نے آخری سفر اورنگ زیب کے عہد میں کیا۔

فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آیا اور 1656 سے 1668 یعنی عالمگیر کے عہد تک قیام پذیر رہا۔

برنیر کے سفرنامے کا پہلا اردو ترجمہ 'وقائع سیرت و سیاحت' کے نام سے 1888 میں امجد حسین وزیر اعظم پٹیالہ نے دو جلدوں میں مرادآباد سے شائع کیا تھا جبکہ دوسرا ایڈیشن 1903 میں آگرہ سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر برنیر ایک فلسفی ہونے کے ساتھ سیاحت پسند محقق سیاح بھی تھا، جو عہد عالمگیر کے سیاسی اور دیگر حالات و کوائف کا عینی شاہد ہے لیکن اس کی تحریروں سے تعصب اور جانبدارانہ طرز فکر کا احساس ہوتا ہے۔

نکولہ منوچی (1639-1717 "Niccolao "Manucci" اٹلی میں پیدا ہوا عہد عالمگیر یعنی سترہ برس کی عمر میں ہندوستان آیا اور سورت میں داراشکوہ کی فوج میں شامل ہوگیا راجپوتانہ میں بھی ملازمت کی، تمام عمر ہندوستان میں رہا، ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کی اور مدراس میں وفات پائی۔

اردو میں منوچی کے تین ترجمے شائع ہوئے۔ پہلا ترجمہ 'خانۂ سلطنت مغلیہ' مترجم مظفر علی خاں آگرہ سے شائع ہوا۔ دوسرا ترجمہ 'ہندوستان عہد مغلیہ میں' مترجم ملک راج شرما لاہور سے شائع ہوا۔ تیسرا ترجمہ 'داستان مغلیہ' مترجم سجاد باقر مہدی لاہور سے شائع ہوا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں برطانوی سیاح اور راہب، عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے ہندوستان آنا شروع ہوئے۔ ان سیاحوں میں تھامس، ولیم کیری اور وارڈ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

اردو سفر ناموں کا ارتقا

اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں اگرچہ فارسی کا اثر زیادہ تھا۔ اس کے باوجود اردو نثر نے خاصی مقبولیت حاصل کرلی تھی لیکن ابتدائی بیشتر سفرنامے فارسی زبان میں لکھے گئے۔

مغل سلاطین بھی سیر و سیاحت کا شوق رکھتے تھے۔ ان کے تزک کو سفرنامہ قرار نہیں دیا جاسکتا البتہ ان میں تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی حالات کا بیانیہ سفرنامے کی جانب ذہن منتقل ضرور کرتا ہے، لیکن ابتدائی سفرنامے فارسی ہی میں لکھے گئے، ان میں قبادیدگی میر حسن لندنی نواب کریم خاں، مرزا ابوطالب اصفہانی اور شیخ اعتصام الدین کے نام شامل ہیں۔

شیخ اعتصام الدین کا سفرنامہ شگرف نامہ ولایت فارسی میں ہے اور برٹش میوزم میں موجود ہے۔ جیمس ایڈوارڈ الکزینڈر نے اس کی اردو اور انگریزی تلخیص کی تھی۔

مرزا ابوطالب خاں اصفہانی 1799 میں لندن گئے اور 1803 میں ہندوستان واپس آئے، ان کا سفرنامہ سیر طالبی 1806 میں مکمل ہوا اور 1810 میں Charles Esteward نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا۔ اصل نسخہ کو 1812 میں فورٹ ولیم کالج نے فارسی میں شائع کیا۔

اردو سفرناموں کو تحریک و ترغیب فارسی سفرناموں سے ملی۔ بعد ازاں داستانوں کے واقعات میں پوشیدہ

اسفار، سفرنامے کا محرک بنتے گئے، مثلاً قصۂ چہار درویش میں درویشوں کے سفر کا بیان، حاتم طائی کے سات اسفار کا ذکر، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل امیر حمزہ خلیل علی خاں اشک، نہال چندلاہوری کی 'مذہب عشق' گل بکاؤلی کی تلاش میں شہزادے کے طویل سفر کا بیان، ڈرامہ 'اندر سبھا' میں سبز پری کا سفر اور گلفام کو جادوئی تخت سے سیر کرانا شامل ہے۔

اردو میں سفرنامے کا تصور خاصا قدیم ہے اور ان کی فہرست بھی طویل ہے لیکن یوسف خاں کمبل پوش کی 'تاریخ یوسفی' جو 'عجائبات فرنگ' کے نام سے مشہور ہوا۔ اردو کا باقاعدہ پہلا سفرنامہ تسلیم کیا گیا۔ اردو سفرنامہ کی تاریخ میں بنیاد گزار کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1837 میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

محمد اکرم چغتائی کی تحقیق کے مطابق یہ سفرنامہ دراصل فارسی میں لکھا گیا تھا، اس کا اصل متن ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں موجود ہے اور فارسی متن پر مصنف کا نام یوسف خاں گلیم پوش لکھا ہے۔

عجائبات فرنگ 297 صفحات پر مشتمل پہلی بار 1847 میں پنڈت دھرم نارائن کے زیر اہتمام مطبع العلوم دہلی کالج سے 'تاریخ یوسفی' کے نام سے شائع ہوکر منظر عام پر آیا تھا۔ بعدازاں 1873 میں منشی نول کشور نے لکھنؤ سے 'عجائبات فرنگ' کے نام سے شائع کیا اور پھر 1898 میں نول کشور نے دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا۔ تحسین فراقی نے 1983 میں دوبارہ ترتیب دے کر جامع اور مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔

عجائبات فرنگ 297 صفحات پر مشتمل پھلی بار 1847 میں پنڈت دھرم نارائن کے زیر اھتمام مطبع العلوم دھلی کالج سے 'تاریخ یوسفی' کے نام سے شائع ھوکر منظرعام پر آیا تھا. بعدازاں 1873 میں منشی نول کشورنے لکھنؤ سے 'عجائبات فرنگ' کے نام سے شائع کیا اورپھر 1898 میں نول کشور نے دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا. تحسین فراقی نے 1983 میں دوبارہ ترتیب مے کر جامع اور مبسوط مقدمہ کے ساتہ شائع کیا.

یوسف خاں کمبل پوش حیدرآباد میں پیدا ہوئے، 1828 میں لکھنؤ میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی اور نصیرالدین کے دربار سے وابستگی قائم کرلی اور نواب کی اجازت اور ایما پر انگلستان کا سفر کیا، یہ سفرنامہ انگلستان کے سفر کی روداد ہے۔ کمبل پوش انگلستان کے ماحول، بودوباش اور طرز معاشرت سے بہت متاثر تھے۔ انھیں واقعات کو اُس نے حقیقت نہایت ہی سلیس، عام فہم اور رنگین زبان میں موثر طور پر بیان کیا ہے۔ اس سفرنامہ کا بیانیہ منفرد اور اسلوب مختلف ہے۔

فدا حسین کا سفرنامہ 'تاریخ افغانستان' 1852 میں شائع ہوا۔ اس سفرنامے میں 1839 کو انگریزوں کے کابل پر حملہ نیز ہندوستان میں مقامی واقعات پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ فدا حسین جنگجو اور بہادر سپاہی تھا۔ اگرچہ وہ اس حملہ میں انگریزوں کی فوج میں شامل تھا۔ کم علم ہونے کی وجہ سے اپنے سفرنامے میں موثر بیانیہ انداز تحریر پیش نہ کرسکا۔

کمبل پوش کے ہم عصر نواب کریم خاں کا 'سیاحت نامہ' بھی اردو کے قدیم سفرناموں میں شمار ہوتا ہے۔ نواب کریم خاں جھجھر کے نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جھجھر کے مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں بہادر شاہ کے سفیر کے طور پر انگلستان کا سفر کیا اور دسمبر 1840 سے 1841 تک لندن میں قیام کیا۔ مقدمہ کا فیصلہ ان کے حق میں نہیں ہوا اور وہ مایوس ہوکر ہندوستان واپس آگئے۔ قیام لندن کے دوران وہ جو کچھ دیکھتے یا محسوس کرتے، وہ مستند حوالوں کے ساتھ اپنی ذاتی ڈائری میں نوٹ کرلیتے تھے۔ ان یادداشتوں کو انھوں نے سیاحت نامہ کی شکل میں شائع کرایا۔

کریم خاں کو بیانیہ پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ 'سیاحت نامہ' میں انھوں نے لندن کی تہذیب و معاشرت، بودوباش، اقتصادی اور معاشی زندگی کو بھرپور انداز میں بیان کیا ہے جو دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ وہ واقعات کو بیان کرتے ہیں بلکہ وہ معروضی انداز میں تاثرات اور آرا کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ مشرق و مغرب کی خوبیوں اور خامیوں اور مشاہدات و تجربات کو اپنی تحریروں میں قاری کو شریک کرنے کے فن سے بھی بخوبی واقف ہیں۔

مولوی مسیح الدین علوی کا 'سفرنامۂ لندن' بہت مقبول ہوا۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو انگریزوں نے 1856 میں معزول کردیا۔ نواب نے مولوی مسیح الدین علوی کو 140 افراد پر مشتمل ایک وفد جس میں دیگر افسران کے علاوہ ولی عہد، والدہ اور بھائی وغیرہ شامل تھے۔ لندن کے لیے دادرسی کے لیے روانہ کیا اور مسیح الدین علوی کو سفیر اودھ بھی بنا کر بھیجا۔ 18 جون 1856 تا 23 دسمبر 1865 تک انھوں لندن میں تقریباً سات سال قیام کیا لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں مل سکی اور مایوس ہوکر واپس ہندوستان آگئے۔ مولوی مسیح الدین کو نواب واجد علی شاہ نے سفارت کے منصب سے برطرف کردیا۔ قیام لندن کے دوران انھوں نے انگریزوں کی طرز معاشرت، صنعت وحرفت و بیان، جدید فن تعمیر اور ان کی ترقی کو بہت قریب سے دیکھا اور گہرا مشاہدہ کیا، انگریزوں کے مظالم اور استبداد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انھیں واقعات کو علوی نے اپنے سفرنامے 'تاریخ ہندوستان' میں نہایت معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔

علاوہ ازیں اسی نوع کی کتاب 'سفیر اودھ' کے نام سے ان کی خودنوشت 1929 میں 'الناظر' پریس لکھنو سے شائع ہوئی تھی۔

جدید نثر کا آغاز سرسید کے دور میں ہوا۔ سرسید کے ذریعہ اردو ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ سرسید کے رفقا نے اردو زبان وادب کو اردو کی مختلف اصناف سے متعارف کرایا۔ اس عہد میں چند اہم سفرنامے بھی شائع ہوئے۔ 'مسافران لندن' کو بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ یہ سرسید کا تعلیمی سفرنامہ ہے، جو ڈیڑھ سال 1869 تا 12 اکتوبر 1870 کے عرصہ کو محیط ہے۔

سرسید کے سفر لندن کا مقصد وہاں کے تعلیمی معیار، نصاب، تربیت اور تدریس کے طریق کار مشاہدہ کرنا تھا۔ علاوہ ازیں ولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' کا مستند حوالوں کے ساتھ نہ صرف جواب دینا تھا بلکہ اسے غلط ثابت بھی کرنا تھا۔ وہ اپنی قوم کی تعلیمی پسماندگی اور افلاس کو دیکھ کر مایوس بھی ہوتے تھے جبکہ لندن کی زندگی، تعلیمی معیار اور علوم وفنون سے انھوں نے جو تجربات حاصل کیے، انھیں وہ ہندوستان کے مسلم نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ لندن سے واپس آکر سرسید نے 'مسافران لندن' کے نام سے ایک معیاری سفرنامہ تحریر کیا۔

اسماعیل پانی پتی نے اس کے مختلف ماخذ کو ترتیب دیا، یہ سفرنامہ سرسید کی وفات کے بعد 1961 میں پہلی بار مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا۔ اس سفرنامہ میں انگریزوں کی ترقی کا موازنہ ہندوستانیوں کی پسماندگی سے کرتے ہیں اور بہت مایوس نظر آتے ہیں زبان سادہ سلیس، اسلوب منفرد اور انداز تحریر خطیبانہ ہے۔

'سفر پنجاب' بھی سرسید کے تعلیمی سفر سے متعلق ہے۔ سرسید نے 1884 میں پنجاب کے مختلف شہروں، لاہور، گرداس پور، لدھیانہ، پٹیالہ اور جالندھر وغیرہ کا سفر، علی

گڑھ کالج کی تعمیر کے لیے چندے کی اپیل کی غرض سے کیا تھا۔ اس سفر میں سرسید کے رفیق سفر محمد اقبال بھی شامل تھے۔ انھوں نے سرسید کی تقریروں، اپیلوں اور گزارشات کو ترتیب دے کر سفرنامے کی شکل مکمل کیا۔

سرسید کے ہم عصر مرزا اشار علی بیگ کا 'سفر یوروپ' بھی ایک اہم سفرنامہ ہے۔ وہ 1885 میں لندن کے سفر پر گئے، وہاں تین ماہ قیام کیا۔ اس سفر کا مقصد سیاحت کے ساتھ تعلیمی خرابیوں اور خوبیوں کا مشاہدہ بھی شامل تھا۔

مرزا اشار علی بیگ ڈپٹی انسپکٹر مدراس کے منصب پر بھی فائز تھے۔ انھوں نے اپنے مشاہدے اور تجربات کی روشنی میں وہاں کے اسکولوں، کالجوں اور طریقۂ تعلیم کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور ہر پہلو سے ہندوستان کے طریق تعلیم کا موازنہ بھی کیا۔

رام پور کے نواب محمد حامد علی خاں کا سفرنامہ 'سیر حامد' میں آکلینڈ کلون لیفٹنٹ گورنر کی دعوت پر سیاحت کے لیے نکلے۔ جاپان، فرانس، جرمنی، یونان، امریکہ، افریقہ اور مصر کی سیاحت کر کے جنوری 1884 کو ہندوستان واپس آئے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں انھوں نے اس سفرنامے کو مکمل کیا۔ 1896 میں نواب صاحب کے استاد مولوی فرخی نے اسے دو جلدوں میں آگرہ سے شائع کیا تھا۔

'سیر حامد' دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں ایشیا اور امریکہ اور دوسری جلد میں یوروپ اور مصر کے حالات وکوائف شامل ہیں۔ انھوں نے آداب شاہی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مغربی ممالک کی تہذیبوں اور طرز معاشرت کا مشاہدہ کیا اور اپنے سفرنامے میں پیش کیا ہے۔

علامہ شبلی اردو کے معروف نقاد اور سرسید کے رفقا میں تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں انھوں نے اسلامی ممالک کا سفر کیا اور 'سفرنامہ روم، مصر وشام' کے عنوان سے ایک وقیع اور معیاری سفرنامہ تحریر کیا۔

شبلی نے جب اسلام کی عظیم المرتبت شخصیات کی سوانح لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تو انھوں نے چند متعصب مورخین کی تحریروں میں تنگ نظری اور جانبداری محسوس کی۔

لہٰذا انھوں نے بنیادی ماخذ (Original Sources) تک وسائل حاصل کرنے کی غرض سے اسلامی ممالک کا سفر اختیار کیا۔ بیروت، قسطنطنیہ، بیت المقدس اور قاہرہ کے کتب خانوں 'دارالاستقامہ' نیز درس وتدریس کا بھی عمیق مطالعہ کیا۔ اخلاقی قدریں اور علوم وفنون کا بغور مشاہدہ کیا۔ وہاں کے حکمرانوں اور اہل علم شخصیات سے بھی ملاقاتیں کیں، عمارتوں اور اہم مقامات کی بھی سیر کی۔ مصر اور شام کے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

شبلی کو بیانیہ پر قدرت حاصل ہے۔ زبان کی فصاحت، شبلی کا امتیازی وصف ہے۔

اردو زبان وادب کی تاریخ میں مولانا محمد حسین آزاد کا نام مستند تصور کیا جاتا ہے۔ اردو میں ان کے دو سفرنامے ملتے ہیں۔ پہلا سفرنامہ 'وسط ایشیا کی سیر' ہے۔ یہ سفرنامہ آغا محمد اشرف نے مرتب کیا اور دوسرا سفرنامہ 'سیر ایران' ہے۔ اس سفرنامے کو آغا محمد طاہر نے منتشر یادداشتوں کی مدد سے مرتب کیا جو 192 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سفرنامہ علمی نوعیت کا ہے۔

محمد حسین آزاد بحیثیت اردو سفرنامہ نگار بھی اپنی امتیازی شناخت رکھتے ہیں۔ جعفر تھانیسری کا سفرنامہ 'تواریخ عجیب' موسوم بہ کالا پانی انگریزوں کے ظلم واستبداد کی داستان ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد علما اور مجاہدین آزادی کے لیے جو سخت سزائیں مقرر کیں۔ مولوی تھانیسری بھی اس کا نشانہ بنے اور انھیں مجاہدین آزادی کی مدد کرنے کی پاداش میں کالا پانی کی سزا دی گئی۔ انھوں نے اٹھارہ برس انڈمان میں گزارے۔ یہ سفرنامہ خود نوشت سوانح کی نوعیت کا ہے۔ اس میں انگریزوں کے مظالم کے ساتھ جزائر انڈمان کے حالات وکوائف نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

بیسویں صدی میں اردو سفر نامہ

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو نے نثری اسلوب، خصوصاً نثری اصناف کے حوالے سے خوب ترقی کی، کئی اہم نثر نگاروں کو جنم دیا اور کئی معیاری اردو سفرنامے بھی شائع ہوئے۔ ان سفرناموں کی طویل فہرست ہے۔ یہاں سبھی کا ذکر ممکن نہیں البتہ چند اہم سفرناموں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

ابتدائی دور کے سفرناموں میں والی ریاست بھوپال سلطان جہاں بیگم کا سفرنامہ 'سیاحت سلطانی' نواب لیاقت جنگ بہادر کا سفرنامہ 'یوروپ و امریکہ' اور سیاحت نامہ عبداللہ سندھی کا 'کابل میں سات سال' سر راس مسعود کا 'جاپان کا تعلیمی نظم ونسق' عبدالماجد دریابادی کا 'ڈھائی ہفتے کا پاکستان' قابل ذکر ہیں۔

اس دور کے چند اہم سفرنامے بھی سامنے آتے ہیں جنھیں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے مثلاً منشی محبوب عالم، خواجہ غلام الثقلین، خواجہ حسن نظامی، مہاراجہ کشن پرشاد، شیخ عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، نشاط النسا بیگم، مولانا عبداللہ سندھی، قاضی عبدالغفار، میر رضا علی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد حیدرآباد کے وزیر اعظم تھے۔ ان کے دو سفرنامے 'سیر پنجاب' اور 'سفرنامے' شائع ہوئے۔ 'سفرنامے' میں دکن کی سیاسی صورت حال اور تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔

'مقام خلافت' اور 'سیاحت نامہ یوروپ' شیخ عبدالقادر کے دو سفرنامے منظر عام پر آئے پہلے سفرنامے میں انھوں نے ترکی کے مسلم معاشرے کی روداد بیان کی ہے اور دوسرے سفرنامے میں یوروپ کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی صورت حال کا بیان کیا ہے۔

سید سلیمان ندوی اعلیٰ پائے کے نثر نگار، دانشور اور انشا پرداز تھے۔ وہ 1933 میں کابل کے شاہ نادر خاں کی دعوت پر علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ کابل گئے تھے۔ 'سیر افغانستان' سید سلیمان ندوی کا سفرنامہ اسی سفر کی روداد ہے۔

غلام الثقلین معروف دانشور اور عالم تھے۔ ایران، روس، قسطنطنیہ، عراق، مکہ اور مدینہ کی سیاحت کے بعد انھوں نے 'سیاحت نامہ' کے عنوان سے اپنا سفرنامہ ترتیب دیا جو نہایت سادہ پر تکلف اور حقیقت نگاری پر مبنی ہے۔

منشی محبوب عالم نے صحافی کے طور پر اپنی خدمات انجام دیں۔ ان کے دو سفرنامے 'بغداد' اور 'عجائبات یوروپ' میں بعض انکشافات اور نئی معلومات فراہم کی ہیں۔

حسرت موہانی کی اہلیہ بیگم نشاط النسا نے 1936 میں مولانا کے ساتھ عراق کا سفر کیا تھا۔ 'سفرنامہ عراق' دراصل اسی سفر کی یادگار ہے۔ انھوں نے اگرچہ عراق کو ایک خاتون مشرق کی نظر سے دیکھا لیکن عراق کی خواتین آزادگی اور روشن خیالی کو سراہا اور وہاں کی فن تعمیر کے حسن کو بیان کیا۔

قاضی عبدالغفار سیاست داں، تخلیق کار، وقائع نگار اور انشا پرداز تھے۔ 'نقش فرنگ' ان کا سفرنامہ بھی ہے اور تجزیہ بھی اور تبصرہ بھی جو انھوں نے انگریزوں کی سیاست ہندوستانیوں سے متعلق، ان کے رویے پر نہایت بصیرت افروز انداز میں کیا ہے۔ قاضی عبدالغفار احیا خلافت کے مسئلے پر گفتگو کرنے ممبر کی حیثیت سے لندن گئے تھے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ 'نقش فرنگ' اسی سفر کی روداد ہے۔

بیسویں صدی کے سفرنامے قدیم سفرناموں کی طرح صرف سیاحت کے واقعات اور مناظر کو پیش کرنے تک محدود نہیں ہیں بلکہ فخر وانبساط، کیفیات اور حصول عبرت اور ردعمل کا ذریعہ بھی ثابت ہوئے۔ ان کا یہ تخلیقی انداز فکشن کے بیانیہ سے قریب تر نظر آتا ہے، جہاں قاری کی شمولیت اوّل تا آخر برقرار رہتی ہے۔

■

Prof. Ziaurrahman Siddiqui
Dept. of Urdu, Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

قصیدے کی تدریس اور ظفر احمد صدیقی

مشیر احمد

ظفر احمد صدیقی کی علمی و ادبی فتوحات کی جہتیں مختلف ہیں۔ وہ بہ یک وقت عالم دین، محقق، مدون، ناقد، انشاپرداز اور بہترین معلم کے طور پر اردو دنیا میں معروف ہیں۔ ان کی علمی لیاقت اور صلاحیت کا دائرہ اردو زبان و ادب تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ عربی وفارسی زبان و ادب کے رموز و نکات اور اسلامی علوم و فنون پر بھی انھیں یکساں دسترس حاصل تھی۔ اس حوالے سے ان کی علمی و ادبی تخلیقات کے عمدہ نمونے ان کے متعدد مضامین/ لکچرس / خطبات وغیرہ کی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہیں۔

ظفر احمد صدیقی (1955-2020) کا نام زبان پر آتے ہی کلاسیکی شاعری کے رموز و نکات اور مشرقی شعر و ادب کی روایت کا ایک صحت مند خاکہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ ان کی علمی و ادبی فتوحات کی جہتیں مختلف ہیں۔ وہ بہ یک وقت عالم دین، محقق، مدون، ناقد، انشاپرداز اور بہترین معلم کے طور پر اردو دنیا میں معروف ہیں۔ ان کی علمی لیاقت اور صلاحیت کا دائرہ اردو زبان و ادب تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ عربی وفارسی زبان و ادب کے رموز و نکات اور اسلامی علوم و فنون پر بھی انھیں یکساں دسترس حاصل تھی۔ اس حوالے سے ان کی علمی و ادبی تخلیقات کے عمدہ نمونے ان کے متعدد مضامین/لکچرس/خطبات وغیرہ کی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ چنانچہ جب ہم ان کی جملہ تحریروں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان تخلیقات کے ضمن میں مختلف غیر مطبوعہ مضامین/لکچرس کے علاوہ مطبوعہ تحریروں کی بھی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔

فارسی شعر و ادب کے حوالے سے ان کے چند اہم مضامین میں غالب کی فارسی شاعری اور ہمارے سو سال، مکاتیب سنائی مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، اردو پر فارسی اثرات، غالب کی ایک فارسی غزل کا تجزیہ، شبلی کا فارسی تغزل، فردوسی اور شاہنامے پر محمود شیرانی کی تحقیقات، عہد عباسی کی عربی اور فارسی شاعری، فارسی قصیدہ نگاری پر عربی اثرات، چراغ دیر کی روشنی میں ایک گفتگو اور ابن سینا کا تصور شعر وغیرہ مضامین دنیائے ادب میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ عربی زبان و ادب کے حوالے سے ان کے پسندیدہ و منتخب مضامین میں عبدالعزیز میمنی: حیات اور خدمات، المرتضی ایک جائزہ، ایک کامیاب عربی تفسیر کا تعارف، ایک غیر مطبوعہ عربی تفسیر، ترجمان القرآن: ایک تجزیاتی مطالعہ، رد تشکیل ایک ادبی رجحان، شبلی اور عربی زبان و ادب، عربی زبان میں ہندوستانی الفاظ، عربی غزل: ہیئت اور حدود، عربی کی عشقیہ شاعری کے امتیازات، مولانا احمد تھانیسری اور ان کا نعتیہ قصیدہ اور مولانا علی میاں ندوی کا شعری ذوق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسلامی علوم و فنون کے مطالعے کی اگر بات کی جائے تو ظفر احمد صدیقی نے وہاں بھی اپنا گہرا نقش قائم کیا ہے۔ اس ذیل میں ان کے اہم مضامین کی فہرست ملاحظہ ہو: اردو زبان پر اسلام کا اثر، امام غزالی عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت، حجۃ اللہ اور علامہ شبلی، حجۃ اللہ البالغۃ: ایک تجزیاتی مطالعہ، عرفان محمدی کا رنگ و آہنگ، علوم دینیہ اور نول کشور، ملک و ملت کی تعمیر اور دینی مدارس، مولانا علی میاں ندوی کی سیرت نگاری، مولانا آزاد: فاضل علوم اسلامیہ، نبی رحمت۔ ایک متوازن کتاب سیرت اور حضرت تھانوی کے مواعظ کا ادبی مطالعہ وغیرہ اہم مضامین کا نام لیا جاسکتا ہے۔

یہ تمام مضامین/مقالات مختلف قومی/بین الاقوامی سمیناروں میں سامعین کی داد و تحسین سے نوازے جاچکے ہیں۔

ظفر احمد صدیقی اردو زبان و ادب کی تدریس سے وابستہ رہے، ان کا زمانۂ تدریس شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کم و بیش بیالیس سال (1979-2020) کے عرصے کو محیط ہے۔ اس درمیان انھوں نے جامعہ اسلامیہ بنارس میں بھی درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اردو زبان و ادب سے متعلق ظفر احمد صدیقی نے اپنی تخلیقات اور مضامین کے ذریعہ اہل اردو کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی، ان کی اہم کتابوں میں قصیدہ: اصل ہیئت اور حدود (2020)، نظم طباطبائی (مونوگراف 2020)، شبلی کی علمی و ادبی خدمات (2021)، افکار و شخصیات (سرسید سے عہد حاضر تک، مجموعۂ مضامین 2006)، تحقیقی مقالات (مجموعۂ مضامین 2003)، مولانا شبلی بہ حیثیت سیرت نگار (2001)، نقش معنی (مجموعۂ مضامین 1999)، شبلی (مونوگراف 1988)، تنقیدی معروضات (مجموعۂ مضامین 1983) وغیرہ کتابیں اہمیت کی حامل ہیں۔

ظفر احمد صدیقی کی مرتبہ و مدونہ کتابوں میں شبلی شناسی کے اولین نقوش (2016)، مثنوی موعظۂ آرائش معشوق (شاہ مبارک آبرو 2013)، شرح دیوان اردوے غالب (نظم طباطبائی 2012)، مقالات نذیر (2012)، دیوان ناظم (نواب یوسف علی خاں ناظم، رام پوری 2011)، شبلی معاصرین کی نظر میں (2005)، انتخاب کلام آبرو (1997)، انتخاب کلام مومن (1983) وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک ان کے اردو مضامین کا تعلق ہے تو ان کی تعداد تقریباً سیکڑوں میں ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی بطور نمونہ بعض اہم مضامین کی فہرست درج کر دی جائے تا کہ بحیثیت مضمون نگار ان کی اہمیت و افادیت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔ ان کے اہم مضامین کی فہرست اس طرح ہے۔ اٹھارہویں صدی میں دکن کی نثری تصانیف، اردو زبان اور مشترکہ تہذیب، اردو زبان کے امتیازات، اردو میں لغت نویسی، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، اردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اقبال سہیل کا ایک نعتیہ قصیدہ، اکبر کی معنویت عہد حاضر میں، امالہ کب اور کیوں، آبرو کا ایہام، آغا حشر بہ حیثیت شاعر، باغ و بہار کی تدوین جدید، بحر الفصاحت از حکیم نجم الغنی خاں رامپوری، بلاغت

کی بعض اصطلاحیں، پروفیسر آل احمد سرور اور اقبال تنقید، پروفیسر حنیف نقوی بہ حیثیت غالب شناس، تعقید ایک ادبی اصطلاح، خطبات احمد یہ ایک قابل قدر علمی کاوش، ذوق وشوق۔ تعبیر وتحسین، کربل کتھا، کلام آبرو، کلام دبیر کا فنی نظام اور ہم سفر ایک منفرد خودنوشت وغیرہ۔

یہاں ضمناً اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ظفر احمد صدیقی کی تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی نگارشات ایسی ہیں جن پر مکمل بحث وتمحیص کی گنجائش موجود ہے۔ ان کے ایک ایک جملے میں ایسے ایسے نکات پوشیدہ ہیں جن پر مزید توضیح وتشریح کی ضرورت ہے۔ زیر نظر مضمون میں ان امور کا احاطہ دشوار ہے اور یہ اس کا محل بھی نہیں ہے۔

قصیدے کے فن اور اس کی تفہیم کے حوالے سے ظفر احمد صدیقی نے کئی مضامین لکھے ہیں، مثلاً قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود (اسی نام سے ان کی آخری کتاب بھی 2020 میں منظر عام پر آئی ہے۔ جس میں قصیدے کی شعریات، بعض قصیدہ نگاروں کی قصیدہ نگاری اور نصرتی، سودا، ذوق، غالب اور محسن کاکوروی وغیرہ کے قصیدوں کی تشریح اور تجزیہ شامل ہے)، فارسی قصیدہ نگاری پر عربی اثرات اور قصیدے کی تدریس وغیرہ۔ قصیدے کے علاوہ جن کلاسیکی اصناف پر انھوں نے مضامین قلم بند کیے، ان میں عربی غزل: ہیئت اور حدود، مثنوی: اصل، ہیئت اور حدود، اور مرثیے کی شعریات وغیرہ لائق ذکر اور قابل توجہ ہیں۔

ظفر احمد صدیقی نے بعض کلاسیکی شعرا کو بھی اپنے مضامین میں جگہ دی ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے ان کے اہم مضامین میں آبرو کا ایہام، بہادر شاہ ظفر، سوانح آبرو، سودا کی غزل، ولی کا فن، غالب اور معارضۂ کلکتہ، مطالعۂ غالب کی تازہ صورت حال، مومن کی ایک غزل کا تجزیہ، مصحفی کے باغ قصائد کی سیر، نظیر اکبرآبادی کی غزل گوئی اور کلام دبیر کا فنی نظام وغیرہ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ (مذکورہ بالا کتابیں، مضامین کی فہرست ظفر احمد صدیقی کا سوانحی خاکہ/ بایوڈاٹا سے ماخوذ ہے، جو انھوں نے اپنی زندگی میں تیار کرایا تھا)

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ ظفر احمد صدیقی اردو زبان وادب کی تدریس سے وابستہ رہے اور ساتھ ہی انھیں عربی، فارسی ادبیات کے علاوہ علوم اسلامیہ پر بھی عبور حاصل تھا۔ اسی طرح وہ کلاسیکی شعر وادب پر بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ بطور خاص قصیدے کے میدان میں ظفر احمد صدیقی ایک بڑا اور معتبر نام ہے۔ سر دست ظفر احمد صدیقی کے دیگر کمالات وصفات سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم قصیدے کی تدریس کے سلسلے میں ان کی انفرادیت اور اہمیت اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ راقم الحروف علی گڑھ میں ظفر احمد صدیقی کا باقاعدہ شاگرد رہا ہے اور کلاس روم میں ان سے متعدد قصیدے پڑھنے کا شرف بھی راقم کو حاصل ہے۔ عام طور پر استاد محترم کی گفتگو مدلل اور سیر حاصل ہوتی تھی، ان کی بات چیت کا انداز انوکھا اور نرالا ہوتا تھا۔ قصیدے کی تدریس کے دوران جو بھی گفتگو وہ کرتے تھے، ذہن پر نقش ہوجایا کرتی تھی۔

قصیدے کو ایک مشکل اور بھاری بھرکم چیز سمجھا جاتا ہے، اساتذہ ہوں یا طلبہ دونوں اس سے گھبراتے ہیں۔ ایک تو متن پڑھنا اور دوسرے اس کی توضیح وتشریح کرنا دونوں مشکل امر ہیں۔ گویا قصیدے سے بیگانگی اور اجنبیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ استاد محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے اپنی کتاب 'قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود' میں لکھا ہے کہ قصیدہ ہمارے لیے راز سر بستہ کیوں ہے اور ہمارے اور اس صنف سخن کے درمیان اجنبیت کے اسباب کیا ہیں؟ انھوں نے تین بنیادی وجوہات کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''اول ہمارے اوّلین ادبی مفکروں اور رہنماؤں کا قصیدے کے متعلق منفی رویہ۔ دوم قصیدے کی شعریات سے ناواقفیت۔ سوم ان علوم وفنون، لفظیات ومصطلحات کا عدم رواج جو قصائد کی تعمیر میں خشت زیریں کا حکم رکھتے ہیں۔'' (ص 72) (قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود۔ ظفر احمد صدیقی، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2020)

منفی رویے کی جہاں تک بات ہے تو اس سلسلے میں مولانا حالی کے وہ بیانات ہیں جن میں انھوں نے کلاسیکی اصناف سخن کو قابل اصلاح یا گردن زدنی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک غزل اور قصیدہ معتوب صنف سخن رہی ہیں۔ جس کی مثالیں دیباچہ (مسدس) اور مقدمہ شعر وشاعری میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ بقول ظفر احمد صدیقی:

''حالی کی ان تنقیدوں سے عام ذہن یہ بنا کہ قصائد میں نری لفاظی ہوتی ہے۔ ان سے خوشامد پسندانہ ذہنیت کو فروغ ملتا ہے۔ ان میں سماجی افادیت کا پہلو مفقود ہے۔'' (ایضاً، ص 73)

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ حالی کی یہ تنقید صرف اصلاحی نقطۂ نظر سے تھی۔ اسی لیے وہ اپنی تحریروں/ تنقیدوں میں کلاسیکی شاعری کی شعریات بیان کرنے میں محتاط نظر آتے ہیں۔ ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حالی نے کلاسیکی اصناف سخن کے بارے میں جو کچھ کہا یا لکھا اس کا منشا ان کی کم علمی یا لاعلمی تھا۔ دراصل ان پر شاعری کی اصلاح اور اس کی سماجی افادیت کے تصورات کا ایسا غلبہ تھا کہ انھوں نے اپنی تنقیدوں میں کلاسیکی شاعری کے فنی مسائل ومباحث سے بڑی حد تک صرف نظر کیا۔ (ایضاً، ص 74)

قصیدہ کلاسیکی صنف سخن ہے اور کلاسیکی دور میں روایت کے تحت شاعری کی جاتی ہے، مضامین وموضوعات کی شاعری کی جاتی ہے۔ اس میں خیال آرائی کا غلبہ ہوتا ہے، خیال کی دنیا سجائی جاتی ہے۔ جس طرح غزل کے کردار متعین ہوتے ہیں، اسی طرح قصیدے کے کردار بھی متعین ہوتے ہیں۔ مثلاً غزل میں شاعر ایک عاشق کا کردار پیش کرتا ہے، اس کا ایک خیالی اور فرضی محبوب ہوتا ہے، اسی کا ذکر کرتا ہے۔ قصیدے میں وہ جس ممدوح کو پیش کرتا ہے اس کے کچھ اوصاف وکردار ہوتے ہیں۔ ہر قصیدہ گو یہ کہے گا کہ ہمارا ممدوح بہت سخی ہے، بہت بہادر ہے، رحم دل ہے وغیرہ۔ اب قصیدہ گویوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کرداروں کے اوصاف وکمالات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی فنکارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کریں۔ موضوع سب کا ایک رہتا ہے البتہ پیرایۂ بیان اور انداز بیان بدلتا رہتا ہے۔

اہل علم واقف ہیں کہ قصیدے کے موضوعات کا دائرہ محدود ہے۔ اس لیے قصیدہ گو اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لیے قصیدے کا جو تمہیدی حصہ ہوتا ہے اس میں مختلف علوم وفنون کا استعمال کرتا ہے، وہاں قصیدہ گویوں کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ اصل موضوع پر آنے سے قبل اپنی فنکارانہ صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کرسکیں۔

استاد محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے قصیدے کے درس وتدریس کے دوران جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا سد باب کرتے ہوئے اپنی کتاب میں بعض تجاویز پیش کی ہیں۔ مثلاً:

1 قصائد سے متعلق منفی رویہ کو ختم کیا جائے۔

2 قصائد کی شعریات سے طلبا کو واقف کرایا جائے۔ قصائد میں مضمون آفرینی، دقت پسندی، مبالغہ پروری اور صنائع وبدائع کے جواز، ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی جائے۔

3 ڈاکٹر ابو محمد سحر نے انتخاب قصائد اردو میں قصائد کے مشکل الفاظ اور مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات وتلمیحات کو حل کر دیا ہے۔ اردو کے تمام اساتذہ کو عموماً اور قصیدے کے اساتذہ کو خصوصاً اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

4 قصیدے کے استاذ کو چاہیے کہ وہ اپنے شہر کے پرانے اساتذہ میں کسی سے شامل نصاب قصیدے کو سبقاً سبقاً ضرور پڑھ لے تا کہ وہ ہر شعر کے تمام الفاظ کا صحیح تلفظ کر سکے اور مفہوم کے سلسلے میں تذبذب کا شکار نہ ہو۔ اس کے بغیر طلبا تک اس کا نفع عام اور فیض تام نہ ہوسکے گا۔

5 ابتدا میں طلبہ کو قصیدے کے پانچ سات شعر سے زیادہ نہ پڑھائے جائیں۔

6 قصیدے کے درس میں طلبا سے بلند خوانی ضرور کرائی جائے۔

7 قصیدے کے ہر شعر کی مکمل تفہیم کے بعد طلبا کو اس کا مفہوم اختصار کے ساتھ لکھوا بھی دیا جائے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ تفہیم کے بغیر مفہوم لکھوانا لغو اور بے فائدہ ہوگا۔

8 قصیدے کے درس میں آموختہ سننے کا اہتمام ضرور کیا جائے۔ اس طرح کہ کبھی کسی طالب علم سے پوچھا جائے اور کبھی کسی سے۔

9 شامل نصاب ہر قصیدے کے پانچ سات پسندیدہ شعر ہر طالب علم کو ضرور یاد کرائے جائیں اور پھر ان سے انھیں زبانی سنا بھی جائے۔ یقین ہے کہ اس طرح اجنبیت کی دیواریں ٹوٹ جائیں گی اور قصیدہ ہمارے لیے نامحرم نہ رہے گا۔ (ایضاً ص 78)

مذکورہ بالا تجاویز کے پیش نظر اب ہم استاد محترم کے کلاس روم کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا طریقۂ درس و تعلیم کیسا رہا۔

قصیدہ، اس کے فنی مسائل و مباحث، رموز و نکات، شعریات اور اس کی تدریس کا جب بھی ذکر ہوتا ہے تو مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ اردو استاد محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے بغیر نامکمل تصور کیا جاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 2000-1999 جب میں ایم اے کر رہا تھا تو ایک دن ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ میں ڈاکٹر نادر علی خاں سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے شعبہ کے حوالے سے بہت ساری باتیں کیں، دوران گفتگو انھوں نے دریافت کیا کہ میاں قصیدہ کون پڑھا رہا ہے؟ میں نے ظفر صاحب کا نام لیا، بہت خوش ہوئے اور کہا کہ شعبے میں پہلا شخص ہے جو صنف قصیدہ اور متن قصیدہ کا حق ادا کرے گا۔ ورنہ اس صنف کو پڑھنے سے طلبا تو دامن بچاتے ہی ہیں، اساتذہ بھی گھبراتے ہیں۔ نادر صاحب نے بالکل درست فرمایا تھا۔ استاد محترم کی قصیدے کی کلاس بالکل غزل کی کلاس لگتی تھی، خوب مزے لے لے کر ایک ایک شعر پڑھتے اور پھر اس کی بھرپور توضیح و تشریح کرتے۔ آخر میں اس کا مفہوم بھی لکھوا دیا کرتے تھے۔ دوسرے دن انھی اشعار کی طلبا سے بلند خوانی کراتے اور اس کا مفہوم بھی پوچھتے تھے۔ اس کے بعد آئندہ شعر کا نمبر آتا تھا۔ استاد محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا یہ انوکھا اور نرالا انداز ہم طلبا کے لیے بہت سودمند ثابت ہوتا، قصیدے جیسا خشک موضوع بھی دلچسپ ہو جاتا اور ہم سب کو مزہ آنے لگتا تھا۔

قصیدے کی تدریس سے پہلے استاد محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے ہمیں صنف قصیدہ کے تعلق سے بہت اہم اور بنیادی باتیں بتائیں مثلاً جس طرح سے کوئی دریا ہے، اس کا منبع و آغاز ہوتا ہے اسی طرح سے اصناف سخن کا بھی ایک منبع ہوتا ہے۔ قصیدے کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ ایک دور میں یہ سب سے مقبول تھا، اب اسے کلاسیکی صنف سخن کی حیثیت سے پڑھتے ہیں۔ اردو قصیدہ اصلاً فارسی سے ماخوذ ہے اور فارسی قصیدہ نے عربی کی مدحیہ شاعری سے ہیئت اور اجزائے ترکیبی حاصل کی ہیں۔ قصیدے کی مکمل تاریخ کا مفصل خاکہ نقشہ پیش کیا جیسے کہ عربی شاعری کے کلاسیکی ادوار جیسے دور جاہلیت، صدر اسلام، دور بنو امیہ اور دور بنو عباس یا عہد عباسی۔ اس کے بعد ہر دور کی شاعری کی خصوصیات اور تفصیلات کا ذکر کرتے۔ قصیدے کا دکنی دور اور شمالی ہندوستان کا دور مفصل بیان کرنے کے بعد پھر اصل متن سبق کی طرف رجوع کرتے۔

اگر اصولی طور پر دیکھا جائے تو اصل سبق شروع کرنے سے قبل تمہید سبق کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ استاد محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے قصیدے کے متن کی تدریس سے پہلے تمہیدی گفتگو میں قصیدے کی پوری تاریخ روایت، اس کے فنی مباحث، شعریات اور اس کی اہمیت و افادیت پر سیر حاصل بحث کی۔ تمہیدی گفتگو ہی کسی سبق کی اہم منزل ہے اور اسی پر کسی سبق کی کامیابی و ناکامی کا انحصار ہوتا ہے۔ تمہیدی گفتگو سے طلبا کا ذہن اصل متن پڑھنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

آموختہ سننا بھی ایک ضروری اور اہم عمل ہے اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ طلبا کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ ذہن پر پوری طرح منقش ہو جانے کے ساتھ ساتھ ازبر بھی ہو جائیں۔

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایم۔ اے (سال دوم) کی کلاس میں قصیدے کا نصاب کل پانچ قصائد پر مشتمل تھا۔ جن میں نصرتی کا قصیدہ 'قصیدہ بادشاہ غازی بیجاپور کو آنے کا' جس کا مطلع ہے 'اے شہ تو ں ہم نام علی، شاہاں پو تیری سروری'۔ سودا کا قصیدہ 'قصیدہ در نعت' جس کا پہلا مصرع 'ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی'۔ ذوق کا قصیدہ 'قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر' جس کا پہلا مصرع ہے 'ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی'۔ غالب کا قصیدہ 'قصیدہ در منقبت حضرت علیؓ' جس کا پہلا مصرع ہے 'دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں'۔ اور محسن کاکوروی کا قصیدہ 'مدیح خیر المرسلین ﷺ' جس کا پہلا مصرع 'سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل' ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کی ہر قصیدے کا ایک ایک شعر استاد محترم کے پڑھائے ہوئے طریقے کے مطابق نقل کر دیا جائے تا کہ اساتذہ اور طلبا کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنے۔ نصرتی کے قصیدے کا دوسرا شعر۔

سب دھرت کے تختے پوتوں جب شش جہت کو بند کیا
دندی معطل ہو پڑیا، یک یک ہو مہرہ ششدری

ظفر صاحب شعر کے مشکل الفاظ کے معنی بتانے کے بعد پھر اس کی تشریح کرتے، بعد ازاں اس کا مفہوم لکھوانے کا سلسلہ شروع ہوتا۔ مثلاً دھرت۔ زمین، دندی۔ دشمن، پڑیا۔ پڑا (ماضی مطلق کا صیغہ)، ششدری۔ منسوب بہ ششدر، یائے نسبتی ہے، ششدر ہونا۔ شطرنج میں مہرے کی چال کا ہر طرف سے بند ہونا، مجازی معنی عاجز ہونا، حیران ہونا۔ اب اس شعر کی تشریح ملاحظہ ہو: اے بادشاہ جب آپ نے زمین کے تختے پر چھے کی چھے سمتوں کو بند کر دیا تو آپ کا ایک ایک دشمن ششدر مہرے کی طرح معطل ہو کر پڑ گیا۔

سودا کے قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

تمغا۔ اعزازی نشان، سند، امتیاز، زنار۔ اس کے دو معنی ہیں اول وہ قدرتی آڑی لکیر یا دھاری جو نگینوں میں ہوتی ہے، دوم وہ دھاگا جسے ہندو گلے سے بغل کے نیچے تک ڈالتے ہیں اور عیسائی، مجوسی اور یہودی کمر میں پہنتے ہیں، زنار تسبیح سلیمانی۔ وہ سفید لکیر جو تسبیح سلیمانی کے دانوں میں ہوتی ہے، سلیمانی۔ وہ سیاہ پتھر جس میں سفید لکیر ہوتی ہے، اس کے دانوں سے تسبیح بناتے ہیں۔

یہ نعتیہ قصیدہ ہے۔ پہلا حصہ تشبیب پر مشتمل ہے، تشبیب کی بہت سی قسمیں ہیں، یہ تشبیب حکمت و دانشوری کی تشبیب ہے، یعنی فلسفہ و حکمت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ تشبیب کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی حکیمانہ یا فلسفیانہ نکتہ پیش کیا گیا ہے۔ اس شعر میں یہ دعوی پیش کیا ہے کہ استقامت اور ثابت قدمی بہت بڑا وصف ہے، بہت بڑی قابل قدر صفت ہے۔ اتنی بڑی کہ کفر کو ایمان کا درجہ نصیب ہو سکتا ہے یعنی کفر جیسی ادنی چیز میں بھی اگر استقامت اور ثابت قدمی پائی جاتی ہے تو وہ تمغۂ اسلام بن سکتا ہے۔ کفر میں اگر دوام کی صفت پیدا ہو جائے تو یہ اسلام کے لیے باعث امتیاز ہے۔ دوسرے مصرعے میں دلیل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سنگ سلیمانی سے بنی ہوئی تسبیح کے دانوں میں جو دھاریاں ہوتی ہیں انھیں زنار کہتے ہیں، یہ دانوں میں اس طرح پیوست ہوتی ہیں کہ شیخ اگر چاہے تو بھی انھیں توڑ نہیں سکتا لہٰذا معلوم ہوا کہ زنار یعنی علامت کفر تسبیح سلیمانی میں ثابت و مستحکم ہے اور دوسری جانب یہی دھاریاں تسبیح سلیمانی کا حسن بھی ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ کفر جب ثابت ہو جائے تو وہ

اسلام کے لیے باعث افتخار بن جاتا ہے۔

ظفر صاحب جب قصیدے کے اشعار کی تشریح کرتے تو زیر بحث اشعار کی تشریح کرتے وقت اس موضوع ر مضامین سے متعلق دیگر شعرا کے اشعار بھی پیش کرتے، جس کا فائدہ یہ ہوتا کہ ایک موضوع سے متعلق کئی اشعار جمع ہو جاتے۔ مثلاً مذکورہ اشعار کے ذیل میں انھوں نے میر، غالب، ذوق وغیرہ کے اشعار بھی طلبا کے سامنے پیش کیے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میر کا شعر نقل کر دیا جائے۔

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لیے
حسن، زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

اب ذوق کے قصیدہ کا دوسرا شعر پیش خدمت ہے۔

کرتا ہے ہلال ابروے پرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ذوق نے یہ قصیدہ عید کی تہنیت پر لکھا ہے۔ یہاں حسن تعلیل کا پیرایہ اپنایا ہے۔ آسمان پر نکلا ہوا شروع مہینے کا چاند جو ابرو کی مانند ہے، گویا اپنے ابروں سے ساقی کو اشارہ کر رہا ہے کہ تم سنہری کشتی کے اندر سجا کر شراب لے آؤ اور پینے والوں کو پیش کر دو۔ گویا اس بات کی علامت ہے کہ رمضان بھر لوگوں کے پینے پلانے کا سلسلہ بند تھا، اسے پھر شروع کر دو۔

چونکہ ہلال کی شکل ابرو کے مشابہ ہوتی ہے اور ابرو کا استعمال اشارے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس لیے شاعر حسن تعلیل کے طور پر کہتا ہے کہ عید کا چاند اشارہ کر رہا ہے۔

ابرو، پرخم، اور اشارے کے درمیان مناسبت ہے۔ اسی طرح ساقی، بادہ اور کشتی بھی باہم ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں۔

غالب کے قصیدے کا مطلع ملاحظہ ہو

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

دہر۔ زمانہ، یکتائی۔ منفرد ہونا، اکیلا ہونا، خود بیں۔ اپنے آپ کو دیکھنے والا۔

غالب نے وحدت الوجود کے فلسفے پر اپنے اس قصیدے کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ غالب کی جدت اور انفرادیت ہے۔ غالب سے پہلے کسی اور شاعر نے اس فلسفے پر اپنے قصیدے کی بنیاد نہیں رکھی۔ یہ مضمون صرف غزلوں میں ہوتا تھا۔ وحدت الوجود کی تفصیلات کے ذیل میں استاد محترم نے بتایا کہ یہ تصوف کی ایک اصطلاح ہے۔ صوفی وحدت الوجود کا قائل ہے۔ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد آسمان پر ستاروں کا وجود نہیں ہوتا یہ غلط ہے۔ بلکہ اس کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے ایسے ہی صوفی کہتا ہے کہ ہر چیز فانی ہے حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے۔ صوفی کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں دکھائی دیتا۔ اللہ کی ذات کے طلوع ہو جانے کے بعد دنیا میں کسی جلوے کا وجود نظر نہیں آتا۔

شاعر نے قصیدے کے مطلع میں وحدت الوجود کا مضمون نظم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زمانہ یعنی کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ معشوق حقیقی کی یکتائی کے جلوے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی کائنات کی ہر چیز در حقیقت معشوق حقیقی کے مختلف جلوے ہیں۔ شاعر دوسرے مصرعے میں کہتا ہے کہ حسن حقیقی یعنی اللہ کا حسن، اللہ نے چاہا کہ وہ اپنے جلوؤں کو دیکھے، اس لیے ہم کو یعنی انسانوں کو اور کائنات کی دوسری مخلوقات کو وجود بخشا تا کہ اس آئینے میں وہ اپنے جلوؤں کا مشاہدہ کرے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ کائنات اور اس کی رنگا رنگ مخلوقات در حقیقت اپنا کوئی وجود نہیں رکھتیں۔ یہ سب محض معشوق حقیقی کے جلوؤں کے ظہور کی مختلف شکلیں ہیں۔

محسن کاکوروی کے قصیدے کا پہلا شعر۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

مذکورہ قصیدے کے تعلق سے استاد محترم کی بتائی ہوئی اہم باتوں میں ایک تو یہ کہ اس پر اعتراض کیا گیا کہ جب نعتیہ قصیدہ لکھنا ہے تو ہندو دیو مالا کا استعمال کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس بات پر اعتراض ہے دراصل وہی اس قصیدے کا حسن ہے۔ یہ ایک طویل قصیدہ ہے، اس میں مستانہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہاں شاعر کا ذہن بھٹکتا ہوا کاشی اور متھرا کی جانب چلا گیا ہے، پھر دھیرے دھیرے اصل موضوع کی طرف مائل ہوا ہے۔ یہ قصیدہ تمام نعتیہ قصیدوں میں سب سے اہم ہے۔

محسن کاکوروی کے کلیات میں پانچ قصیدے ہیں اور ان سب کا تعلق نعت سے ہے۔ ان کے نام ترتیب وار اس طرح ہیں: گلدستۂ کلام رحمت، ابیات نعت، مدیح خیر المرسلین ﷺ، نظم دل افروز اور انیس آخرت۔ ان تمام قصیدوں میں زیر بحث قصیدہ ہی سب سے زیادہ مقبول اور منفرد ہے۔ ظفر احمد صدیقی نے اپنی کتاب قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود میں اس قصیدے کے ذیل میں لکھا ہے:

''اس قصیدے کے تمام اشعار لام پر ختم ہوتے ہیں۔ اس لیے اسے قصیدۂ لامیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ غیر مردف ہے۔ اصلاً یہ زمین عرفی کی ہے۔ محسن نے عرفی کی زمین میں یہ قصیدہ لکھا ہے۔ سودا نے بھی اس زمین میں لامیہ قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں لکھا ہے۔ مدیح خیر المرسلینؐ اس قصیدے کا تاریخی نام ہے۔ اس سے 1293ھ (1876) برآمد ہوتا ہے۔'' (ایضاً ص 201)

محسن کاکوروی نے اس نعتیہ قصیدے کی تشبیب بہاریہ رکھی ہے یعنی اس میں ابر، باد، برق اور بارش وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ بھی اہتمام کیا ہے کہ اس میں ہندو اساطیر، ہندو دیو مالا اور ہندو تلمیحات کا خاص طور پر ذکر ہوتا رہے۔ اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی ذہن اپنے ماحول سے نعت کے مضمون تک پہنچ جائے۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ یہ قصیدہ بہاریہ ہے اور بہار کی وجہ سے پانی، بادل وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہاں جس بہار کا ذکر ہو رہا ہے اس کا تعلق ہندوستان سے ہے۔

قصیدے کی تشریح کے دوران کلاس میں جو تفصیلات سامنے آئیں وہ اس طرح ہیں: کاشی پورب میں ہے اور متھرا اس کے پچھم میں۔ کاشی کی طرف سے متھرا کی جانب بادل بھاگتے ہی جا رہے ہیں، بات یہ ہے کہ متھرا والوں کو گنگا جل کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ اس لیے یہ انتظام کیا گیا کہ جلدی سے کاشی سے متھرا کی جانب بادل کو روانہ کر دیا گیا۔ اور باد صبا بجلی کے کاندھے پر گنگا جل لانے کا انتظام کر رہی ہے۔

اس قصیدے کے مطلع میں ایک طرف بادل، برق اور صبا وغیرہ الفاظ لا کر بہار اور اس کے لوازمات کا ذکر کیا ہے تو دوسری جانب کاشی، متھرا اور گنگا جل کے ذکر کے ذریعے ہندوؤں کے مقدس مقامات اور پاکیزہ پانی کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو شاعر نے پہلے شعر کے ذریعے ہی قصیدے کے تشبیب کی جہت متعین کر دی ہے۔

اس تفصیلی گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ قصیدے کی تدریس کے حوالے سے ظفر احمد صدیقی کا طریقۂ کار بالکل جداگانہ اور الگ نوعیت کا تھا۔ اگر اس طریقے کو عمل میں لایا جائے تو طلبا کے لیے کار آمد اور مفید ثابت ہوگا۔ گذشتہ سطور سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ استاد محترم قصیدے کی تدریس کے دوران کس طرح طلبا کے ذہن کی آبیاری کرتے تھے اور ان کے اندر قصیدے کا شوق اور دلچسپی قائم کر دیتے تھے کہ قصیدے جیسی خشک اور مشکل صنف بھی لطف و انبساط کا ذریعہ بن جاتی تھی۔ قصیدے کی کلاس کے علاوہ ان کی ہر کلاس (راقم الحروف کو صنف مرثیہ، متن اور اقبالیات کی کلاس پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہے) ایسی ہی ہوتی تھی۔ گویا ساری باتیں ذہن پر نقش ہو رہی ہیں اور سیدھے دل کے اندر اترتی چلی جا رہی ہیں۔

■

Dr. Musheer Ahmad
Assistant Professor, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:9560786298
Email.: dr.musheer1978@gmail.com

صابر علی سیوانی

ظہیر دہلوی کی شعری کائنات

بہادر شاہ ظفر کے عہد میں متعدد شعراء، ادبا اور مصنفین کو شہرت حاصل ہوئی۔ ظفر کی سرپرستی نے اردو شعر و ادب کو عروج بخشا۔ ان کے عہد میں متعدد ادبی و سیاسی دستاویزات منصہ شہود پر آئیں۔ اسی عہد میں ذوق دہلوی جیسے قادرالکلام شاعر کو مقبولیت و محبوبیت حاصل ہوئی۔ ذوق کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد بتائی جاتی ہے۔ بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر کو بھی ذوق کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ذوق کے انتقال کے بعد ظفر نے مرزا غالب سے مشورۂ سخن کیا، لیکن ان کا اپنا ایک منفرد رنگ ابھر کر سامنے آیا۔ ذوق کے نامور شاگردوں میں ظہیر دہلوی بھی شمار کیے جاتے ہیں، جنھیں شاعری سے زیادہ ان کی نثر نگاری کے باعث شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی یادگار تصنیف 'داستانِ غدر' نے انھیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ ظہیر دہلوی بہادر شاہ ظفر کے دربار میں داروغۂ ماہی مراتب کے عہدے پر فائز تھے۔

ظہیر دہلوی کا پورا نام سید ظہیر الدین حسین تھا، لیکن ظہیر دہلوی کے نام سے ادبی تاریخ میں ان کی اپنی منفرد شناخت قائم ہے۔ ظہیر تخلص کرتے تھے۔ وہ سید جلال الدین حیدر کے فرزند تھے۔ جلال الدین حیدر ایک بہت بڑے خوشنویس تھے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے خوشنویسی میں استاد تھے۔ 'مرصع رقم' اور 'خان بہادر' کے خطابات سے سرفراز تھے۔ ظہیر الدین دہلوی کی عرفیت نواب مرزا تھی۔ 'داستانِ غدر' سے معلوم ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے انھیں 'راقم الدولہ' کا خطاب عطا کیا تھا (صفحہ 33) مولوی عبدالحی نے اپنی کتاب 'گلِ رعنا' میں ان کے نام کے ساتھ 'خان بہادر' کا اضافہ کیا ہے۔ سیدہ جعفر کے مطابق

''ظہیر دہلوی کا سلسلۂ نسب شاہ نعمت اللہ کے توسط سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ یہ وہی نعمت اللہ ہیں جن کے پوتے نوراللہ کو بہمنی حکمراں احمد شاہ بہمنی نے دکن بلوایا تھا۔ جب ایران میں شاہ نعمت اللہ کا انتقال ہوگیا تو ان کے بیٹوں شاہ خلیل اللہ اور شاہ حبیب اللہ نے دکن کا رخ کیا اور بہمنی سلطنت میں عزت و توقیر حاصل کی۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، ہاشم نگر لنگر حوض حیدرآباد، 2002، ص 126)

شاہ نعمت اللہ کے پوتے شاہ نوراللہ احمد شاہ کے زمانے میں بیدر آئے تھے۔ شاہ نعمت اللہ اور ان کے فرزند شاہ خلیل اللہ اور شاہ خلیل اللہ کے فرزندان شاہ حبیب اللہ اور شاہ محبت اللہ کی دکن میں آمد کے سلسلے میں نصیرالدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ:

''احمد شاہ نے گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس عہد میں ایران کے شاہ نعمت اللہ کے پوتے شاہ نوراللہ بیدر میں آئے۔ جب شاہ نعمت اللہ کا ایران میں انتقال ہوگیا تو ان کے فرزند شاہ خلیل اللہ بھی بیدر آئے۔ ان کے ساتھ ان کے فرزند شاہ حبیب اللہ اور شاہ محبت اللہ بھی دکن آئے اور بادشاہ نے اپنی دو لڑکیاں شاہ حبیب اللہ اور شاہ نوراللہ سے بیاہ دیں۔''

(دکن میں اردو، نصیرالدین ہاشمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2012، ص 46)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظہیر دہلوی کا رشتہ ایران کے شاہ نعمت اللہ کے ساتھ ساتھ دکن کے بادشاہ احمد شاہ بہمنی کے خاندان سے بھی رہا ہے۔ اس بلند پایہ شخصیت نے اردو ادب میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے، اس سے اردو دنیا کا بیشتر حصہ بے خبر ہے۔ یہاں بس یہ کوشش کی جائے گی کہ ظہیر دہلوی کا بھرپور تعارف اردو قارئین کے سامنے پیش کیا جاسکے اور ان کی نثری و شعری خدمات کا احاطہ کیا جاسکے۔

ڈاکٹر مختار شمیم نے ظہیر دہلوی کا سنہ پیدائش 1835 قرار دیا ہے۔ ابھی ظہیر کی عمر محض 9 برس کی تھی۔ وہ اپنی والدہ کی شفقت سے محروم ہوگئے۔ ظہیر کو پتنگ بازی، کبوتر بازی سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھیں گھوڑے کی سواری کا بھی شوق تھا جس کی تربیت کے لیے ان کے والد نے ایک شخص کو مامور کیا تھا۔ ظہیر کے اتالیق کے طور پر شیخ صفدر علی کو مقرر کیا گیا جن سے انھوں نے قرآن مجید پڑھنا سیکھا۔ شیخ صفدر علی سے ہی گلستاں، بوستاں بہار دانش اور یوسف زلیخا کے اسباق پڑھے۔ دوسرے اساتذہ سے سہ نثر ظہور رسائل ملا طغرا، قصائد عرفی، وقائع نعمت خان عالی وغیرہ کا درس لیا۔ مشہور شاعر نظام الدین ممنون کے بھتیجے سے عربی فارسی کی دوسری کتابیں پڑھیں اور اس کے بعد سلسلۂ تعلیم منقطع ہوگیا لیکن مطالعے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس زمانے کی روایت اور رجحان کے مطابق فن خوشنویسی میں کمال حاصل کیا۔ تعلیمی سلسلہ ختم ہوتے ہی ظہیر نے ملازمت اختیار کرلی۔ اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی لیکن اس کم سنی میں ہی وہ شاہی ملازمت سے وابستہ ہوگئے۔ راقم الدولہ کا خطاب حاصل کیا، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ انعام میں مرصع دوات بھی پائی تھی۔ ظہیر اپنے والد کے ہمراہ قلعہ معلی جایا کرتے تھے۔ اسی زمانے

میں شعرگوئی کی ابتدا ہوئی۔ 14 برس کی عمر میں استاد ذوق کے شاگرد ہوئے اور غالب کے مشورۂ سخن سے بھی فیضیاب ہوئے۔ اس زمانے میں ظہیر کی شعری تخلیقات 1857 کے ہنگامے میں تلف ہوگئیں۔ فروری 1857 میں ظہیر کی شادی ہوئی۔ ظہیر کی اولادوں میں تین بیٹیوں اور ایک بیٹا سجاد مرزا کا ذکر کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ غدر کے پرآشوب حالات میں ظہیر کا مال و اسباب برباد ہوگیا۔ مجبوراً دلی کو خیرباد کہنا پڑا اور انھوں نے پانی پت (ہریانہ) کا رخ کیا، جہاں کچھ مدت تک گھوڑوں کی تجارت سے کچھ معاشی حالت بہتر ہوئی۔ یہاں بھی زیادہ دنوں تک چین کی زندگی نصیب نہ ہوسکی۔ پانی پت میں انگریزوں کے مخبرین دلی والوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان کے نام فوج میں لکھوانے پر مامور تھے۔ ظہیر کو جب اس بات کا علم ہوا تو مصطفیٰ آباد کی طرف چل پڑے۔ پھر وہاں سے فیروز آباد لکھنؤ ہوتے ہوئے بریلی پہنچے۔ یہاں بھی انھیں جان بچانے کے لالے پڑگئے۔ یہاں ان کی جان ڈرامائی طور پر بچ گئی کیونکہ فوج کے جرنل نے انھیں توپ سے باندھ دیا تھا۔ ابھی توپ میں بتی دکھانا باقی تھا داروغہ میر فتح علی خاں خواجہ تاش بچے گھوڑے سے وہاں پہنچ گئے اور ظہیر کو جس رسی سے توپ میں باندھ دیا گیا تھا، وہ رسی کاٹ دی گئی، اور اس طرح ظہیر کی جان بچ گئی۔ سیدہ جعفر نے یہ تمام تفصیلات تاریخ ادب اردو میں رقم کی ہیں۔ اس جاں گداز واقعے کے فوری بعد ظہیر بریلی سے سیدھا رامپور کے لیے روانہ ہوگئے۔ 'فریادِ داغ' صفحہ نمبر 6 پر تمکین کاظمی نے لکھا ہے کہ ''ظہیر 27 اپریل 1857 کو رامپور پہنچے تھے۔''

ظہیر رامپور میں چار برس رہے۔ اس دوران انگریزوں نے دلی کے باشندوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا۔ یہ خبر سن کر ظہیر اپنے وطن دہلی واپس ہوئے۔ ایک طرف والد کی موت اور دوسری جانب گھر کی نیلامی نے ظہیر کی ہمت پست کردی تھی۔ اس کے باوجود شعرگوئی اور نثری ادب پارے کی تخلیق جاری رہی۔ دہلی آنے کے بعد محکمۂ چونگی میں انھیں ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصے بعد بلند شہر (یوپی) سے شائع ہونے والے روزنامہ 'اخبار طورؔ' کے ایڈیٹر ہوگئے۔ 1862 میں 'نگارستانِ سخن' مرتب کیا، جس میں ذوق، غالب اور مومن کے کلام کو یکجا کرکے شائع کیا۔ جلوۂ طور میں ظہیر کے مضامین مہاراجہ دھان سنگھ والیِ الور نے پڑھا اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کی صلاحیت سے متاثر ہوکر والیِ الور نے انھیں الور بلا لیا۔ ظہیر الور میں چار برس تک مقیم رہے لیکن وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہوکر واپس دہلی آگئے۔ دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ انھیں عزیز رکھتے تھے۔ شیفتہ نے جے پور، راجستھان کے محکمۂ پولیس میں ان کے لیے سفارش کی جہاں انھیں ایک معقول جگہ مل گئی۔ جے پور میں کم و بیش 19 برس رہے۔ جب والیِ ریاست کا انتقال ہوا تو ظہیر کا بھی جے پور سے تعلق منقطع ہوگیا۔ کچھ ایام پریشانی میں بسر ہوئے تھے کہ نواب محمد علی خاں خلف نواب امیر خاں والیِ ٹونک (راجستھان) نے اپنے یہاں بلوالیا اور جب تک نواب امیر خاں حیات رہے، ظہیر عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ نواب کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے نواب ابراہیم علی خاں نے ان کا وظیفہ مقرر کیا۔ اس طرح کم و بیش 16 برس تک وہ ٹونک میں ہی رہے۔ اس وقت حیدرآباد علم و ادب کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت ملک کے نامور ادیب و شاعر مثلاً داغ دہلوی، شبلی نعمانی، نظم طباطبائی، ضیغم لکھنوی اور برتر وغیرہ حیدرآباد میں سکونت پذیر تھے۔ نظام دکن میر محبوب علی خان کی سرپرستی اور قدردانی نے ان ادبی شخصیات کی حوصلہ افزائی کی۔ نظام دکن کی ادیبوں کی قدردانی کی شہرت سن کر ظہیر دہلوی نے عمر کے آخری حصے میں حیدرآباد جانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ٹونک سے رخصت لے کر ظہیر حیدرآباد پہنچے تو داغ دہلوی نے ان کا بہت خیال رکھا۔ وہ ظہیر کا دل سے احترام کرتے تھے۔ سیدہ جعفر کے مطابق ''ظہیر حیدرآباد سے خوش نہیں تھے اور یہاں کی شعری محفلیں بھی انھیں پسند نہیں آئیں۔ حیدرآباد میں ظہیر کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی تھی اور وہ اس بے قدری سے نالاں تھے'' (تاریخ ادب اردو، صفحہ 128) حیدرآباد میں آٹھ ماہ کے قیام کے بعد بھی ظہیر کو دربار نظام میں باریابی کی نوبت نہیں آسکی۔ بیکاری کے زمانے میں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے ان کی بہت مدد کی۔ بالآخر حیدرآباد میں ہی 18 مارچ 1911 کو ان کا انتقال ہوگیا اور حیدرآباد میں ہی سپردِ خاک ہوگئے۔

ظہیر دہلوی بہادر شاہ ظفر کے دربار کے اہم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ذوق کی شاگردی کے باعث شعرگوئی میں انھیں کمال حاصل ہوا تھا، لیکن ان کی غزلوں پر مومن کے اثرات نمایاں ہیں۔ خود ظہیر نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی شاعری مومن کی شاعری کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ان کے بعض مقطعوں میں اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ وہ طرزِ مومن سے اچھی طرح آگاہ تھے اور جب تک وہ مومن کے طرز سے بے خبر رہے ان کی شاعری بے رنگ رہی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھا جب تک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

کیا نباہی طرزِ مومن اے ظہیر
طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

ظہیر نے اپنے استاد ذوق دہلوی کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ 'حسنِ بیان' جوان کی شعری تخلیقات میں پایا جاتا ہے، وہ ان کے استاد ذوق کے ہی مرہونِ منت ہے۔ یہ الگ بات کہ ظہیر کے کلام میں غالب، مومن اور مصحفی وغیرہ کی آوازوں کی گونج صاف سنائی دیتی ہے، لیکن انھوں نے اعتراف صرف مومن اور ذوق کا کیا ہے۔ ذوق کے متعلق جس والہانہ ارادت اور عقیدت کا تذکرہ ظہیر نے کیا ہے، اس کا اندازہ ان کے درج ذیل شعر سے لگایا جاسکتا ہے، جس میں انھوں نے استاد لفظ کا استعمال کیا ہے اور اس سے مراد ذوق دہلوی ہیں۔

ہے جو یہ حسنِ بیاں میرے سخن میں اے ظہیر
یہ مجھے فیضانِ صحبت ہے مرے استاد کا

ظہیر نے اپنی کتاب 'داستان غدر' میں غالب، ذوق اور مومن کے کلام سے استفادے کی بات کہی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اپنی طبیعت کے زور سے ان تینوں استادانِ وقت ذوق، مومن، غالب کے کلام کا لب لباب اخذ کرکے اپنی طرز جداگانہ اختیار کی۔ شیخ صاحب مرحوم کی تو زبان اور محاورات کی پیروی اختیار کی۔ مومن صاحب کے مضامین نازک خیالی و سوز و گداز کا اتباع کیا۔ مرزا غالب صاحب کی بندش و ترکیبات کی تقلید اختیار کی۔''

(داستان غدر، مطبع کریمی، لاہور، ص 312)

اگر ظہیر کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی شاعری ذوق، مومن، غالب کے علاوہ اس عہد کے دوسرے بڑے شعرا کی اتباع کا نتیجہ ہے۔ کلاسیکی روایات کی مکمل پاسداری ان کی شاعری میں ابھر کر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات بڑی حد تک پامال مضامین اور بوسیدہ فکر و خیال کے تانے بانے پر مشتمل ہیں۔ تخیل کی بوقلمونی کا فقدان پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ظہیر نے اپنی طرز الگ نکالی، جس سے ان کی شناخت قائم ہوئی۔ انھوں نے نازک و لطیف احساسات کو اپنی شاعری کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی اور یہ فن انھوں نے مومن سے سیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بعض اشعار ایسے مل جاتے ہیں، جو دلوں کو تازگی اور بشاشت کا احساس دلاتے ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں کے قریب لے جاتے ہیں اور حیات مستعار کی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے اس کا ادراک کراتے ہیں۔

کی اس سے بڑی سعادت مندی اور خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے اشعار ضرب المثل بن جائیں۔ ظہیر کے اشعار میں ایسی خوبیاں موجود ہیں کہ وہ ضرب المثل کی صفت سے متصف ہو سکیں۔ ظہیر کا ایک نہایت مشہور شعر جو ضرب المثل کے ساتھ ساتھ حقیقت حال کے بیان کے طور پر زبان زدِ خاص و عام بن چکا ہے، وہ شعر محبت کرنے والے کی کیفیت قلبی کا اظہار کرتا ہے۔ ظہیر کہتے ہیں۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

اس کے علاوہ بھی ظہیر کے متعدد اشعار ضرب المثل کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں، لیکن ادب نوازوں کا بیشتر طبقہ اس بات سے بے خبر ہے کہ یہ اشعار ظہیر دہلوی کے ہیں بلکہ اہل علم و فضل کی کثیر تعداد ایسی ہے جو ظہیر کے فکر و فن، شاعری اور ادبی خدمات سے ناواقف ہے۔ یہاں تک کہ یہ طبقہ ظہیر دہلوی کے نام سے بھی ناواقف ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ظہیر کے چند ایسے اشعار پیش کیے جائیں، جو ضرب المثل بن چکے ہیں، یا جن میں ضرب المثل کہلانے کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ حالانکہ ان اشعار میں وہی روایتی موضوع و خیال پایا جاتا ہے تاہم طرزِ اظہار کی انفرادیت کے باعث یہ اشعار اپنی اہمیت، معنویت اور جاذبیت رکھتے ہیں۔ ان اشعار کی خوبی یہ ہے کہ بالکل آسان اور رواں زبان کے پیکر میں ڈھلے ہوئے ہیں۔

وہ جھوٹا عشق ہے، جس میں فغاں ہو
وہ کچی آگ ہے جس میں دھواں ہو
تمہاری بے رخی، شکوے مبارک
قیامت تک نہ پوری داستاں ہو
تم تھے جہاں جہاں، وہاں دل بھی ضرور تھا
میں بدگمانیوں سے بہت دور دور تھا
فلک سے موت گر مانگوں، تو عمرِ خضر ملتی ہے
یہ کج رفتار جب چلتا ہے، الٹی چال چلتا ہے
خیر سے رہتا ہے روشن نامِ نیک
حشر تک جلتا ہے نیکی کا چراغ
کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو دل تمھیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

ظہیر کی شاعری میں محاورات کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ وہ اپنے استاد کی زمینوں میں بھی شعر کہہ کے اپنی استادی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں روزمرہ کی برجستگی اور الفاظ کی خوبصورت بندش کے شواہد ملتے ہیں۔ زبان کی سادگی اور صفائی کا خیال ان کی تخلیقات میں پایا جاتا ہے۔ انداز میں شگفتگی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلیں حسن و عشق کی واردات کا نمونہ ہیں۔ ان غزلوں میں زندگی کی گوناگوں جہات کی عکاسی نہیں پائی جاتی ہے۔ اس معاملے میں وہ بھی کلاسیکی شعرا کی طرح روایت پسند واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے اکثر مقامات پر غالب کی مخصوص لفظیات سے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے مصحفی اور حسرت موہانی کی طرح ایک سے زائد رنگوں پر مشتمل اپنی شاعری کے تانے بانے بُنے ہیں۔ ظہیر نے مومن کی تراکیب لفظی اور مضامین سے نہایت عمدگی سے استفادہ کیا ہے۔ چونکہ مومن کے کلام میں ایسی کشش، معنویت اور اثر پذیری تھی کہ اس سے اثر قبول کیے بغیر اس عہد کا کوئی شاعر نہ رہ سکا اور ظہیر بھی اس معاملے میں کسی دوسرے شاعر سے پیچھے نہیں رہے۔ مومن کے حسن و عشق کے موضوعات کے دائرے کو وسیع کرنے کا کام کیا اور ساتھ اس میں ایک نئی تازگی اور نئی تابندگی بخشنے کی کوشش کی۔ مومن کی پیروی کس حد تک ظہیر کے کلام میں پائی جاتی ہے، اس کے حوالے سے احتشام حسین لکھتے ہیں:

''مومن ہی کے مانند وہ بھی محبت کے احساسات و تجربات کو بڑی خوبصورتی اور نزاکت سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی زبان فارسی آمیز ہوتے ہوئے بھی سہل ہے۔'' (اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 1992، ص 159)

ظہیر کی خاصیت یہ بتائی گئی ہے کہ انھوں نے فارسی آمیز زبان کا استعمال ضرور کیا ہے، لیکن اس میں ثقالت اور بوجھل پن کا عنصر نہیں پایا جاتا ہے۔ آسانی سے سمجھ میں آجانے والے الفاظ سے آراستہ ان کی شعری تخلیقات میں صنائع لفظی اور معنوی کا خوبصورت استعمال ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں تشبیہات و استعارات کو بڑی ہنرمندی سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً محاوروں کے استعمال پر انھیں زبردست قدرت حاصل تھی۔ درج ذیل پانچ اشعار پر مشتمل ان کی ایک غزل محاوروں کے خوبصورت استعمال کی بہترین مثال ہے۔

سودائے محبت میں جو، سَر جائے تو اچھا
یہ بوجھ مرے سر سے، اتر جائے تو اچھا
آخر تو ڈبویا ہے، مجھے دیدۂ تر نے
پانی یہ اگر سر سے، گزر جائے تو اچھا
آتا ہے تو آچک، کہیں اور وعدہ فراموش
یا آتے ہی آتے، کوئی مَر جائے تو اچھا
دشمن کو بھی یارب، نہ ہو سودائے محبت
اس درد سے پہلے ہی، جو مرجائے تو اچھا
رونا ہے تو دل کھول کے، رولو نہ ظہیر آج
دامن گہر اشک سے، بھر جائے تو اچھا

ظہیر دہلوی کے ان پانچ اشعار میں چار محاوروں کا استعمال ہوا ہے۔ اس غزل کے پہلے شعر کے مصرع اولی میں 'سر جانا' محاورے کا استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ختم ہوجانا، پورا ہوجانا، تمام ہوجانا ہوتے ہیں۔ اسی شعر کے مصرع ثانی میں 'بوجھ سر سے اترنا' محاورہ استعمال ہوا ہے، جو احسان اتارنا، بار کا سر سے اتارنا کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ دوسرے شعر میں 'پانی سر سے گزرنا' محاورہ مستعمل ہوا ہے جس کا مفہوم سخت آفت، نازل ہونا کسی بات کی انتہا ہوجانا، معاملہ کا طول پکڑنا ہوتا ہے۔ اسی طرح پانچویں شعر کے دوسرے مصرع میں 'دامن بھرنا' محاورے کا استعمال کیا گیا ہے جو جھولی بھرنا، مراد حاصل کرنا کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ یہاں بطور مثال چند اشعار نقل کیے گئے جن میں ظہیر نے بڑی خوبصورتی سے محاوروں کا استعمال کرکے اپنی فنی ہنرمندی دکھائی ہے جس سے اشعار کی معنویت دوبالا ہوگئی ہے۔ چونکہ ظہیر کے عہد میں محاوروں کا شاعری میں استعمال مستحسن قرار دیا جاتا تھا اور شعری روایت کی پابندی کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے بیشتر اساتذۂ فن اپنے کلام میں محاوروں کا استعمال کیا کرتے تھے، جو ان کی استادی کا مظہر سمجھا جاتا تھا، ایسے سیکڑوں اشعار ظہیر کی تخلیقات میں ملتے ہیں، جن میں انھوں نے محاوروں کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اور اپنی استادی دکھائی ہے۔

ظہیر کا عہد فارسی کے زوال اور اردو زبان و ادب کے فروغ کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس عہد کے شعرا کے سامنے فارسی زبان و ادب کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا، جس سے تمام شعرا و ادبا نے استفادہ کیا۔ فارسی شاعری سے ماخوذ موضوعات و مضامین راست اردو میں منتقل ہوئے۔ فارسی کی متعدد اصناف اردو میں متعارف کرائی گئیں۔ اردو غزل تو خالص فارسی غزل کی پیروی معلوم ہوتی ہے۔ ظہیر دہلوی بھی فارسی کی روایت شاعری سے کافی قریب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی بہت سی غزلیں حافظ، سعدی، رومی اور دیگر فارسی شعرا کی غزلوں کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔ متعدد اشعار پر فارسی شاعر حافظ کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ حافظ کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے اور ظہیر نے جس انداز سے ان دو اشعار کے مضامین اپنے اشعار میں باندھے ہیں، اسے ملاحظہ کیجیے۔ حافظ کا ایک مشہور شعر ہے جو انسانوں کی عظمت اور اس کے تحمل کی قوت پر دلالت کرتا ہے۔

آسماں بار امانت نتواست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

ظہیر دہلوی اس شعر کے مفہوم کو اپنے ایک شعر میں کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔

کس کو ظہیر بارِ امانت کی تاب تھی
یہ بوجھ تو ہمیں کو اٹھانا ضرور تھا

حافظ کی عاشقانہ غزلیں بہت مشہور ہیں۔ ان کی ایک غزل محبوب کی ادائے خاص کی ترجمانی کرتی ہے، اس غزل کا ایک شعر معشوق کی اس ادا کے متعلق ہے جس میں وہ بڑی بات کہتا ہے لیکن عاشق کو اس کی بری بات پر خوشی محسوس ہوتی ہے اور وہ محبوب کو دعاؤں سے نوازتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تم نے جو کچھ کہا وہ اچھا کہا کیونکہ تلخ جواب ان کے سرخ ہونٹوں سے نہایت خوبصورت اور زیبا معلوم ہوتے ہیں۔ حافظ کہتے ہیں۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد، لب لعل شکر خارا

ظہیر نے اس شعر کا جو چربہ اتارا ہے، وہ بھی ان کی استادی کی دلیل ہے۔ حافظ کے اس شعر کے معانی و مفاہیم کو ظہیر نے اپنے منفرد انداز میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ یوں پیش کیا ہے۔

تلخ شکوے لب شیریں سے مزہ دیتے ہیں
گھول کر شہد میں وہ زہر پلا دیتے ہیں

جس غزل کا یہ مطلع ہے، اسی غزل کا وہ مشہور شعر جس میں محبت میں جنوں کے آثار کی بات کی گئی ہے اور جو ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس غزل کے تمام اشعار بھی نقل کر دیے جائیں۔ سہل ممتنع کے پیرائے میں کہی گئی ظہیر کی اس غزل کی موسیقیت اور نغمگی ملاحظہ کیجیے۔

تلخ شکوے لب شیریں سے مزہ دیتے ہیں
گھول کر شہد میں وہ زہر پلا دیتے ہیں
کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں
پردہ اٹھے کہ نہ اٹھے، گر اے پردہ نشیں
آج ہم رسم تکلف کو اٹھا دیتے ہیں
آتے جاتے نہیں کمبخت، پیامی اُن تک
جھوٹے سچے یوں ہی، پیغام سنا دیتے ہیں
وائے تقدیر کہ وہ، خط مجھے لکھ لکھ کے ظہیر
میری تقدیر کے، لکھے کو مٹا دیتے ہیں

ظہیر کا کمال یہ ہے کہ وہ لفظوں کے انتخاب اور ان کے برمحل استعمال پر قدرت رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی شاعری روایتی ضرور ہے، لیکن وہ حالات زمانہ پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ زمانے کی چال سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھیں اسلاف کی روایت کی پاسداری کا لحاظ تھا۔ محمود الٰہی ظہیر کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ظہیر دہلوی ہمارے شاعروں کے اس آخری گروہ کی نمائندگی کرتے ہیں جو اسلاف کی روایات کا احترام کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا اور جو شعر کے محاسن و معائب میں تمیز کرنے کا سلیقہ جانتا تھا۔ ظہیر دہلوی کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاعری کی زبان کو بول چال کی زبان کا آئینہ سمجھتے تھے۔ وہ اگر ایک طرف خیال کی اہمیت کے قائل تھے تو دوسری طرف الفاظ کے انتخاب اور ان کے برمحل استعمال کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ ہر چند ان کا شمار روایتی شاعروں میں ہوتا ہے اور دہلی کے دبستان شاعری کے آخری ستون کی حیثیت سے انھیں یاد کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے گرد و پیش پر ان کی نظر تھی اور بدلتے ہوئے زمانے کا عرفان انھیں حاصل تھا۔ یوں تو وہ سلسلۂ ذوق سے متعلق تھے لیکن دوسرے اساتذۂ وقت کی روایات کا بھی وہ احترام کرتے تھے۔ مومن کا ذکر انھوں نے بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے۔''

(پیش لفظ، انتخاب کلام ذوق، مرتب: محمد ضیاء الدین انصاری، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1989، ص 4)

ظہیر دورِ مغلیہ کے آخری عہد کے نامور شاعر تھے۔ اپنے زمانے میں زبان اور شاعری دونوں کے استاد تصور کیے جاتے تھے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ قصائد، رباعیات، مخمس اور قطعات بھی لکھے ہیں لیکن ان کے اصل جوہر ان کی غزلوں میں کھل کر سامنے آئے ہیں۔ ان کی غزلیں روایتی مخصوص موضوعات کے ارد گرد گھومتی ہیں، جو عشق و محبت، شراب و میخانہ، رند بلا نوش، ساقی و پیمانہ، زاہد ریاکار، دلبر و دل ربا، درد جدائی، محبوب کی بے رخی، شکوے، گلے، ستمگر، واعظ، شیخ و برہمن، خودداری اور تصوف و معرفت جیسے مضامین پر مشتمل ہیں۔ مذکورہ موضوعات پر مشتمل ظہیر کے چند اشعار پر نظر ڈالتے ہیں۔

شرکت گناہ میں بھی رہ کچھ ثواب کی
توبہ کے ساتھ توڑیے بوتل شراب کی
سمجھیں گے نہ اغیار کو اغیار کہاں تک
کب تک وہ محبت کو محبت نہ کہیں گے
درد اور درد بھی جدائی کا
ایسے بیمار کی دعا کب تک
سر پہ احسان رہا بے سروسامانی کا
خارِ صحرا سے نہ الجھا کبھی دامن اپنا
غضب رحمت سے دل توڑا ہے واعظ غم گساروں کا
ستمگر صبر تیری جان پہ امیدواروں کا
خاک میں وہ مری ہستی کو ملا دیتے ہیں
جیتے جی دل کی کدورت میں دبا دیتے ہیں
عفو گناہ کب تری رحمت سے دور ہے
زاہد قصوروار ہے گو بے قصور تھا
ہر چشم حیرتی میں وہی جلوہ نور تھا
ہر دل کے آئینے میں اسی کا ظہور تھا

ظہیر کو شعر کہنے کا ہنر آتا تھا۔ الفاظ کے برجستہ استعمال پر انھیں مہارت حاصل تھی۔ مذکورہ اشعار اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ روایتِ شعری کی پاسداری میں اپنے عہد کے دوسرے شعرا سے کسی بھی حد تک پیچھے نہیں تھے۔ وہ اپنے عہد کے شعری رجحان سے اچھی طرح واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں تمام طرح کے اشعار مل جائیں گے، جو اس عہد کے موضوعات پر پورے اترتے ہیں۔ سیدہ جعفر، ظہیر کے شعری اوصاف کے متعلق رقمطراز ہیں:

''ظہیر اپنے عہد کے معیارِ شعر سے آگاہ تھے اور انھیں اس کا اندازہ تھا کہ شعر میں الفاظ کی نشست، محاورے کے برجستہ استعمال، روزمرہ کے جادو اور تخیل کی گل کاری کی کیا قدر و قیمت ہوتی ہے۔ ظہیر ذوق، غالب اور مومن جیسے بلند پایہ شعرا کی شعری صحبتوں سے مستفید ہوئے تھے۔ ان کے کلام میں کلاسیکی روایات کا پرتو نظر آتا ہے اور زبان و بیان پر دسترس کے اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، حیدر آباد، 2002، ص 129)

ظہیر نے تین دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کا پہلا دیوان 'گلستان سخن' کے عنوان سے 1899 میں ٹونک سے شائع ہوا۔ دوسرا دیوان 'سنبلستان سخن' اور تیسرا دیوان 'دفتر خیال' کے زیر عنوان حیدر آباد میں مرتب ہوا۔ دیوان ظہیر جلد اول مطبع مفید عام آگرہ کے زیر اہتمام 1899 میں شائع ہوا۔ ظہیر کو شہرت ان کی نثری تصنیف 'داستان غدر' کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ اس کتاب کا عنوان 'داستان غدر یا طراز ظہیر' ٹائٹل پر لکھا ہے۔ یہ کتاب دراصل غدر کے چشم دید حالات اور خود مصنف کی سوانح عمری پر مشتمل ہے۔ مطبع کریمی لاہور سے پہلی بار اس کتاب کی اشاعت عمل میں آئی۔ داستان غدر 1857 کے ہنگامے کی ایک قابل قدر اور مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ ظہیر اس وقت داروغۂ ماہی مراتب کے عہدے پر فائز تھے اور یہ ان کی ملازمت کے ابتدائی ایام تھے۔ وہ کم سن تھے اس لیے انھیں دہلی کے قلعۂ معلی میں داخلے کی اجازت حاصل تھی۔ اندرونی اور بیرونی حالات و واقعات کا انھوں نے بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ غدر کے دوران جو اتھل پتھل اور سیاسی افراتفری اور گرم بازاری کا جو ماحول

پیدا ہوا تھا، اسے انھوں نے بہت نزدیک سے دیکھا تھا۔ ان تمام حالات کو بڑی سچائی سے انھوں نے 'داستانِ غدر' میں پیش کیا ہے۔ مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ کتاب معتبر اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

'داستانِ غدر' کا دو تہائی حصہ غدر کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے اور ایک تہائی حصہ ظہیر کی زندگی، دربار میں ملازمت اور مختلف ریاستوں میں ان کے قیام اور جدوجہد سے بھری ہوئی زندگی پر مشتمل ہے۔ اس کا ذکر انھوں نے کتاب کے پیش لفظ میں واضح طور پر کر دیا ہے کہ انھوں نے اپنے تجرباتِ زندگی کو آسان زبان میں بیان کر دیا ہے، کسی طرح کی انشا پردازی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے، کیونکہ عام قاری کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی تمہیدی جملوں میں بالکل صاف کہہ دیا ہے کہ اس کتاب میں چشم دید واقعات بلاکم و کاست تحریر کیے گئے ہیں، جس میں کسی طرح کی مبالغہ آرائی نہیں کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے 1857 کے غدر کے تعلق سے مستند کتاب قرار دیا جاتا ہے۔

معروف مورخ اور مصنفہ رعنا صفوی نے داستان غدر کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کا عنوان 'The tale of the Mutiny' رکھا ہے۔ یہ کتاب پینگوئن رنڈم ہاؤس انڈیا، گڑگاؤں (ہریانہ) کے زیر اہتمام 2017 میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی، جس کی کافی پذیرائی ہوئی ہے۔

ظہیر دہلوی اعلیٰ پائے کے شاعر تو تھے ہی، لیکن ان کے نثری سرمائے میں 'داستانِ غدر' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ 'داستان غدر' ان کی خودنوشت سوانح ہے، جو خودنوشت سوانح کے اصول، فن اور طرزِ نگارش کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ ظہیر نے اپنی آپ بیتی پوری صداقت کے ساتھ بیان کر دی ہے اور اگر یہ آپ بیتی منظر عام پر نہ آتی تو اس دور کی معاشرت، تہذیبی سیاسی اور ادبی روایتوں سے ہم کما حقہ واقف نہ ہو پاتے۔ انھیں جن تجربات سے گزرنا پڑا اور جن چشم دید واقعات کو انھوں نے ایمانداری سے بیان کیا ہے، اس سے ان کی فکری بصیرت اور دور اندیشی کا علم ہوتا ہے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ غدر کے واقعات کی سچائی لوگوں کے سامنے آئے تاکہ میری وفات کے بعد بھی لوگ کم از کم اس صداقت بیانی کے باعث یاد رکھیں اور غدر کے حالات سے بخوبی واقفیت حاصل کر سکیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ داستان غدر کا اولین نسخہ مطبع کریمی لاہور سے نبیرۂ آزاد محمد طاہر نے شائع کیا تھا۔ آغا محمد طاہر کو 'داستان غدر' کا خطی نسخہ ظہیر کے نواسے میر اشتیاق حسین شوق سے حاصل ہوا تھا۔ 'داستان غدر' کی اولین اشاعت کے وقت نبیرۂ آزاد آغا محمد طاہر نے اس کتاب کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

'داستان غدر' کا دو تہائی حصہ غدر کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے اور ایک تہائی حصہ ظہیر کی زندگی، دربار میں ملازمت اور مختلف ریاستوں میں ان کے قیام اور جدوجہد سے بھری ہوئی زندگی پر مشتمل ہے۔

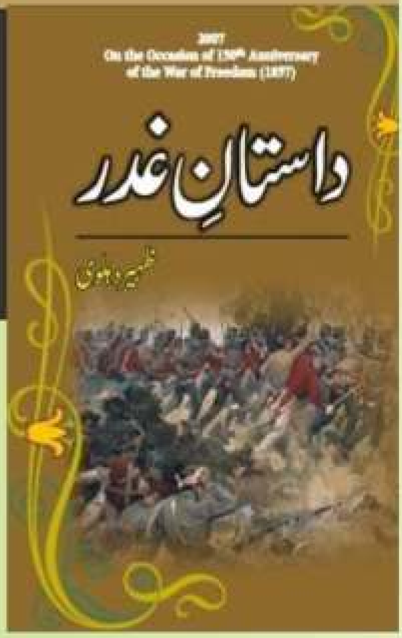

''یہ حضرت ظہیر کی سوانح عمری نہیں بلکہ داستان غدر ہے۔ حضرت جیسا ذی مرتبت انسان اس انقلاب کی جن منزلوں سے گزرا ہے اس کا صحیح فوٹو اور غدر کے مفصل حالات اس سے بہتر نہیں مل سکتے۔ اس میں تاریخ بھی ہے، غم و الم کی داستان بھی۔ ساتھ نثر اردو کی ابتدائی حالت اور اس زمانے کا طرز گفتگو کا طریقہ اور تحیر۔ غرض بہت کچھ اس مختصر کتاب میں جمع ہے۔ حضرت ظہیر مرحوم کے حالات اس کتاب میں مفصل درج ہیں۔ فقط اتنا باقی ہے کہ یہ ظہیر بلکہ ثانی ظہیر (ظہیر فاریابی، فارسی کے نامور شاعر) تمام عمر میں بہت حیران و پریشان رہا مگر آخر کے چند لمحے سلطانِ دکن کی یادگار پر اچھے گزر گئے اور آخر 1910 میں وہیں داعی اجل کو لبیک کہا اور مرقد نعمت خاں عالی میں آرام کیا۔'' (داستان غدر، طبع اول، مطبع کریمی لاہور)

ظہیر دہلوی نے دہلی کے حالات کی ابتری، افراتفری اتھل پتھل، کشت و خون اور ہنگامہ خیزی کی جو سچی تصویریں داستان غدر میں پیش کی ہیں، اور جس انداز میں پیش کی ہیں، اس سے اس عہد کا حقیقی معاشرتی سیاسی اور ثقافتی منظر نامہ سامنے آ جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہاں پیش ہے، جس سے قارئین کو ظہیر کی خودنوشت سوانح کے طرزِ نگارش اور اس کے اسلوب کا اندازہ ہو جائے۔ ظہیر ایک جگہ نجف گڑھ کی لڑائی اور اس کے بعد دہلی میں پھیلی افراتفری کے احوال کچھ اس انداز میں تحریر کرتے ہیں:

''نجف گڑھ کی لڑائی کے بعد پوربیوں کی ہمت شکست ہونی شروع ہوگئی اور وہ جوش و خروش کم ہو گیا۔ اسی اثنا میں ایک ستم اور ہوا کہ چوڑی والے کے محلے شمرو بیگم کی حویلی میں میگزین تھا اور وہاں بارود تیار ہوتی تھی۔ ایک دن تیسرے پہر کا وقت ہے۔ دن کے تین بجے ہوں گے کہ یکا یک ایک دھماکے کی آواز کان میں آئی مگر دھماکا ایسا ہوا جیسے سو توپ کے برابر اس کی صدا تھی۔ میں اپنے مکان کے دو منزلے پر چڑھا اور چہار طرف نگاہ کی تو اپنے مکان کے جنوب کی جانب دیکھتا کیا ہوں کہ ایک تتق گرد و غبار اور دھوئیں کا آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ معلوم ہوا میگزین اڑ گیا۔ ادھر تو میگزین اڑا اُدھر پوربیے حکیم جی (حکیم احسن اللہ) کے گھر پر چڑھ گئے کہ حکیم جی انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں۔ انھوں نے میگزین اڑا دیا ہے اور جا کر سب اثاث البیت (گھر کا سامان) لوٹ لیا۔ حکیم جی گھر پر نہ تھے، ورنہ وہ خود جان سے مارے جاتے... اس دن شہر کی زمین اور مکانات اور سب دیوار و در لرز رہے تھے۔ غرضیکہ یہ کیفیت صبح کے پانچ بجے سے شروع ہوئی تھی اور دس بجے تک یہ قیامت برپا رہی۔ آٹھ بجے دن کے میں پانچ چھ آدمی لے کر قلعہ کو جانے لگا تو دیکھا کہ کوچہ بندی کے پھاٹک سب بند ہیں۔ دروازوں کو قفل لگے ہوئے ہیں مگر کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اس وقت ایک تماشا اور نظر آیا۔ جب میں کھڑکی کے پاس پہنچا ہوں تو سامنے کوتوالی کے آگے سے ایک بندوقوں کی باڑھ مجھ پر پڑی۔ میں نے سامنے دیکھا تو انگریزی فوج کا ایک بزن کوتوالی کے آگے موجود کھڑا تھا۔ میں بھاگ کر گھر پہنچا مگر میں نے ابھی گھر میں والدہ سے یہ خبر بیان نہیں کی گھر والے مضطرب ہوں گے بیٹھا ہوا اللہ اللہ کر رہا ہوں۔''

(داستان غدر، مشمولہ نقوش آپ بیتی نمبر، لاہور جون، 1964، ص 511)

■

Dr. Sabir Ali Siwani
H. No.: 9-4-87/C/12, 1st Floor
Behind Moghal Residency
Tollchowki, Hyderabad- 500008 (Telangana)
Cell.:9989796088

محمد نوشاد احمد

خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری

ایک نئی قرأت کی کوشش

> آتش نے دبستان لکھنؤ کے شعرا کو زبان کی باریکیوں اور اصل خوبیوں کی طرف متوجہ کیا، سوقیانہ موضوعات اور بے جا لسانی چھیڑ چھاڑ سے آگاہ کیا. اس سلسلے میں ناسخ کا نام بھی آتا ہے اور ناسخ سے ان کا موازنہ بھی کیا جاتا ہے لیکن آتش ہر معاملے میں ناسخ سے بڑھ کر تھے. انھوں نے نہ صرف اصلاح زبان کی بات کی بلکہ لکھنؤ کی لسانی خصوصیات کو بھی اجاگر کیا. یعنی ایک طرف جہاں وہ زبان کے حسن کے دلدادہ تھے وہیں وہ زبان کی سلاست اور فطری پن کے بھی خواہاں تھے.

آتش دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا امتیاز و انفراد یہ ہے کہ انھوں نے اپنے معاصر شعرا سے علاحدہ راہ اختیار کی۔ وہ اپنے گھریلو پس منظر اور اپنے صوفیانہ مزاج کے سبب دنیا کو محض عارضی مسکن تصور کرتے تھے اور اپنے اشعار میں اکثر بے ثباتی دنیا کا ذکر کرتے تھے۔ ان کی شخصیت اور مخصوص مزاج نے انھیں لکھنؤ کے رنگ و روغن بھرے ماحول میں شرافت، انکسار، صبر و تحمل اور اخلاق و مروت کو اپنی شاعری کا موضوع بنانے پر ہمہ دم آمادہ رکھا۔

آتش کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے دبستان لکھنؤ کے شعرا کو زبان کی باریکیوں اور اصل خوبیوں کی طرف متوجہ کیا، سوقیانہ موضوعات اور بے جا لسانی چھیڑ چھاڑ سے آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں ناسخ کا نام بھی آتا ہے اور ناسخ سے ان کا موازنہ بھی کیا جاتا ہے لیکن آتش ہر معاملے میں ناسخ سے بڑھ کر تھے۔ انھوں نے نہ صرف اصلاح زبان کی بات کی بلکہ لکھنؤ کی لسانی خصوصیات کو بھی اجاگر کیا۔ یعنی ایک طرف جہاں وہ زبان کے حسن کے دلدادہ تھے وہیں وہ زبان کی سلاست اور فطری پن کے بھی خواہاں تھے۔

آتش کے یہاں جیسا کہ درج بالا سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ متصوفانہ موضوعات پر بہت ہی آزادانہ اور والہانہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہاں چند اشعار ملاحظہ کریں جو کہ نہ صرف ان کے ہم عصر شعرا کی ڈگر سے ہٹ کر ہیں بلکہ یہ متصوفانہ شاعری کی عمدہ مثال بھی ہیں:

تنہائی ہے، غریبی ہے، صحرا ہے، خار ہے
کون آشنائے حال ہے کس کو پکاریے

عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے
ہوائے گل سے ہم کس وادی پر خار میں آئے

ظہور آدم خاکی سے یہ ہم کو یقین آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشین آیا

نقش صورت کا مٹا کر آشنا معنی کا ہو
قطرہ بھی دریا ہے جو دریا سے واصل ہو گیا

جس طرف دیکھیے آتا ہے نظر وہ محبوب
جلوۂ یار سے ہے عالم امکاں آباد

ان اشعار کی پہلی قرأت ہی سے آتش کی فکر کے محور اور ان کے منہج کی بابت واقفیت ہو جاتی ہے۔ آتش جس ماحول میں متصوفانہ اشعار کہہ رہے تھے، وہ ان کے مزاج سے بالکل برعکس تھا۔ وہاں عشق و عاشقی اور غم و ساغر کے قصے زیادہ تھے۔ حالانکہ آتش کے یہاں بھی رندی، سرمستی اور رنگینی کی جھلکیاں جابجا ملتی ہیں مگر بالآخر وہ صوفیانہ رنگ میں ہی رنگ جاتے ہیں۔ ان کے یہاں تصوف کی آمیزش کے سبب ہر مقام پر بردباری، متانت اور گہرائی کا احساس شدت سے ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض سخن شناس انھیں اردو کا حافظ کہنے سے بھی نہیں گریز کرتے۔ ان کے یہاں جو اشعار میں کیف و سرمستی اور جذب کی کیفیت پائی جاتی ہے، وہ واقعی انھیں حافظ کے قریب لا کھڑا کرتی ہے

> آتش نے تلخی حالات کو اپنے اشعار میں پیش کرتے وقت اپنے عہد کے خلفشار، انتشار اور محرومی و محزونی کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان اشعار کو پڑھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے دوسرے شعرا کے مقابلے میں کس قدر حساس اور بیدار ذہن شاعر تھے۔

آتش کے یہاں دوسری بڑی خوبی ان کے کلام کی سلاست، برجستگی اور شفافیت ہے۔ وہ بہت ہی سہل اور عام فہم زبان میں معنویت سے معمور شعر کہنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور یہ وصف انھیں بہت آسانی کے ساتھ ان کے معاصر لکھنوی شعرا سے منفرد کرتا ہے۔ وہ دبستان لکھنؤ میں رائج تصنع، رعایت لفظی، معاملہ بندی اور صنائع بدائع کے غیر ضروری اور بے محل استعمال سے قصداً بچتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید ان کی زندگی کی سادگی اور فطری پن ہے، اگر ان کے دونوں دیوانوں سے غزلوں کے اشعار کو الگ کر کے ان کا غائر مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ وہ نہ صرف اپنے اسلوب و ادا میں موثر، پرکشش اور سلیس ہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں شدت عشق کی کیفیت اپنے شباب پر ہے، لیکن یہ کیفیت ہمیں براہ راست عشق حقیقی کی طرف ہی لے جاتی ہے۔

آتش کے یہاں متصوفانہ اشعار کی کثرت ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ دوسرے موضوعات سے بیگانہ ہیں۔ ان کے یہاں انسان اور انسانیت کے احترام کو ترجیحی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اپنے معاشرے کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ عداوت و بغض انسان کو نہ صرف حیوان بنا دیتے ہیں بلکہ اسے اس لائق بھی نہیں چھوڑتے کہ وہ انسانوں کی صحبت میں کچھ دیر بیٹھ سکے۔ آتش کے مطابق ایسے لوگوں سے کھلے دشمن ہی بہتر ہیں جو اعلانیہ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ آتش دل کو خدا کا گھر تصور کرتے ہیں اور اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بت خانہ اور خانۂ خدا اگر ٹوٹ جائیں تو پھر تعمیر ہو سکتے ہیں، مگر دل ٹوٹنے کے بعد کبھی نہیں جڑتا۔ وہ ایک مقام پر کہتے ہیں کہ حالت نزع میں اب بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی کیونکہ ہمارا محبوب ہماری عیادت کے بعد روتا ہوا غم گسار واپس گیا۔ اسی طرح ایک شعر میں بہت ہی اچھوتے انداز میں اس کیفیت کا اظہار کرتے ہیں کہ میں شہادت کے شوق میں اس قدر محو تھا کہ جسم پر کہاں کہاں زخم لگے، اس کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اب اشعار ملاحظہ کریں۔

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

بت خانہ توڑ ڈالیے مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے

حالت نزع ہے صورت کوئی بچنے کی نہیں
اٹھ گیا رو کے جو آیا ترے بیمار کے پاس

ان اشعار کو پڑھنے سے صاف طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آتش کے یہاں موضوعات میں تنوع بھی ہے اور شعر گوئی کا پختہ مذاق بھی ہے۔ آتش تلخی زمانہ کو بیان کرتے ہوئے بھی شعری محاسن سے دور نہیں ہوتے۔ کہیں کہیں وہ اپنے تخلص کی رعایت سے گرمی کلام کے بھی عمدہ نمونے پیش کرتے ہیں۔ بقول آل احمد سرور:

''ان کے یہاں جذبہ بھی ہے، گرمی بھی ہے اور گدازی بھی''

آتش نے تلخی حالات کو اپنے اشعار میں پیش کرتے وقت اپنے عہد کے خلفشار، انتشار اور محرومی و محزونی کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان اشعار کو پڑھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے دوسرے شعرا کے مقابلے میں کس قدر حساس اور بیدار ذہن شاعر تھے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بخت بند نے مجھے ہر چند مٹایا آتش
رہ گیا نام مرا گنبد گرداں کے تلے

مشتاق درد عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

آتش کے یہاں جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ تصوف کے ساتھ تلخی زمانہ اور دوسرے موضوعات بھی کثرت سے اشعار کے پیکر میں ڈھلے ہیں۔ اپنے عہد میں جو کچھ دیکھ رہے تھے، اسے اپنے انداز میں پیش کر رہے تھے۔ وہ ناموافق اور دگرگوں حالات سے نالاں بھی تھے اور بدحظ بھی۔ لیکن آتش مایوسی اور ناامیدی کے شکار نہیں تھے۔ ان کے یہاں اشعار میں رجائی پہلو صاف طور پر نمایاں ہے۔ آتش کے دونوں دیوان دیکھ لیں، ان کے کلام کا بیشتر حصہ زندگی سے بھرپور اور آس و امید سے پُر نظر آئے گا۔ ان کے یہاں جہاں تلخی حالات کے سبب محرومی کا عنصر ہے تو اسی کے ساتھ فرط و انبساط کی کیفیت بھی اکثر و بیشتر محسوس کی جاتی ہے۔ آتش کی شاعری ہمیں مایوس اور اداس نہیں کرتی، بلکہ وہ ہمیں زندگی کے ناموافق اور سنگین حالات سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے مہمیز کرتی ہے۔ ان کی آنکھیں زندگی کے حزنیہ اور تاریک گوشے کو نہیں دیکھتیں، وہ تو زندگی کے روشن اور امید و بیم سے بھرے اس گوشے کو دیکھتی ہیں، جس کو ہر بشر دیکھنا چاہتا ہے۔ آتش کے یہاں اکثر مقام پر ایک آزادانہ اور قلندرانہ شان و شوکت نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں عزم اور حوصلے سے بھرپور ایک توانا آواز ہے جس کی گونج ان کے اشعار میں صاف سنائی دیتی ہے۔ اشعار دیکھیں۔

تھکے جو پاؤں تو چل سر کے بل، نہ ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

دل بیتاب کو فریاد و فغاں کرنے دو
پہلے غماز ہی کو قصہ بیاں کرنے دو

آتش کا یہ لب و لہجہ اور یہ مخصوص انداز انھیں اپنے عہد میں نہ صرف ممتاز اور منفرد کرتا ہے بلکہ یہ اسلوب سخن یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ تشبیہات اور استعارات کے غیر فطری اور بے محل استعمال سے بہتر ہے کہ براہ راست تغزل کا رنگ پیدا کیا جائے تاکہ غزلوں کو ایک نئے ماحول اور نئے مزاج سے آشنائی کا موقع میسر آئے۔ آج جس شے کو ہم جدت کہتے ہیں، وہ شے آتش کے یہاں پہلے ہی وافر مقدار میں موجود تھی، اور یہی جدت انھیں انفرادی

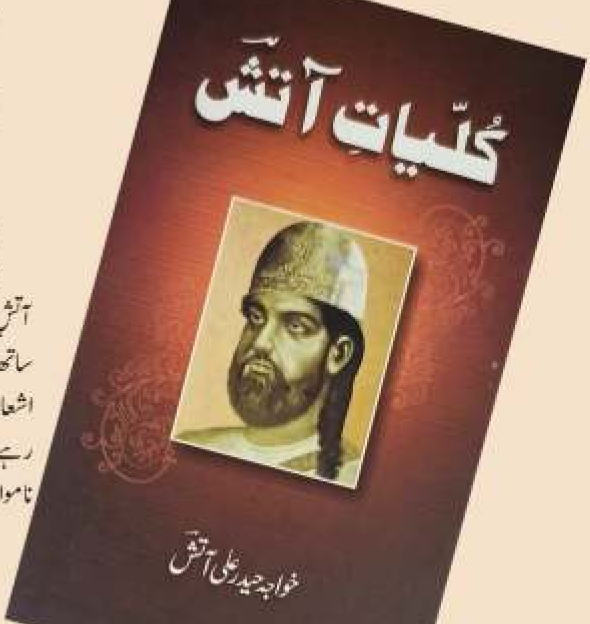

شان عطا کرتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل کے طور پر ذیل کے اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں:

زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے
پیامبر نہ میسر ہو تو خوب ہوا

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

آتش کے عہد کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی نے ایسے شعرا کا ذکر کیا ہے جنھوں نے نہ صرف دبستان لکھنؤ کو پائیداری بخشنے کا کام کیا بلکہ بزم عشرت کے قہقہوں کے ساتھ مصائب و مشکلات کو بھی اپنے اشعار کے توسط سے آئینہ کیا۔ ان شعرا میں آتش پیش پیش رہے۔ ملاحظہ کریں یہ اقتباس:

''......آرزو، میر، سودا اور میر سوز دہلی سے ترک وطن کر کے لکھنؤ آئے تھے۔ انھوں نے لکھنوی رنگ شاعری کا اثر نہیں قبول کیا۔ وہ اپنے رنگ پر قائم رہے اس لیے ان شعرا کو دبستان لکھنؤ کے شعرا میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اس کے بعد آنے والے شعرا جرأت، انشا، مصحفی اور رنگین کو لکھنؤ کا ماحول راس آیا اور انھوں نے اپنے رنگ شاعری کو لکھنوی رنگ و روغن سے چمکایا۔ بعض ادبی مورخین نے انھیں شعرا کی فنی کاوشوں کو دبستان لکھنؤ کا نقش اول قرار دیا ہے جسے ناسخ اور آتش نے دوام بخشا اور دہلی کے مقابلے میں شاعری کے ایک مستقل مکتبہ فکر اور انداز شاعری کو رواج دیا۔ ان کے بعد آنے والے شعرا نے ان کی روایت کو آگے بڑھایا اور اپنے تخلیق عمل سے دبستان لکھنؤ کو پائیداری بخشنے کی کوشش کی۔ لیکن اس عہد میں بھی ہمیں بعض شعرا کے یہاں خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلیت کے اثرات ملتے ہیں، بزم عشرت کے قہقہوں کے ساتھ درد وغم کی کراہیں بھی سنائی دیتی ہیں اور فلسفہ وتصوف کے دھندلے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری دہلی کے رنگ شاعری سے قریب تر نظر آتی ہے''۔

(ادب نما: ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی، ص:180)

مندرجہ بالا اقتباس میں فخرالاسلام اعظمی نے آتش کے یہاں تصوف کے دھندلے نقوش کی بات کی ہے جبکہ ان کی شاعری کے غائر مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں تصوف کی گہری چھاپ ہے۔ ان کی سادگی اور نفس کشی نے انھیں صوفی منش اور بوریا نشیں بنا دیا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر امیر علی نے آتش کے کلام میں تصوف کی اہمیت اور افادیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی اپنے دعوے کے استحکام کے طور پر معروف نقاد اور شاعر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کو نقل کیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے مطابق تصوف و اخلاق سے متعلق آتش کی شاعری کا یہ حصہ پورے لکھنؤ اسکول کی آبرو رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ نظام فکر شاعر کی شخصیت میں نکھار پیدا کرتا ہے اور اسے اعلیٰ ترین انسانی اقدار سے وابستہ کر دیتا ہے جس کی بدولت غزل میں سنجیدہ خیالات کو جگہ ملتی ہے۔

> **آتش اپنی اخیر عمر میں بھی قلندرانہ شان اور وضع قطع میں رہتے تھے۔ وہ گیروا تہبند باندھتے تھے اور ایک ڈنڈا ہمیشہ ساتھ ہوتا تھا۔ وہ بہت خدا ترس اور خود دار طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور پورے عرصہ حیات میں زندگی کے سرد و گرم تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ مگر شروع میں جو روش اپنائی تھی وہ اخیر لمحے تک قائم رہی۔ آخری ایام میں ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی اسی وجہ سے ہمیشہ کے لیے گوشہ نشیں ہوگئے۔**

اس ضمن میں ڈاکٹر امیر علی اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں کہ:

''دبستان لکھنؤ کے نام آور شاعر آتش نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اردو زبان و ادب اور شاعری میں بڑا نام کمایا اور اپنے عہد کو بڑا متاثر کیا نیز انھوں نے اپنی شاعری میں بے شمار اشعار ایسے دیے ہیں جو آج بھی اپنا اثر رکھتے ہیں۔''

(خواجہ حیدر علی آتش: ڈاکٹر امیر علی، ادبی ڈائری، سیاست دہلی)

اب اخیر میں آتش کے چند اور اشعار ملاحظہ کریں۔ یہ صرف اپنی اثر انگیزی میں ہی معروف نہیں بلکہ آتش کے فلسفہ حیات اور ان کے متصوفانہ مزاج و منہاج کے بھی غماز ہیں۔

مغرور نہ ہو اپنی جوانی پہ آدمی
پیری نے آسماں کی کمر کو جھکا دیا

کوچۂ دلبر میں میں بلبل چمن میں مست ہے
ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے

آخر کار تہ خاک ہے مسکن ان کا
اہل دولت کو بلند آج مکاں کرنے دو

فقیری جس نے کی، گویا کہ اس نے بادشاہی کی
جسے ظلِ ہما کہتے ہیں درویشوں کا کمبل ہے

اردو کے اس قادر الکلام صوفی قلندر شاعر کا اصل وطن دہلی تھا۔ ان کے والد علی بخش نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد (ایودھیا، اترپردیش) آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اسی فیض آباد میں آتش 1778 میں پیدا ہوئے۔ ابھی ان کی عمر لڑکپن کی ہی تھی کہ ان کے والد ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے۔ اس افتاد نے ان کی تعلیم کو بہت متاثر کیا۔ پھر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری، وہ مسلسل کسب علم میں مصروف رہے اور اپنی نجی کوششوں سے مختلف علوم اور زبان پر دسترس حاصل کی۔ آگے چل کر انھیں سپاہیوں کی صحبت ملی اور وہ رفتہ رفتہ فن سپہ گری میں ماہر ہوئے اور پھر اسی سپہ گری کو انھوں نے اپنے معاش کا ذریعہ بھی بنایا۔ وہ نواب مرزا محمد تقی خان کے ملازم ہوگئے، اور جب نواب صاحب نے فیض آباد سے لکھنؤ کوچ کیا تو آتش بھی ان کے ہمراہ لکھنؤ آگئے اور اس شہر کو اپنا مستقل مستقر بنالیا۔ چونکہ شاعری کا ذوق کم سنی سے ہی تھا اس لیے لکھنؤ میں ان کو سازگار ماحول مل گیا۔ انھوں نے اپنے عہد کے استاد شاعر مصحفی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا......۔ وہ ابتدا سے ہی سادہ زندگی گزارنے کے عادی تھے اس لیے اپنی آمدنی کا زیادہ تر حصہ راہ خدا میں خرچ کر دیتے تھے، جس کے سبب کبھی کبھی انھیں فاقہ بھی کرنا پڑتا تھا۔ آتش چونکہ خواجہ زادوں کے گھرانے سے متعلق تھے۔ اس لیے ہمیشہ انھوں نے دینے کا کام کیا، کبھی کسی رئیس یا امیر کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

آتش اپنی اخیر عمر میں بھی قلندرانہ شان اور وضع قطع میں رہتے تھے۔ وہ گیروا تہبند باندھتے تھے اور ایک ڈنڈا ہمیشہ ساتھ ہوتا تھا۔ وہ بہت خدا ترس اور خود دار طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور پورے عرصہ حیات میں زندگی کے سرد و گرم تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے رہے، مگر شروع میں جو روش اپنائی تھی وہ اخیر لمحے تک قائم رہی۔ آخری ایام میں ان کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی اسی وجہ سے ہمیشہ کے لیے گوشہ نشیں ہوگئے۔ نیز اسی گوشہ نشینی کی حالت میں بالآخر وہ اس دنیا سے 1846 میں رخصت ہوگئے۔ وہ رخصت تو ہوگئے مگر انھوں نے اردو شاعری میں جو منفرد اور ممتاز مقام حاصل کیا وہ بعد از مرگ بھی ان کے عہد میں قائم رہا اور موجودہ دور میں بھی قائم ہے۔

■

Dr. Md Naushad Ahmad
Associate Prof. B.N College
Patna - 800004 (Bihar)

2021 کا فکشن اور فکشن تنقید

ایک مختصر عالمی جائزہ

اسلم جمشید پوری

2021 میں فکشن میں کیا کیا لکھا گیا۔کون سے ناول مشہور ہوئے، کن افسانوی مجموعوں نے شہرت حاصل کی۔ فکشن تنقید کی کن کتابوں نے قاری کو متاثر کیا۔اس کا ایک مختصر عالمی جائزہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

2021 کے اہم ناول

عبدالصمد کا شمار ہمارے ان فکشن نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو ادب کو مستقل ادبی فن پارے عطا کیے ہیں۔عبدالصمد کا پہلا ناول 'دوگز زمین' پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا تب سے اب تک ان کے نصف درجن ناول سامنے آچکے ہیں۔ان کا تازہ ترین ناول 'کشکول' پچھلے سال منظر عام پر آیا۔ جوکورونا کے مہلک اثرات کے بطن سے پیدا صورت حال پر فقیروں کی کہانی پر مشتمل ہے۔ناول میں کورونا جیسی بیماری کے شکار افراد کی اچھی منظر کشی کی گئی ہے۔ پورا ناول فقیروں کی زندگی پر ہے جنہیں ایک بازار کے فٹ پاتھ سے اٹھا کر شہر انتظامیہ قبرستان میں جگہ دیتی ہے۔ناول میں فقیروں کی زندگی، آپسی چپقلش، انتظامیہ سے ٹکراؤ، کھانے کی دیگوں پر ٹوٹ پڑنا اور آپس میں لڑائی جھگڑے کرنا، انتظامیہ کے لیے سر درد بن جانا جیسے فقیروں کے اور شہری زندگی کے مختلف مسائل کو عبدالصمد نے 'کشکول' میں سمیٹنے اور اٹھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ کورونا میں پوری دنیا ایک 'کشکول' بن گئی ہے اور زندگی کسی فقیر کے کشکول میں پڑے سکے کی مانند ہوگئی ہے۔

جرمنی کے معروف فکشن نگار سرور غزالی کا تازہ ترین ناول 'شب ہجراں' ہے۔ یہ ناول بھی ان کے پچھلے ناول کی طرح ہجرت کے مسائل کا عمدہ بیان ہے۔اس ناول میں بنگلہ دیش سے پاکستان اور پھر یوروپ کی طرف ہجرت کے مسائل کی عکاسی موجود ہے۔ناول کے کردار عظیم، سلیمہ، اور عالیہ ناول میں اہم رول ادا کرتے ہیں اور آخر میں عظیم اور عالیہ کے درمیان ایک مستقل ہجر کا معاملہ پیدا ہوجاتا ہے جس سے ناول کے عنوان کی مناسبت بنتی ہے۔ناول یوں تو رومانی ہے لیکن بنگلہ دیش، پاکستان اور یوروپ کے بہت سے مسائل کو سامنے لاتا ہے۔کورونا کے مضر اثرات کا بیان ناول میں درج ہے جو خاصا تکلیف دہ ہے۔

نذیر فتح پوری کی تقریباً 100 کے آس پاس مختلف اصناف میں کتابیں موجود ہیں۔'یہ میں ہوں' نذیر فتح پوری کا تازہ اور نیا ناول ہے جو 2021 میں 'اسباق' پبلی کیشن پونا سے شائع ہوا ہے۔

'یہ میں ہوں' ناول میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو زمانے کے ظلم وستم سے پریشان ہے اور اپنے پاکیزہ اور مقدس پیار کی قربانی دیتی ہے۔ پورا ناول رومانی انداز میں لکھا گیا ہے جس میں آفتاب اور شبنم دو مرکزی کردار ہیں۔ یہ ناول ہندوستانی عورت کی داستان ہے۔اس کا نام شبنم کی جگہ شکیلہ، شیبا یا شریفہ ہوسکتا ہے۔یعنی عورت اپنے گھر سے لے کر معاشرے تک میں اپنے شوہر کے بغیر محفوظ نہیں ہے۔ اسی بات کو نذیر فتح پوری نے عمدگی سے ناول کیا ہے۔

'منزل منزل' احمد حسنین کا ناول 'منزل منزل' میں علوزہ مرکزی کردار کے طور پر ہے جو عوامی فلاح و بہبود کے کام کرتی ہے۔ ہر وقت گاؤں والوں کی مدد کے لیے تیار رہتی ہے۔گاؤں میں پانی کے مسئلے کو تالاب کھدوا کر حل کرتی ہے۔فرقہ وارانہ رنگ کی وارداتوں کو حتی المقدور حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔علوزہ ایک مثالی کردار کے طور پر ناول میں آتی ہے جو اپنے کزن سلمان نامی نوجوان سے محبت کیا کرتی تھی لیکن سلمان کے کمپیوٹر اور موبائل میں گھسے رہنے کو وہ پسند نہیں کرتی اور اپنے پیار کو مختلف لوگوں میں تلاش کرتی ہے۔اس کی تلاش عظیم نامی نوجوان پر ختم ہوتی ہے جو دبئی میں ملازمت کرتا ہے۔

'مرحلے محبت کے' ڈاکٹر عاکف سنبھلی کا پہلا ناول ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے جس کی کہانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مرادآباد کے درمیان ہچکولے کھاتی رہتی ہے۔ ناول کے انجام کا گوکہ قاری کو پہلے ہی پتہ چل جاتا ہے، ہیرو ہیروئین کے ملن پر ہوتا ہے۔ناول کی خوبی یہ ہے کہ ناول صاف ستھرا ہے کہیں جنس کا شائبہ تک نہیں ہے۔ بڑی ہی پاکیزہ اور مقدس محبت کو دکھایا گیا ہے۔ناول میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تنقیدی ذکر اور مختلف شعبہ ہائے علم و ادب موجود ہیں۔ بڑے اچھے، ہرے بھرے لان، کینٹین، لائبریری، اور چائے خانوں کا ذکر ہے۔

'دھوپ چھاؤں' سہیل عظیم آبادی کا ایک غیر مطبوعہ ناول ہے جو پروفیسر ارتضیٰ کریم کی تحقیق و تدوین میں منظر عام پر آیا ہے۔ ناول آج سے تقریباً چالیس پچاس سال قبل کا ہے لیکن ناول میں آج کے مسائل اور آج کی زندگی کو عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بڑی محنت اور لگن کے بعد اس کے کئی نسخوں کا پتہ لگا کر اسے شائع کیا ہے۔ ناول کے موضوعات کے تعلق سے پروفیسر ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں:

''اس ناول دھوپ چھاؤں میں جن موضوعات کو

چھونے کی کوشش کی گئی ہے اسے دوررسی اور دوربینی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے اوراس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سہیل عظیم آبادی ایک مصنف ہونے کے باوصف اپنے عہد کے شب و روز اوران کے مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ورنہ اس ناول میں دہشت گردی، جنسی بے راہ روی، بین المذاہب شادی، نفسیاتی کشمکش، ضعیف الاعتقادی، کمیونزم، لادینیت، آزادانہ خیالات اور مذہب بےزاری جیسے موضوعات در نہیں آتے۔"

(دھوپ چھاؤں، سہیل عظیم آبادی، ص38)

'دریا ہے چشم گریہ ناک' شفق سوپوری کا ایک اہم ناول ہے۔

کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا ایک اچھا ناول ہے۔ ناول میں شفق سوپوری نے کشمیر میں زمیندارانہ نظام اور مظلوم طبقے کی کہانی کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔

'خودکشی نامہ' محترم رضوان الحق کا پہلا ناول ہے۔ یہ ناول اپنے ہم عصر ناولوں سے بہت مختلف و منفرد ہے۔ اس میں رضوان الحق نے زندگی میں جب پریشانیاں بہت آجائیں تو ایک ہی راستہ خودکشی بچتا ہے، کو اپنے بیان اور فلسفے سے سچ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے ناول کے ذریعے رضوان الحق نے خودکشی کی بڑی حمایت کی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار طالب اپنے آس پاس کے لوگوں کے ذریعے خودکشی کرنے پر نہ صرف حیران رہتا ہے بلکہ اس کے اسباب و علل جاننے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ خود اس کے حالات بھی ایسے ہوجاتے ہیں کہ وہ خودکشی کرنے پر تیار ہو جاتا ہے، اس کے پیار کے قصے بھی خودکشی پر جاکر ختم ہوتے ہیں۔

رحمٰن عباس کا ناول 'زندیق' گذشتہ برس شائع ہونے والا ایک مقبول ناول ہے۔

ناول میں زندگی کے مختلف رنگ ہجر و وصال، دہشت گردی، سماجی انقلاب، پس ماندہ طبقات کے مسائل، دوڑتی بھاگتی زندگی، انسانی نفسیات، شناخت کا مسئلہ وغیرہ اس ناول میں ملتے ہیں لیکن پورے ناول پر جنسی رنگ کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ ویسے بھی یہ رنگ رحمٰن عباس کے ناولوں کا خاصہ ہے۔

ان ناولوں کے علاوہ دیدار دوست (فہمیہ الیاس)، جانِ عالم (عرفانہ تزئین شبنم)، ایک خنجر پانی میں (خالد جاوید)، صالحہ صالحہ (صدیق عالم) گمشدہ علامت (مترجم یعقوب یاور) مشک پوری کی ملکہ (محمد عاطف علیم)، تکون کی چوتھی جہت (اقبال خورشید)، لاک تھری سکسٹی (اختر آزاد) رقص نامہ (جیم عباسی)، نولکھی کوٹھی (علی اکبر ناطق)، دائرہ (محمد عاصم بٹ)، میں تمثال ہوں (عارفہ شہزاد)، نوحہ گر (نسترن احسن فتیحی)، محصور پرندوں کا آسمان (حمیرہ عالیہ) وغیرہ جیسے ناول بھی آسمان ادب پر خوب چمکے لیکن تنگیِ وقت کے سبب تفصیلی گفتگو سے معذرت۔

افسانوی مجموعے

'بھور بھئی جاگو' نورالحسنین کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے۔

'بھور بھئی جاگو' میں بھی کئی افسانے یہ عشق نہیں آساں، یہ تیرے پراسرار بندے، گڑھی سے ابھرتا سورج، بھور بھئی جاگو، پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا اور سبزہ نورستہ کا نوحہ بے مثل افسانے ہیں۔ ان کو پڑھتے پڑھتے قاری ان میں کھو جاتا ہے۔

'آج میں کل تو' ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ افسانے کشمیر کی فضا کو عام طور پر پیش کرتے ہیں۔ یوں بھی ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانے مذہبی اور اصلاحی رنگ لیے ہوتے ہیں یا پھر جنس کا استعمال ان کے یہاں بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس مجموعے میں تین چار افسانچے بھی شامل ہیں کل ملا کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان افسانوں میں علاقائیت، مذہبیت، کشمیریت اور جنسیت جیسے مختلف رنگ ملتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ کورونا جیسی مہلک بیماری پر بھی کئی افسانوں پر اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

'حرف حرف تیرے نام' ندیم راہی مرادآبادی کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ ندیم راہی کے افسانوں میں ایک خوبی یہ پائی جاتی ہے کہ وہ بڑے نڈر اور بے باک ہو کر افسانے لکھتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں سیاسی شخصیات کا صحیح نام استعمال کرنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ ان کے زیادہ تر افسانے سیاست اور سماج کو بےنقاب کرتے ہیں۔

'نقش فریادی' راجہ یوسف کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ 'نقش فریادی' میں راجہ یوسف کے 33/افسانے اور 27 افسانچے شامل ہیں۔ راجہ یوسف کے افسانے اختصار کے وصف سے متصف ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں راست بیانیہ کے ساتھ ساتھ علامتی بیانیہ بھی ملتا ہے۔ وہ قاری کو چونکاتے بھی ہیں اور غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں شناخت کا مسئلہ، دہشت گردی، کشمیری عوام کا دکھ درد، ڈر، خوف، فوجی دہشت گردی، سیاسی اور سماجی نشیب و فراز، دم توڑتی انسانیت، قدروں کا زوال، رشتوں کی پامالی اور عدم تحفظ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کے افسانے مکڑی، نقش فریادی، گورکن، کن فیکون، نالائق،، جنگل راج، بے وفا، حصار، ببول، لاک ڈاؤن، مانگے کا اجالا، بند گھڑی کا کرب کا شمار ایسے افسانوں میں ہونا چاہیے جو قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ بطور افسانچہ نگار بھی راجہ یوسف نے الگ شناخت قائم کی ہے۔

'جگ ہنسائی' قیصر تمکین، برمنگھم کے افسانوں کا مجموعہ ہے جسے ان کی موت کے بعد حسن ایوبی نے اپنے طور پر ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ قیصر تمکین ہمارے عہد کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کو دوبارہ شائع کرکے قیصر تمکین شناسی میں ایک بڑا کردار ادا کیا ہے۔ مذکورہ مجموعے میں قیصر تمکین کے پندرہ افسانوں کو شامل کیا گیا ہے۔

'پرستش برق کی' سہیل وحید کے افسانوی مجموعے کا تیسرا ایڈیشن پچھلے دنوں منظر عام پر آیا۔ مجموعے میں کل تیرہ افسانے موجود ہیں جو سہیل وحید کے تجربے اور مشاہدے کے شاہد ہیں۔ ان کے افسانوں میں عام انسان کا دکھ درد، پیار محبت، سماج کے نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب بھی خاصا متاثر کن ہوتا ہے۔

'مانسون اسٹور' رخشندہ روحی مہدی کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ رخشندہ روحی کا یہ اردو کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جس میں سولہ افسانے شامل ہیں۔ رخشندہ روحی کے یہ افسانے اپنی پہچان آپ ہیں۔ ان افسانوں میں خلیجی اور مغربی ممالک کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے اعلیٰ طبقات یعنی طبقات اشرافیہ کے گھروں اور معاشرے کی کہانیاں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں پسماندہ طبقات کی کہانیاں بھی ہیں۔ رخشندہ روحی کی کہانیوں میں حسن و عشق کی ایسی داستان ملتی ہیں جو ہمیں کبھی رلاتی ہیں تو کبھی جذباتی بنا دیتی ہیں۔ ان افسانوں میں درد و کرب کی ایسی زیریں لہریں اٹھتی ہیں جو قاری کو کہانی میں شامل کر لیتی ہیں۔

'لاوا' ارشد منیم کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ ارشد

منیم افسانے کے ساتھ ساتھ افسانچے بھی قلم بند کرتے رہے ہیں۔

'ڈوبتی نسلیں'محترمہ رینو بہل کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے جس میں ان کے اکیس افسانے شامل ہیں۔ آپ کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں پنجاب کی نوجوان نسل کو بہتر طور پر پیش کیا جاتا ہے۔افسانہ 'ڈوبتی نسلیں' میں بھی پنجاب کی نئی نسل کو نشے کے دریا میں ڈوب کر برباد ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔مجموعے کے کئی افسانے پنجاب کی نئی نسل کی تباہ و برباد ہوتی زندگی کو عمدگی سے پیش کرتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ پسماندہ طبقات اور اعلیٰ ذات کے درمیان کی خلیج کو بھی افسانوں میں جگہ دی گئی ہے۔آپ کے اسلوب میں پنجابی کی آمیزش اسے اور پراثر بنادیتی ہے۔

'مجھے بھی' غزالہ قمر اعجاز کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔غزالہ قمر اعجاز کے افسانوں اور ناولوں میں عورت پروراساس سماج کے ظلموں کی کہانیاں زیادہ ملتی ہیں لیکن ان کے افسانوں کی عورت پہلے تو مجبور ولاچار نظر آتی ہے لیکن بعد میں وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کا حوصلہ بھی دکھاتی ہے۔'مجھے بھی' غزالہ قمر کا نیا افسانوی مجموعہ ہے جس میں تقریباً دو درجن سے زائد افسانے شامل ہیں۔ ان کی کردار نگاری کرداروں کے اندر اتر کران کے خارج اور باطن کو جاننے کا عمل اور پھر ان کو افسانوں میں پیش کرنا غزالہ قمر اعجاز کا خاصہ ہے۔

'ڈیجیٹل جنگل' ایم۔مبین کے ذریعے تحریر کردہ بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ایم۔مبین بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں اور بدلتے ہوئے زمانے کی رفتار سے ہم آہنگ ہونا بھی جانتے ہیں۔اسی لیے ان کی کہانیاں بچوں کو بہت پسند آتی ہیں۔'ڈیجیٹل جنگل' کی زیادہ تر کہانیوں میں انھوں نے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے استعمال پر زیادہ زور دیا ہے اور بچوں کی تربیت کے لیے عمدہ کہانیاں تحریر کی ہیں۔

'عجیب وغریب سچے افسانے' حمید ادیبی نااندوری کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ افسانوی مجموعے کے زیادہ تر افسانے سچے واقعات پر مبنی ہیں۔ ان کا اسلوب نہایت سادہ اور سلیس ہے۔لیکن یہ معاشرے کی گندگی اور برائیوں کو بے نقاب کرنے کا کام کرتے ہیں۔

'ڈینگی ڈریکولا' محترمہ فاکہہ قمر کی تازہ ترین کتاب ہے جو بچوں کے لیے ناول کی شکل میں تحریر کی گئی ہے۔ اسے تحریک برائے بچوں کا ادب نے شائع کیا ہے۔اس کتاب میں فاکہہ قمر نے بچوں کے لیے بڑی دلچسپ کہانی بیان کی ہے۔یہ بات ہم سب کے لیے انتہائی اطمینان کی ہے کہ اردو میں بچوں کا ادب مستقل لکھا جارہا ہے۔

'مینڈک کی وفاداری' رونق جمال کی تازہ ترین کتاب ہے جسے انھوں نے خود شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے انتہائی مفید اور کارآمد ہے۔رونق جمال بڑوں کے لیے افسانے اور افسانچے لکھتے رہے ہیں ساتھ ہی انھوں نے بچکانچہ نام سے بہت سارے افسانچے بچوں کے لیے لکھے ہیں۔

'ہم قدم' محترم فریدہ نثار احمد انصاری کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔'ہم قدم' میں محترمہ فریدہ نثار احمد انصاری کے بہت سے خوبصورت افسانے شامل ہیں ان افسانوں میں محترمہ نے اپنے آس پاس کی زندگی خصوصاً سعودی عرب کے حالات اور وہاں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ان کے متعدد افسانے جس میں جدائی کا کرب، ایک حسین عہدوپیا، عکس زندگی، ہم قدم وغیرہ اچھے افسانے ہیں۔

'انوکل اور دیگر کہانیاں' ستیہ جیت رے کی منتخب کہانیاں ہیں جس کا انتخاب اور اردو ترجمہ قیصر نذیر خاور نے کیا ہے، اور اس کتاب کو میٹرلنک پبلشر لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

اس کتاب میں ستیہ جیت رے کی 18 رمعروف اور نمائندہ کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے یہ سبھی کہانیاں اپنے عہد کے مسائل کو پیش کرتی ہیں ساتھ ہی آج کے بہت سارے مسائل کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ کتاب میں ستیہ جیت رے کے بنائے ہوئے خاکے اور اسکیچز کو بھی

خوبصورتی سے شائع کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر عشرت ناہید کا پہلا افسانوی مجموعہ **'منزل بے نشاں'** ہے۔ 'منزل بے نشاں' میں تقریباً ڈیڑھ درجن افسانے اور دو افسانچے شامل ہیں۔ آپ کے افسانوں میں علامت نگاری کا اچھا استعمال ملتا ہے۔ایک ڈری سہمی مشرقی عورت دکھائی دیتی ہے جو مرد اساس سماج کے ظلم وستم کی ماری ہوئی ہے لیکن اپنے پیروں پر کھڑا ہونا جانتی ہے۔ یوں تو آپ کے سبھی افسانے قابل مطالعہ ہیں لیکن سنگ تراش، منزل بے نشاں، ذرا اعتبار پالیں، آج کی حوا، جاند گرہن، کسک، کتاب چہرہ، فیصلے دل کے ایسے افسانے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

عظیم اللہ ہاشمی کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'دوسرا اوش پان' ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ درجن افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں لاک ڈاؤن، دوسرا اوش پان، نیلا سیارہ، شب غم کا چاند، جنازہ گھر، ہونٹ چلتے ہیں مسکرانے سے وغیرہ کا شمار اچھے افسانوں میں کیا جانا چاہیے۔ ان کے افسانے عصری حسیت اور فن پر دسترس سے مملو ہوتے ہیں۔ وہ آس پاس پر نظر رکھتے ہوئے ایسے کردار تراشتے ہیں جو ہمارے سماج کے اہم حصہ ہیں۔

'قوس قزح' محترمہ عارفہ خالد شیخ کے افسانچوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ مجموعے میں تقریباً سو افسانچے شامل ہیں۔ عارفہ خالد شیخ صاحبہ افسانے اور افسانچہ تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ تنقید بھی کرتی رہی ہیں۔ افسانچوں پر آپ کی خاصی گرفت ہے۔"قوس قزح" میں آپ نے بعض بہت اچھے افسانچے تخلیق کیے ہیں۔ جن میں مستی، بچپن، رہبری، نقاب، کایا پلٹ، مادر من، دل لگی، دو کتے، یاد حسین، مہمان نوازی، خود سپردگی، پرائی خوشی، تنگ دل وغیرہ اچھے افسانچے ہیں۔

'دکھتی رگ' خالد بشیر تلگامی کے ذریعے لکھے گئے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ تقریباً 110 صفحات پر افسانچے شائع ہوئے ہیں۔ افسانچوں کو خوبصورتی کے ساتھ باکس میں شائع کیا گیا ہے۔ خالد بشیر کے کئی افسانچے ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ روبوٹ، معصوم سوال، سبق، شارٹ کٹ، باپ بیٹا، بٹوارہ، دیوار، ناسور، مصروفیت، بھول، نجات وغیرہ اچھے افسانچے ہیں جو قاری کو متاثر بھی کرتے ہیں۔

' 100 لفظوں کی کہانیاں' ریحان کوثر کے تازہ ترین افسانچوں کا مجموعہ ہے۔

اس مجموعے میں تقریباً پانچ درجن افسانچے شامل ہیں۔ مصنف کے دعوے کے مطابق انتساب سے لے کر شکریے تک 100 لفظوں میں تحریر ہوا ہے۔ ان افسانچوں میں دھوبی کا کتا، بستر کا کونا، ہیڈ لائن، چھپا ہوا سسٹم، رام بان، منو رنجن، درد کی گولیاں، شہر کا ماحول، روہن اور گاندھی، بھارت مہان، وضو وغیرہ اچھے افسانچے ہیں۔ عجیب بات لگتی ہے۔

'یہ کیسا رشتہ' دیپک بدکی کے افسانچوں کا نیا مجموعہ ہے۔ اس میں تقریباً چھیاسی افسانچے شامل ہیں۔ ان

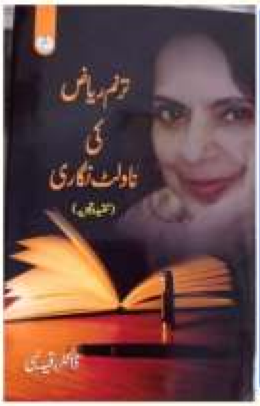

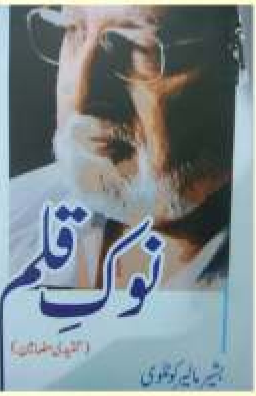

افسانچوں کی خاص بات یہ ہے کہ یہ موجودہ عہد کے مختلف معاملات پر گہرا طنز لیے ہوئے ہیں۔ ان میں کئی خو بصورت افسانچے ہیں جو قاری کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً نطفہ، یہ کیسا رشتہ، شترمرغ، ایمان کی قیمت، بہروپیا، ایکس ٹینشن، تجاوز، اندھی گلی، چور کے گھر مور، گھریلو تشدد، فرماں برداری، جنت اور جہنم، ٹی۔ آر۔ پی وغیرہ ایسے افسانچے ہیں جو ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

2021 کی فکشن تنقید

'اردو میں دلت افسانہ 1980 کے بعد' ڈاکٹر احمد صغیر کی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں احمد صغیر نے اردو کے لیے تمام افسانوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو یا تو دلت مسائل پر لکھے گئے ہیں یا دلت زندگی کو پیش کرتے ہیں یا کسی نہ کسی طور دلت کو ٹچ کرتے ہیں۔ انھوں نے 1980 کے بعد لکھے جانے والے تقریباً چار درجن افسانوں کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ اپنے مقدمے میں احمد صغیر نے سماجی تقسیم کے ساتھ ساتھ دلت افسانے کے نقوش کا ذکر کیا ہے وہ بھی پریم چند کو اردو میں دلت افسانوں کا بابا آدم مانتے ہیں اور ان کے کئی افسانوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

'باقیات سہیل عظیم آبادی' پروفیسر ارتضیٰ کریم کی نئی تحقیقی کتاب ہے جس میں انھوں نے سہیل عظیم آبادی کی ایسی تخلیقات کو جمع کیا ہے جو یا تو اس سے قبل شائع نہیں ہوئی یا پھر محدود حلقے میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

مذکورہ کتاب میں سہیل عظیم آبادی کے فیچر، ڈرامے، مضامین، تراجم اور انگریزی ہندی میں مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔

'نوکِ قلم' بشیر مالیر کوٹلوی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ 'نوک قلم' میں آپ نے منٹو، بیدی، انجم عثمانی، اشتیاق سعید، اسرار گاندھی، محمد علیم اسماعیل افسانہ نگاری پر خاطر خواہ لکھا ہے۔ ساتھ ہی نیا سماج، نیا افسانہ، احتجاج اور عصری افسانہ، افسانے کے لازمی اجزا، افسانچہ اور عصری ادب افسانچہ اور اس کی تعریف، بی میک اردو افسانے جیسے موضوعات کو بھی بشیر مالیر کوٹلوی نے 'نوک قلم' میں شامل کیا ہے۔

محمد علیم اسماعیل کی کتاب 'افسانچہ کا فن' نے کافی شہرت حاصل کی۔ 'افسانچہ کا فن' کتاب کے ذریعے افسانچے کی تعریف، تاریخ اور رفتار کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں افسانچے کے فن کے تعلق سے محمد علیم اسماعیل کے علاوہ متعدد ناقدین، افسانہ نگار اور افسانچہ نگاروں کے مضامین اور آرا کو شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں منتخب افسانچہ نگاروں کے افسانچے بھی شامل کیے گئے ہیں جس کے مطالعے سے افسانچے کی موجودہ صورت حال اور امکانات کا پتہ چلتا ہے۔

'اشتیاق سعید کے افسانے اور اہل قلم کے تجزیے' زرینہ الماس کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ کتاب میں اشتیاق سعید کے تقریباً 15 افسانوں کے تجزیے شامل ہیں جن میں محمد بشیر مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر عشرت بے تاب، ڈاکٹر عظیم راہی، ڈاکٹر اجے مالوی، ڈاکٹر فرقان سنبھلی، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، ڈاکٹر غضنفر اقبال جیسے اہم ناقدین کے تجزیے کتاب کا حصہ ہیں۔

'نعیم کوثر کی افسانوی کائنات' کتاب اقبال مسعود کی مرتب کردہ ہے۔ اقبال مسعود نے نعیم کوثر کے فن اور شخصیت پر بہت سارے مضامین شائع کیے ہیں۔ کتاب میں مضامین کے علاوہ نعیم کوثر کے کئی افسانوی مجموعوں پر تبصرہ و تجزیہ بھی شامل ہے۔

نعیم کوثر اردو کے ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔ آپ کا رجحان ترقی پسند ہے لیکن آپ نے جدیدیت کے عہد میں جب لکھنا شروع کیا تو ان کے افسانوں میں کہیں کہیں علامت نگاری کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ ویسے وہ والد کوثر چاندپوری کی روایت کو عمدگی سے اپنے افسانوں میں نبھا رہے ہیں۔ ان کے افسانے ہمارے سماج کا نوحہ ہیں اور مٹتی ہوئی تہذیب، ختم ہوتی انسانیت اور دن بہ دن بڑھتی علاقائیت کو بہترین ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔

'ترنم ریاض کی ناولٹ نگاری' ڈاکٹر رقیہ نبی کی تنقیدی کاوش ہے۔ ڈاکٹر رقیہ نبی کی یہ پہلی تحقیقی و تنقیدی کاوش ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر رقیہ نبی نے ترنم ریاض کی ناولٹ نگاری پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

ترنم ریاض ہمارے عہد کی معروف فکشن نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں سے عام انسانی زندگی خصوصاً کشمیری زندگی اور وہاں کے مسائل کو عالمی سطح پر اپنی تحریروں میں اٹھایا ہے۔

'رومی کے افسانے' اسلم جمشید پوری کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ اس کتاب میں پاکستان کی مشہور ومعروف افسانہ نگار رومانہ رومی کے افسانوں کا انتخاب اور افسانوں پر تقریباً پچاس صفحوں کا ایک مقدمہ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب میں رومانہ رومی کے تقریباً بیس افسانے شامل ہیں جن میں سے کرارا نوٹ، برانڈیڈ شرٹ، طوائف کون؟ آٹھواں دروازہ، بالکونی میں کھڑی عورت، وغیرہ ایسے افسانے شامل ہیں جن میں جدید تانیثیت کے ساتھ ساتھ عورتوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف زبردست قسم کا احتجاج ملتا ہے۔

'نورالحسنین کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ' ڈاکٹر قمر النساء کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ اس کتاب میں نورالحسنین کے تقریباً سولہ افسانوں کے تجزیے شامل ہیں۔ یہ سبھی تجزیے مختلف افسانہ نگاروں، ناقدین اور اسکالرز کے ہیں۔ کتاب کی خوبی یہ ہے کہ تجزیے کے ساتھ افسانے بھی اصل شکل میں شائع کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر قمر النساء نے نہ صرف افسانے اور تجزیے تلاش کر کے جمع کیے ہیں بلکہ ایک مضبوط نوٹ بھی نورالحسنین کی افسانہ نگاری پر تحریر کیا ہے۔

'شین مظفر پوری: حیات و خدمات' ڈاکٹر صوفیہ شیریں کی تازہ ترین کتاب ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں شین مظفر پوری کی زندگی اور ان کے فن کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو ملتی ہے۔

ڈاکٹر صوفیہ شیریں نے اس کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے کے تحت سوانحی کوائف، شخصیت اور شجرہ تحریر کیا ہے۔ جب کہ دوسرے حصے میں ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے افسانے، ناول، ڈرامے، خاکے، طنز و مزاح، انشائیہ، یادداشت، ریڈیو کے لیے تحریریں اور صحافتی مضامین پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مذکورہ کتاب شین مظفر پوری کی شناخت کے تعلق سے اہمیت کی حامل ہے۔

'فکشن کی تعبیر' مقصود دانش کی تازہ تنقیدی کتاب ہے۔ جس میں مقصود دانش نے ناول اور افسانے کے فن، اسلوب اور موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ افسانے کے زمرے میں انھوں نے معاصر افسانہ نگاروں کا تخلیقی رویہ، معاصر خواتین افسانہ نگاروں کا تخلیقی رویہ، افسانے میں موضوع اور اسلوب پر کھل کر بحث کی ہے۔ لیکن مقصود دانش نے زیادہ تر انہی لوگوں کا تذکرہ اکیسویں صدی کے افسانہ نگاروں میں کیا ہے جن کی شناخت گذشتہ صدی میں مضبوط و مستحکم ہوچکی تھی۔ ناول کے زمرے میں شمس الرحمٰن فاروقی، جوگندر پال، مصطفی کریم، حبیب حق،

سید محمد اشرف، صدیق عالم، خالد جاوید، شموئل احمد اور شبیر احمد کے ناول اور ناول نگاری پر اچھے مضامین شامل کیے ہیں۔ مقصود دانش خود بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں اور فکشن کی باریکیوں سے واقف بھی ہیں اسی لیے انھوں نے فکشن کے حوالے سے مختلف بحث کی ہے۔

ترقی پسند افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار 'پروفیسر اسلم جمشید پوری کی کتاب کا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ترقی پسند تحریک کے اسباب و علل، اغراض و مقاصد اور بعض ترقی پسند افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری پر سیر حاصل مضامین قلم بند کیے ہیں۔

'نئی صدی کی دو دہائیوں کا اردو فکشن' یہ کتاب پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر ارشاد سیانوی کی مشترکہ کاوش ہے۔ اس کتاب میں نئی صدی کی دو دہائیوں میں لکھے گئے افسانے، ناول، ناولٹ، افسانچہ اور مائیکرو فکشن سے متعلق مضامین اور نمونے شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں پوری اردو دنیا کی نمائندگی شامل ہے۔

'اسلم جمشید پوری فن اور فنکار' ڈاکٹر ارشاد سیانوی کی نئی تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب میں اسلم جمشید پوری کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے تقریباً تین درجن سے زائد مضامین شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اسلم جمشید پوری کے منتخب افسانے و افسانچے بھی شائع کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کتاب پر ایک طویل مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔

'عصمت شناسی افسانوں کے تناظر میں' ڈاکٹر وصیہ عرفانہ کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس مقالے پر موصوفہ کو پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی تفویض ہو چکی ہے۔

'نیا ناول نیا تناظر (اکیسویں صدی میں)' پروفیسر کوثر مظہری اور ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ کتاب میں اکیسویں صدی کے اہم ناولوں پر مختلف اسکالرز کے مضامین جمع کیے گئے ہیں۔

اس سال مزید تنقیدی کتابیں منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور (ڈاکٹر پرویز شہریار)، اردو افسانوں میں اخلاقی قدریں (انوری بیگم)، اردو افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ (محمد فاروق قادری)، افسانچوں کی الف لیلیٰ (انور مرزا اور ریحان کوثر)، من شاہِ جہاں نم، نور الحسنین، فکشن کلامیہ (مشتاق صدف، تاجکستان) رتن سنگھ کے منتخب افسانے (ڈاکٹر شمس اقبال)، قرۃ العین حیدر: ایک منفرد افسانہ نگار (ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو خان، ماریشس)، وحشی سعید اور فن افسانہ نگاری (شارق ادیب) بھی شائع ہوئی ہیں۔ لیکن صفحات کی کمی کی وجہ سے ان کی تفصیل شامل کرنے سے قاصر ہیں۔

گذشتہ برس ہمارے بہت سے فکشن نگار ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے، ان میں سے زیادہ تر کو کورونا جیسی عالمی وبا نے اپنے دامن میں سمو لیا۔ معروف ناول نگار مشرف عالم ذوقی (دہلی) محترمہ تبسم فاطمہ (دہلی) معروف افسانچہ نگار ایم اے حق (رانچی) معروف ترقی پسند فکشن نگار رتن سنگھ (نوئیڈا)، معروف ڈرامہ نگار اور ناقد پروفیسر شمیم حنفی (دہلی)، معروف افسانہ نگار و ناول نگار حسین الحق (گیا)، انوکھے افسانہ نگار بیگ احساس (حیدرآباد)، معروف ڈرامہ نگار اظہر عالم (کلکتہ) انامیت پسندی کے حامی افسانہ نگار شوکت حیات (پٹنہ)، اختصار پسندی کے بڑے فن کار انجم عثمانی (دہلی)۔ اردو ادب میں کشمیر کی خوشبو بکھیرنے والی فکشن نگار ترنم ریاض (دہلی) اردو میں سب سے زیادہ کتابیں لکھنے والے فکشن نگار، ناقد، شاعر پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)، حسینہ معین ڈراما نگار (کراچی)، بچوں کے ڈراما نگار احمد مشکور (لکھنؤ)، افسانہ نگار، صحافی مسعود اشعر (لاہور)، افسانہ نگار منظر احتشام (بھوپال)، ناول نگار، صحافی انیس مرزا (فرخ آباد)، معروف افسانہ نگار سیف الرحمٰن عباد (غازی پور)، افسانہ نگار رفیق شاہین (علی گڑھ)، معروف افسانہ نگار سلطان سبحانی (مالیگاؤں)، کلیم عرفی (الہ آباد)، ساگر سرحدی (ممبئی)، ندیم انصاری (شاہجہاں پور)، ڈراما نگار انیس جاوید (ممبئی)، مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والے احمد عثمانی (مدیر: بے باک)، احمد کلیم فیض پوری اور نئی نسل کے افسانہ نگار فرقان سنبھلی (علی گڑھ) ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے۔ لیکن ان کا تحریر کردہ فکشن ہمارے ساتھ رہے گا۔

معروف رسائل دربھنگہ ٹائمز، زبان و ادب، کاوش، عالمی ادبستان، آج کل وغیرہ نے فکشن نگاروں کی رحلت پر مضامین اور گوشے شائع کر کے خراج عقیدت پیش کیا۔

اس سال سوشل میڈیا پر بھی اردو فکشن کی کافی دھوم مچی رہی۔ عالمی اردو افسانہ، عالمی اردو فکشن، وولر فکشن گروپ کے ایونٹ فیس بک پر ہوتے رہے اور فیس بک کے قارئین کو نئے نئے افسانے ملتے رہے۔ بزم افسانہ کی روزانہ منعقد ہونے والی افسانہ نشستوں میں روز ایک نیا افسانہ پیش کیا جاتا اور اس پر مثبت و منفی رائے کھل کر سامنے آتی۔ بزم افسانہ نے مختلف موضوعات کے تحت افسانوی نشستیں منعقد کیں۔ وہاٹس ایپ پر قمر صدیقی کا گروپ اردو چینل سال بھر چھایا رہا۔ اس گروپ نے یوں تو سال بھر ادب کی مختلف اصناف کی بہترین کتب کو روزانہ اپلوڈ کیا۔ لیکن فکشن کے تعلق سے بھی اس گروپ میں مختلف کتابیں اپلوڈ ہوئیں۔ پورے سال تقریباً 70 سے زائد فکشن نگاروں کی کتابیں اور افسانے اپلوڈ کیے گئے۔

افسانچے کے فروغ کے لیے بھی مختلف گروپس وہاٹس ایپ پر سال بھر افسانچوں کی بدولت چھائے رہے۔ ان میں گلشن افسانچہ، افسانہ و افسانچہ گروپ، بزم نثار، کردار آرٹ گروپ، افسانچہ گروپ کے علاوہ یوٹیوب پر دنیائے افسانچہ نے کمال کر دکھایا۔ سال بھر مختلف افسانچوں کے آڈیوز ویڈیوز جاری کیے گئے۔ ساتھ ہی پرویز بلگرامی نے اپنی آواز میں مختلف افسانچے پیش کیے

سہ ماہی چشمۂ اردو، چھتیس گڑھ اردو اکادمی کے رسالے نے اردو افسانچے پر ایک خاص شمارہ شائع کیا ہے جو جولائی تا ستمبر 2021 میں شائع ہوا ہے۔ اس عالمی افسانچہ نمبر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں افسانچے کی روایت اور فروغ کے تعلق سے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس شمارے میں تقریباً پانچ درجن سے زائد افسانچہ نگاروں کے افسانچے بھی شامل ہیں۔ بعض افسانچہ نگاروں کے ایک سے زائد افسانچے بھی شامل ہیں۔ اس عالمی افسانچہ نمبر کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ افسانچہ کے فروغ میں اس رسالے کا اہم کردار ہے۔ اس رسالے کے مرتب معروف افسانچہ نگار رونق جمال ہیں۔

شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ نے اپنے جرنل ہماری آواز کا ایک خاص شمارہ 'نئی صدی کی دو دہائیوں کا فکشن نمبر' جاری کیا۔ جس میں پوری اردو دنیا میں نئی صدی میں لکھے گئے ناول، افسانے، افسانچے اور مائیکرو فکشن کے تعلق سے مضامین اور تخلیقات کو یکجا کیا گیا۔ اس خاص شمارے کی ادارت پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کی۔

چہار سو نامی ادبی رسالے نے نور الحسنین، محمد حمید شاہد اور پرویز شہریار پر گوشے شائع کیے۔ نور الحسنین اور حمید شاہد موجودہ وقت کے فکشن کے ستون مانے جاتے ہیں۔ ان سے متعلق گوشوں میں ان کے انٹرویوز، تخلیقات اور ان پر تنقیدی مضامین کی اشاعت سے ان کے فکشن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ پرویز شہریار کا شمار نئی نسل کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان پر شائع گوشے سے پرویز شہریار کے ساتھ ساتھ نئے افسانے کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

رسالہ پھول، نے معروف فکشن نگار مرتضیٰ ساحل تسلیمی پر ایک شمارہ شائع کیا ہے۔ پھول میں مرتضیٰ ساحل تسلیمی کے تعلق سے مضامین، ان کی منتخب کہانیاں اور نظموں کو شائع کر کے انھیں سچا خراج پیش کیا ہے۔

■

Prof. Aslam Jamshedpuri
HOD, Urdu CCS University
Meerut-250004 (UP)
aslamjamshedpuri@gmail.com
Mob.: 9456259850 , 8279907070

عارف خورشید
نورنگ خاکہ نگار

قاضی نوید

عارف خورشید اورنگ آباد کے وہ قلم کار ہیں جنھوں نے اردو ادب کی متعدد اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ شعری اصناف میں غزل، نظم اور ثلاثیاں لکھیں۔ نثری اصناف میں افسانہ، ناولٹ اور افسانچے تحریر کیے۔ غیر افسانوی صنف میں انھوں نے صنف خاکہ پر اپنی طبع آزمائی کی۔ کثیر تعداد میں خاکے تحریر کیے۔ میں ان کے خاکوں کے متعلق بات کروں گا۔

بقول ڈپٹی نذیر احمد دنیا میں مطالعے کے لیے بہت سی چیزیں ہیں لیکن سب سے بہترین مطالعہ انسان کی زندگی کا مطالعہ ہے۔ بقول مولوی عبدالحق ''انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے۔'' انسان کے مطالعے کے لیے خاکہ ایک بہترین صنف ہے۔ خاکہ ادب کی ایک اہم شاخ ہے۔ یہ صنف بظاہر بہت ہی آسان اور سادہ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ ایک مشکل ترین فن ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے اسے غزل کا فن کہا ہے۔ ڈاکٹر صابرہ سعید اسے اشاروں کا آرٹ اور اسلوب احمد انصاری اسے چاول پر قُل ھُوَ اللّٰہ لکھنے کا فن کہتے ہیں۔ اس لیے اس پر دسترس اور قدرت حاصل کرنا آسان نہیں۔ خاکہ اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں نہایت اختصار سے اشارے، کنایے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، خدو خال، عادات واطوار، اخلاق و کردار بغیر کسی مبالغے کے اس طرح پیش کر دیے جائیں کہ اس شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں گھوم جائے اور اگر شخصیت کے افکار و خیالات پوری نفسیات کے ساتھ ابھر کر سامنے آجائیں تو یہ ایک کامیاب خاکہ کہلائے گا۔ عارف خورشید کے بیشتر خاکوں میں یہ خصوصیات نظر آئیں گی۔

ان کا پہلا خاکوں کا مجموعہ 'تنظیم کثیر رنگی' کے نام سے 1922 میں نوائے دکن پبلی کیشن سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں کل 12 خاکے شامل ہیں۔ رنگ امتزاج میں 7 خاکے ہیں۔ ان کی ایک اور کتاب 'وقت کے چاک پر' میں بھی 4 خاکے ملتے ہیں۔ انھوں نے جو خاکہ جے۔ پی۔ سعید پر لکھا وہ میری مرتب کردہ کتاب 'نیرنگ خیال' میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ان کی زبانی 'لطیف قریشی' پر لکھا خاکہ سنا ہے۔ اس طرح تقریباً 25 خاکے میری نظر سے گزرے ہیں۔

خاکہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس شخصیت پر خاکہ لکھ رہا ہے اس شخص سے اس طرح واقف ہو۔ اس کی پسند ناپسند اس کے روز وشب اس کی عادات واطوار چال چلن حتیٰ کہ اس کی نفسیات سے بھی واقفیت انتہائی ضروری ہے۔ عارف خورشید نے ان ہی اشخاص پر خاکے تحریر کیے ہیں جن سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ایک انور خان سے قطع نظر باقی ماندہ تمام شخصیات کا تعلق اورنگ آباد سے ہے۔ ان میں محمود شکیل، بشر نواز، جاوید ناصر، یوسف عثمانی، ارتکاز افضل، زاہد حسن خان، قاضی رئیس، مولانا رشید ندوی مدنی، محمود صدیقی، وجاہت قریشی، سید غلام غوث شطاری، اختر حسین کے خاکے 'تنظیم کثیر رنگی' میں شامل ہیں۔ جبکہ شاہ حسین نہری، خان شمیم، انور خاں، ڈاکٹر الطاف قریشی، محمد حسن، اختر الزماں ناصر اور رفعت سعید قریشی پر خاکے رنگ امتزاج میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں قاضی سلیم، حمید سہروردی، جاوید ناصر اور رشید انوار پر خاکے 'وقت کے چاک پر' میں شامل کیے گئے ہیں۔ ان تمام اشخاص سے عارف خورشید کے گہرے مراسم تھے۔ وہ ان تمام کی پوری شخصیت سے کما حقہ واقفیت رکھتے تھے۔ ان میں سے بعض سے وہ بہت زیادہ بے تکلف بھی تھے۔

ان خاکوں کا مطالعہ کرتے وقت ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں جس فضا و ماحول سے ان شخصیات کا تعلق تھا۔ یہ خاکے کی ایک اہم خوبی ہے جو عارف خورشید میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان کے فن میں وقت کے ساتھ پختگی اور نکھار پیدا ہوا ہے۔ رنگ امتزاج میں موجود خاکے تنظیم کثیر رنگی کے خاکوں کی بہ نسبت زیادہ دلچسپ اور فنی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔

صنف خاکہ میں عنوان کی بڑی اہمیت ہے۔ عنوان سے ہی صاحب خاکہ کی شخصیت کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔ عارف خورشید نے ہر خاکے کا عنوان ایسا رکھا ہے کہ صاحب خاکہ کے کسی پہلو، مزاج، طینت اور کردار کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوجاتا ہے۔ انھوں نے اپنے خاکوں کے عنوانات صاحب خاکہ کی شخصیت سے مناسبت رکھنے والے رنگوں کے نام سے رکھا ہے اور اپنے خاکوں کے مجموعے کا نام 'رنگ امتزاج' رکھا ہے۔ انھوں نے صنف خاکہ میں کچھ تجربات کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ الگ الگ اشخاص کے خاکے کو الگ الگ طرز میں لکھنے کی سعی کی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف تکنیک اور اسالیب کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً شاہ حسین نہری کا خاکہ انھیں موجودہ دور کے تناظر میں 'مرحوم' فرض کر کے افسانوی تکنیک میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔ جب کہ اختر الزماں ناصر مرحوم کا خاکہ صیغہ حاضر کے استعمال کے ساتھ کولاژ کی تکنیک میں ہے۔ ان تمام تکنیک کے ساتھ ہی ان کے خاکوں میں افسانوی رنگ غالب ہے۔

خاکہ نگار کا مشاہدہ گہرا ہونا چاہیے عارف خورشید عمیق مشاہدہ رکھتے تھے۔ انھوں نے شخصیات کو ہو بہو پیش کیا ہے۔ خاکے میں لطیف مزاح اور نکتہ آفرینی بھی ضروری ہوتی ہے ساتھ ہی اس میں چھوٹے چھوٹے لطائف سے دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے۔ عارف خورشید کا یہ اقتباس دیکھیے:

''جشن بشر نواز کے سلسلے میں ہم بمبئی گئے۔ ابوبکر رہبر، میں اور انور خان آر۔ ایم۔ بھٹ ہاسٹل کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ خان صاحب نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا ''کل کہاں تھے؟ میں نے کہا ''دن بھر بھٹکتے پھرے۔'' انھوں نے برجستہ کہا'' رہبر کے ساتھ''۔

عارف خورشید کے خاکوں میں لطیف مزاح یا زیریں مزاح کی کمی نظر آتی ہے اس لیے کہ وہ ایک سنجیدہ اور متین انسان تھے لیکن انھوں نے واقعات کے ذریعے مزاح پیدا کیا ہے۔ Situation comedy کو اعلیٰ درجے کا مزاح سمجھا جاتا ہے۔ عارف خورشید نے Situation comedy کو بروئے کار لا کر اپنے خاکوں میں لطف پیدا کیا ہے۔ جے۔ پی۔ سعید کے خاکے کا یہ واقعہ ملاحظہ ہو:

''گرمیوں کے دن تھے۔ میں سفید ٹی شرٹ پہنا کلاس لے رہا تھا۔ صدر مدرس کا راؤنڈ ہوا۔ گھنٹہ ختم ہونے کے بعد چپراسی آیا کہ صاب بلا رہے ہیں۔ میں اجلاس پر پہنچا تو کمرے میں صدر مدرس کی آواز گونجی آپ مدرس ہیں، یہ کیا پہن رکھا ہے۔ بنیان صاف دکھائی دے

رہی ہے۔ (میں اس زمانے میں مسرت بار بل کلب کا ممبر تھا جسم کے پورے کٹس نمایاں تھے) آپ ایک معتبر پیشے سے وابستہ ہیں۔ لونڈے پٹے یا گلی کے داد انھیں ہیں اپنے مرتبے کا خیال رکھیے۔ جائیے۔" میں باہر نکلا تو غلام مصطفیٰ پر نظر پڑی وہ ململ کا کرتا پہنے ہوئے تھے۔ بنیان چھوٹی ہونے کی وجہ سے ازار بند نظر آرہا تھا۔ میں نے ان سے کہا: صاحب بلا رہے ہیں۔ وہ میرے ساتھ آفس میں داخل ہوئے میں نے استاد محترم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا سر یہ دیکھیے ان کا جسم بھی نظر آرہا ہے اور یہ (ناڑا) ازار بند۔ وہ مسکرا دیے اور میں تیزی سے باہر نکل گیا۔"

(تیرنگ خیال مرتب ڈاکٹر قاضی نوید الگ ہے راہبر۔ عارف خورشید ص:3-102)

اس طرح کے کئی واقعات سے انھوں نے اپنے خاکوں میں مزاح پیدا کیا ہے۔

صنف خاکہ کے لیے سراپا نگاری یا حلیے کی پیش کش میں بھی خاکہ نگار کو مہارت حاصل ہونی چاہیے۔ عارف خورشید ڈرائنگ کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے ان کو سراپا نگاری پر بھی مہارت تھی انھوں نے جو خاکے لکھے ہیں تقریباً اشخاص کا حلیہ اور ناک نقشہ بھی پیش کیا ہے۔ جس سے اس شخص کا پورٹریٹ قاری کی نظروں میں گھوم جاتا ہے۔ شاہ حسین نہری، مولانا رشید مدنی، ڈاکٹر ارتکاز افضل، لطیف قریشی کے خاکوں میں پیش کیے گئے حلیے کسی پورٹریٹ کی مانند نظر آتے ہیں۔

عارف خورشید نے بیشتر شخصیات پر بھرپور خاکے تحریر کیے ہیں۔ جن کے مطالعے سے اس شخص کی جیتی جاگتی، ہنستی بولتی، چلتی پھرتی تصویریں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر شاہ حسین نہری کا خاکہ لے لیجیے اس میں ان کا حلیہ، لباس، گفتگو کا انداز، عقائد، اخلاق و آداب، عادات و اطوار، پسند ناپسند یہ سارے نقوش پوری انفرادیت کے ساتھ ابھرتے ہیں اور شاہ حسین نہری کی شخصیت کو ہماری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کردیتے ہیں۔ بیڑ میں شاہ حسین نہری مستقل طور پر ایک مسجد میں نماز ادا کرتے تھے جو ان کے گھر سے قریب تھی ایک دن انھوں نے دیکھا کہ مسجد میں لائٹ چوری سے لی گئی ہے تو اس مسجد میں نماز پڑھنی چھوڑ دی۔ ایک اور واقعہ دیکھیے۔

" Invigilation کے دوران طلبہ نقل کر رہے تھے انھوں نے اپنی آواز کی طاقت سے روکنے کی کوشش کی، طلبہ باز نہیں آئے کیوں کہ اس زمانے میں نقل کا عام چلن تھا وہ اپنے دل میں برا سمجھ کر خاموش ہو رہے کہ یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔ پرچے کا وقت ختم ہونے کے بعد انھوں نے طلبہ سے کہا تھا "میری طرح کے Invigilator ہوں گے تو قومیں تباہ ہو جائیں گی۔ میں نے آپ کے ساتھ دشمنی کی ہے" پھر شرمندہ و افسردہ ہال سے ایسے نکلے تھے جیسے نقل کرنے کا گناہ انھی سے سرزد ہوا ہو۔"

(رنگ امتزاج عارف خورشید ص 71)

اس اقتباس سے شاہ صاحب کی شخصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ڈپلومیسی اور مصلحت پسندی خاکہ نگار کے لیے سم قاتل ہوتی ہے۔ عارف خورشید ایک بیباک، نڈر اور بے لاگ ادیب تھے اس لیے صنف خاکہ نگاری ان کے مزاج سے پورطرح میل کھاتی ہے۔ وہ ان باتوں کا بھی بے خوف ذکر کرتے ہیں جن کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ "گفتنی نہ گفتن کمال گویائی است" مگر عارف خورشید کے لیے نہ گفتنی گفتن کمال گویائی تھا۔

شمیم خان اورنگ آباد کے معروف شاعر ہیں۔ کسی کی ہجو لکھنا ان کا مشغلہ ہے۔ انھوں نے اورنگ آباد کے بہت سارے شاعروں اور ادیبوں کی ہجویات نہ صرف لکھیں بلکہ صاحب ہجو کے نام سے اس کے مکان کے پتے پر بھی پوسٹ کی ہیں۔ ایک مرتبہ شمیم خان نے ایک شاعر کی ہجو لکھی اور اس کے مکان کے پتے پر بھیج دی۔ کچھ دن بعد اس شاعر کا گذر اس گلی سے ہوا جہاں شمیم خان اپنے دوستوں کے ہمراہ بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اس شاعر کی نظر شمیم خان پر پڑی اس نے شمیم خان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں نے مکان بدل دیا، مجھے خط نہیں ملا۔

خاکے میں اگر شخصیت کی انفرادیت کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ اسکیچ نہیں رہ جاتا۔ م ناگ نے کیا خوب کہا ہے:

"خاکہ ایک عمارت کا کھلا دروازہ ہے مگر اس میں کئی چور دروازے بھی ہوتے ہیں جن میں جھانک کر دیکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ بظاہر یہ ہوتے نہیں بنانے پڑتے ہیں۔ اصل کام یہ ہے کہ آدمی کے اندر کے آدمی کو باہر لایا جائے۔ اسے کھینچ کھانچ کر باہر لانا نقادوں کا کام ہے بھلا پھسلا کر لانا خاکہ نگار کا وصف ہے۔"

(م۔ ناگ۔ روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی 2،3 مارچ 1996)

عارف خورشید نے اپنے خاکوں میں شخصیت کو اس کی پوری انفرادیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اورنگ آباد میں بیک وقت چار مشہور اشخاص کا نام 'شمیم' تھا۔ اس لیے قمر اقبال نے شمیم خان کو ان تینوں سے ممتاز کرنے کے لیے ان کے نام کے ساتھ لفظ "دھوکہ لگا دیا۔ یعنی 'شمیم دھوکہ' اور شمیم خان 'دھوکہ' کے نام سے مشہور ہوگئے۔ عارف خورشید نے شمیم خان کو اسی نام سے دعوت نامہ دیا۔ جس پر شمیم خان کی رگ شرارت پھڑ پھڑائی اور انھوں نے امارت شرعیہ کی طرز پر شہر میں قائم امارت غیر شرعیہ کے صدر کو شکایتی مکتوب تحریر کر دیا۔ اس مکتوب کو عارف خورشید نے خاکے میں شامل کیا ہے۔ جس سے شمیم خان کے مزاج کی شرارت اپنی پوری انفرادیت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ نیز شمیم خان کی رگوں میں سرایت کردہ ادبیت اور بے ادبی میں بھی ادبیت صاف جھلکتی ہے۔ درخواست ملاحظہ ہو:

بخدمت شریف جناب صدر صاحب مدظلہ، امارت غیر شرعیہ، لوٹا کارنجہ، اورنگ آباد

مقدمہ: ایک شریف انسان کا نام بگاڑنے کے سلسلے میں۔

حوالہ: عارف خورشید کا وہ رقعہ جو انھوں نے اپنے بچوں کے عقیقے کے لیے طبع کروایا تھا۔ منسلک ہے

عالی جاہ! ادبا گذارش ہے کہ عارف خورشید (ناکام شاعر) نے اپنے بچوں کی تقریب عقیقہ کے لیے معصوم کو مدعو کیا اور نام کے آگے لفظ 'دھوکا' سبز سیاہی میں لکھا۔ چونکہ میں ایک مستند شریف شہری ہوں اور موصوف کی اس رکیک حرکت سے ذہنی طور پر مفلوج ہو چکا ہوں۔

عالی جاہ کے حضور دست بدعا ہوں کہ ایسے شخص نا ہنجار، شاعر ناتمام، مدرس نما بیوپاری، چرواہے عارف خورشید کو سخت سے سخت سزا دی جائے تا کہ اوروں کو عبرت حاصل ہو۔

امید کہ عالی جاہ اس مسئلے پر بطور خاص نظر فرما کر مجرم عارف خورشید، مدرس مولانا آزاد ہائی اسکول کو سخت سے سخت سزا تجویز فرما کر معصوم حقیر فقیر خان شمیم خان پر کرم فرمائیں گے۔

شرح دستخط: شمیم گواہان 1) محمد حسن 2) عفیف شطاری

خاکہ دراصل خاکہ نگار کے خلوص نیت اور جس پر خاکہ لکھا جارہا ہے اس کی فراخ دلی کا طالب ہوا کرتا ہے رؤف خیر نے اپنے مضمون میں اورنگ آباد کے ادیبوں اور شاعروں کی تعریف کی ہے جو تنقید کو برداشت کرتے ہیں۔

خاکے میں طنز نہیں ہونا چاہیے۔ جہاں اس میں طنز در آیا وہیں سے یہ ہجو کی سرحد میں داخل ہوگیا خاکے کو ہجو نہیں ہونا چاہیے نہ ہی مدح۔ عارف خورشید شاہ حسین نہری کے خاکے میں لکھتے ہیں:

"میں پہلی ہی ملاقات میں سمجھ گیا کہ آدمی 'مذہبی' دکھائی دینے کے باوجود نیک ہیں" کسی نے کہا ہے کہ پارسا لوگوں پر خاکہ لکھا جائے تو وہ کامیاب خاکہ نہیں ہوتا۔ پارسا لوگوں پر سوانح لکھی جانی چاہیے۔ عارف خورشید نے پارسا لوگوں پر بھی اچھے خاکے لکھے ہیں۔ عارف خورشید زبان پر عبور رکھتے تھے۔ ان کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے اور کیوں نہ ہو ان کی زبان، زبان اورنگ آبادی جو ہے۔

■

Dr. Quazi Naweed Ahmed Siddiqui
Dept of Urdu
Maulana Azad College of Arts, Science & Commerce, Dr. Rafiq Zakaria Campus
Rauza Baugh
Aurangabad - 431001 (MS)
Mob.:9860839355

اردو کا پہلا خاکہ اور خاکہ نگار

ارشاد آفاقی

خاکہ نگاری کو باقاعدہ فن کے طور پر غالباً مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنا یا-انہوں نے ڈپٹی نذیر احمد کا جو خاکہ لکھا ہے وہ اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے-یہ اردو کا پہلا طویل اور مکمل خاکہ ہے اور سیکڑوں صفحات پر مشتمل سوانح سے زیادہ بھاری ہے-

عموعی طور پر اردو کے محققین اور ناقدین اس بات پر رطب اللسان ہیں کہ اردو کا پہلا خاکہ 'نذیر احمد کی کہانی-کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی' از فرحت اللہ بیگ ہے۔ یہ طویل اور دلچسپ خاکہ، پہلی بار انجمن ترقی اردو (ہند) کے رسالے 'اردو' کے شمارہ جولائی 1927 میں چھپا تھا۔ غالبًا یہ پہلی تحریر ہے جو فرحت اللہ بیگ کے نام سے شائع ہوئی تھی، ورنہ اس سے قبل وہ عموماً 'مرزا الم نشرح' کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔ یہ لازوال و بے مثال خاکہ، صاحب خاکہ اور خاکہ نگار دونوں کے لیے شہرتِ عام اور بقائے دوام کا سبب بنا اور اب تک اسے اردو کا پہلا خاکہ اور فرحت اللہ بیگ کو پہلے خاکہ نگار کا منصب حاصل ہے۔

اس سلسلے میں پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر بشیر سیفی، خلیق انجم، مبین مرزا، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اور یحییٰ امجد وغیرہ متفق الرائے ہیں کہ اردو میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز فرحت اللہ بیگ کے تحریر کردہ خاکے 'نذیر احمد کی کہانی - کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی' سے ہوتا ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا تمام ناقدانِ فن کے اقوال نقل کیے جاسکتے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لیے درج ذیل چند اقتباس بطور سند پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی:

''اصطلاحی معنوں میں اردو خاکہ نگاری کا آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور وحید الدین کی جیسی بے مثال تصویریں مرزا فرحت اللہ بیگ نے لفظوں میں اتاری ہیں۔ انھیں آج بھی اردو خاکہ نگاری کی روایت کا روشن ترین نقش کہا جاسکتا ہے''[1]

اس حوالے سے دوسرا قول خلیق انجم کا ملاحظہ فرمائیں:

''خاکہ نگاری کو باقاعدہ فن کے طور پر غالبًا مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنایا۔ انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کا جو خاکہ لکھا ہے، وہ اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اردو کا پہلا طویل اور مکمل خاکہ ہے اور سیکڑوں صفحات پر مشتمل سوانح سے زیادہ بھاری ہے۔''[2]

اس سلسلے میں جو آخری بیان نقل کرنا چاہتا ہوں، وہ مبین مرزا کا ہے۔ بقول ان کے:

''مولانا محمد حسین آزاد کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک ایسا مضمون ہمیں ملتا ہے جسے فنی قواعد کے پیشِ نظر رکھتے ہوئے باضابطہ طور پر اردو کا پہلا خاکہ قرار دیا جاسکتا ہے اور وہ ہے 'ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی - کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی'۔ اس مضمون میں فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کے حوالے سے شخصی یادوں اور معاشرتی حوالوں کو بیان کی سادگی، اسلوب کی شگفتگی اور تخیل کی پرکاری کے ساتھ اس خوبی سے گوندھا ہے کہ یہ مضمون اردو کا پہلا ہی نہیں بلکہ اب تک لکھا جانے والا بہترین خاکہ قرار پاتا ہے۔ ایک نئی صنفِ ادب کے حق میں یہ مضمون بارش کا پہلا

قطرہ ثابت ہوا کہ آگے چل کر خاکہ نگاری نے ادب میں بذاتہ ایک صنف کی حیثیت حاصل کی اور اپنی الگ عمارت تعمیر کی تو اس عمارت کی بنیاد کا پتھر یہی مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا خاکہ قرار پایا۔''[3]

مذکورہ بالا ناقدین مرزا فرحت بیگ کو اردو کا پہلا خاکہ نگار اور ان کے تحریر کردہ خاکے بعنوان 'نذیر احمد کی کہانی - کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی' کو پہلا خاکہ تسلیم کرتے ہیں۔ مگر تحقیق میں کوئی بات حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی۔ تاریخی اعتبار سے اردو کا پہلا خاکہ 'حسرت موہانی (ایک قدر دان کی نظر سے)' از خافی خان ہے۔ یہ خاکہ پہلی بار رسالہ 'زمانہ' کانپور دسمبر 1908 میں شائع ہوا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی اپنی تصنیف 'یہ لوگ بھی غضب تھے' میں رقمطراز ہیں:

''ہمارے محققین مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون 'نذیر احمد کی کہانی ...... کچھ ان کی، کچھ میری زبانی' کو اردو کا پہلا باضابطہ خاکہ قرار دیتے ہیں...... سید سجاد حیدر یلدرم اس سے پہلے حسرت موہانی کا خاکہ خافی خان کے نام سے لکھ چکے تھے جو دسمبر 1908 کے رسالہ 'زمانہ' کانپور میں شائع ہوا تھا۔''[4]

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی نے مذکورہ کتاب کے پیش لفظ بعنوان 'چہرہ نما' میں یہ بیان 16 اپریل 1988 میں تسوید کیا ہے۔ جس کی طرف بعد میں نہ تو خود ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی اور نہ ہی دوسرے ناقدین و محققین نے اس جانب بھرپور دھیان دیا ہے۔ بلکہ یہ تحقیقی معاملہ ہنوز جوں کا توں ہے۔ البتہ انیس سال بیت جانے کے بعد یعنی 2007 میں قدرت اللہ شہزاد نے اپنی تصنیف 'اردو کے چند خاکہ نگار' میں ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کی اسی بات کو درج ذیل لفظوں میں دُہرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کی اردو کے پہلے خاکہ نگار مرزا رحت اللہ بیگ ہیں جنھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کا لازوال خاکہ لکھ کر شہرت دوام پائی۔ لیکن ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی پہلے خاکہ نگار کے طور پر سجاد حیدر یلدرم کا کھوج لگاتے ہیں جنھوں نے فرحت اللہ بیگ سے کہیں پہلے دسمبر 1908 میں حسرت موہانی کا خاکہ 'خافی خان' کے نام سے لکھا جو 'زمانہ' کانپور میں شائع ہوا۔''[5]

ماسوائے مذکورہ بیانات، بقیہ تفصیل ندارد، شاید انھیں اس خاکے کا متن دستیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ یہ خاکہ متحدہ ہندوستان میں ایک صدی قبل شائع ہو چکا تھا۔ اس لیے تنقیدی اور فنی زاویہ نظر سے اس پر کلام کرنے سے قاصر رہے۔ حالانکہ فنی لوازم ہی حتمی رائے قائم کرنے کی بنیاد ٹھہریں گے۔ اس حوالے سے میں نے تلاش و جستجو جاری رکھی اور میں نے رسالہ 'زمانہ' کانپور کی فائلیں کھنگالنی شروع کیں، جس کے بعد مجھے 'حسرت موہانی (ایک قدر دان کی نظر سے)' از خافی خان دسمبر 1908،[6] کے شمارے میں ملا۔ ایک طرف خاکہ ملنے کے ساتھ ہی میری تحقیق مکمل ہوئی۔ مگر دوسری جانب تحقیق کا ایک اور باب وا ہو گیا، کیونکہ یہاں مصنف کا نام 'خافی خان' لکھا ہوا ہے۔ اس لیے اس بات کی تہہ تک جانا میرے لیے لازمی بن گیا کہ آیا 'خافی خان' سید سجاد حیدر یلدرم ہی ہے یا کوئی اور۔ اگرچہ ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی (1932-2008) کے اقتباس سے اس بات کا اشارہ ضرور ملا اور چند رسائل مثلاً 'نگار' لکھنو جنوری 1963 اور 'پگڈنڈی' امرتسر (سید سجاد حیدر یلدرم نمبر) اپریل 1961 پر کسی نے قلم سے لکھا کہ 'خافی خان' سید سجاد حیدر

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کی اردو کے پہلے خاکہ نگار مرزا رحت اللہ بیگ ہیں جنھوں نے ڈپٹی نذیر احمد کا لازوال خاکہ لکھ کر شہرت دوام پائی۔ لیکن ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی پہلے خاکہ نگار کے طور پر سجاد حیدر یلدرم کا کھوج لگاتے ہیں جنھوں نے فرحت اللہ بیگ سے کہیں پہلے دسمبر 1908 میں حسرت موہانی کا خاکہ 'خافی خان' کے نام سے لکھا جو 'زمانہ' کانپور میں شائع ہوا۔

یلدرم ہی ہیں۔ پھر بھی میں نے اپنی کوشش جاری رکھی اور مجھے اس حوالے سے جو معلومات حاصل ہوئی۔ وہ اس طرح ہیں۔ بقول عابد رضا صاحب بیدار:

''خافی خان کے نام سے زمانہ دسمبر 1908 میں ایک مضمون 'حسرت موہانی' شائع ہوا تھا...... خافی خان، والا مضمون سجاد حیدر یلدرم کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مجھے ابوالخیر کشفی صاحب نے بتایا اور خود انھیں حسرت نے بتایا تھا۔''[7]

مندرجہ بالا حوالے سے یہ بات پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے کہ حسرت موہانی پر تحریر کردہ خاکہ بعنوان 'حسرت موہانی (ایک قدر دان کی نظر سے)' سید سجاد حیدر یلدرم (1880-1943) نے لکھا ہے۔ جو اپنے زمانے کے مشہور و معروف رسالہ 'زمانہ' کانپور میں دسمبر 1908 میں شائع ہوا۔ اس سے اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ ہمارے یہاں خاکہ نگاری کی ایک صدی 2008 میں مکمل ہو چکی لیکن میرے ذہن میں ایک اور سوال نے جنم لیا کہ سید سجاد حیدر یلدرم نے اپنے اصلی یا قلمی نام سے یہ خاکہ کیوں نہیں لکھا یا شائع کیا۔ بجائے اس کے انھوں نے فرضی نام کا سہارا لے کر اپنے قریبی دوست کا خاکہ لکھا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ اس سلسلے میں پہلا مستند حوالہ یلدرم کی صاحبزادی اور اردو کی نامور ادیبہ قرۃ العین حیدر کا نقل کرتا ہوں۔ وہ لکھتی ہیں:

''1908 اردوئے معلی علی گڑھ کے ایک شمارے میں مصر میں برطانوی پالیسی پر نکتہ چینی کی گئی۔ مولانا حسرت موہانی پر مقدمہ چلا جو ہندوستان کا پہلا مقدمہ تھا۔ دو سال قید سخت کی سزا ہوئی۔ یلدرم نے ان کے متعلق ایک مضمون لکھا۔ .... سجاد حیدر نے جو سابق امیر کابل کی نگرانی پر دہرہ دون میں تعینات تھے اور افغانستان میں برطانوی پالیسی کے خلاف ایک لفظ نہ کہہ سکتے تھے خافی خان کے فرضی نام سے لکھا۔''[8]

اس حوالے سے دوسرا معتبر قول جناب عتیق صدیقی کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یلدرم، جو علی گڑھ میں حسرت کے ہم عصر ہی نہیں ان کے گہرے دوست بھی تھے اور ان کے ذہنی ارتقاء کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انھوں نے عارف ہنسوی[9] سے دس سال پہلے حسرت پر ایک طویل مقالہ 1908 میں لکھا تھا۔ حسرت پر لکھا جانے والا یہی پہلا مقالہ تھا، جو جرم بغاوت میں حسرت کے سزایاب ہونے کے فوراً بعد لکھا گیا تھا، اور 'خافی خان' کے فرضی نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یلدرم نے یہ مقالہ لکھ کر حسرت کے ساتھ دوستی کا حق ادا کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنے قلم کے چہرے پر انھوں

نے 'خافی خان' کے نام کی نقاب ڈال لی تھی اس وقت حکومت اور خداوندان کالج دونوں حسرت کو جس غضب آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے، اس کے پیش نظر حسرت کے ساتھ علانیہ ہمدردی کا اظہار کرنا آسان نہ تھا۔"10

تحقیقی اور تاریخی نقطۂ نگاہ کے بعد تنقیدی اور فنی اعتبار سے جب اس خاکے کا بغور اور بغائر مطالعہ کرتے ہیں کہ آیا خاکہ نگاری جن فنی لوازمات اور صنفی خصوصیات کا مطالبہ اور تقاضا کرتی ہیں یہ خاکہ ان کو پورا کرتا ہے اور ان پر کھرا بھی اترتا ہے یا نہیں۔ میرے خیال میں یہ خاکہ، خاکہ نگاری کے موجودہ معیارات اور جدید ضابطوں کے لحاظ سے ایک مکمل خاکہ ہے کیونکہ خاکہ نگاری کا بنیادی وظیفہ فرد کی صورت گری ہے نہ کہ فرد کی حسبی ونسبی خصوصیات کو ضبط تحریر میں لانا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو یلدرم کا لکھا ہوا خاکہ 'حسرت موہانی (ایک قدر دان کی نظر سے)' ایک جیتا جاگتا اور جاندار مرقع ہے جس میں حسرت اور ان کی شخصیت اپنی تمام تر خوبیوں اور بشری کمزوریوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی خاکہ کی کامیابی کا راز ہے۔ دراصل یہ خاکہ اردو کے مشہور انشا پرداز، جدت پسند شاعر، دل کش قصہ نویس، مترجم، زرخیز ذہن اور توانا قلم کار نے لکھا۔ جس کا مطالعہ عمیق تھا اور جس کی نگاہ وسیع تھی نیز جس کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ حسرت کے نہ صرف قریب تھے بلکہ ہم جماعت وہم مکتب بھی تھے۔ اس لیے وہ حسرت کے حالات وواقعات، خلوت وجلوت، مزاج ومنہاج، کردار وگفتار، علم وادب، زبان وبیان، خلوص وسچائی، ایثار وہمدردی، ایمان وایقان، عادات واطوار، شکل وشمائل، خصائل ومعاملات اور مذہبی خیالات وسیاسی نظریات سے واقف تھے جس کا برملا اظہار اور عمدہ تصویر کشی یلدرم نے اس خاکے میں کی۔ اس طرح اس خاکے میں حسرت کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، بولتی چالتی اور ہنستی کھیلتی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومتی ہے۔

حسرت علی گڑھ میں بہ لحاظ شکل وشباہت اور شکل وشمائل کے اس قدر دلچسپ تھے کہ ہر ایک نے مذاق میں 'خالہ اماں' کا نام دیا تھا۔ اس حوالے سے سید سجاد یلدرم کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"انیسویں صدی کے آخری برس اور اس سے ایک سال پیشتر جو لوگ علی گڈھ میں تھے ان کو یاد ہوگا کہ ان ایام کے نوواردان میں سے کوئی شخص بلحاظ شکل وشباہت، وضع قطع اور چال ڈھال کے اس قدر دلچسپ نہ تھا جس قدر نواح لکھنؤ کا ایک طالب علم جسے محبت اور مذاق نے 'خالہ اماں' کا نام دیا تھا۔

چھوٹا قد، لاغر بدن، گندمی رنگ پر چیچک کے مٹے ہوئے داغ، عمر کا خیال کرتے ہوئے داڑھی کسی قدر نیچی، فراخ پیشانی اور چہرے کی مسکراہٹ قیافے کو ناگوار نہ ہونے دیتی تھی۔ اس پر کلابتونی ٹوپی، پرانی وضع کے چار خانے کا انگرکھا، شروع کا تنگ پاجامہ جس کے پانچے ٹخنوں سے اونچے، عینک اور چھتری اضافہ کیجیے تو 'خالہ اماں' یا دوسرے لفظوں میں سید فضل الحسن حسرت موہانی کی صورت چشم تصور کے سامنے پھرنے لگے گی۔"11

یہ اقتباس جہاں ایک طرف حسرت کی اُس وضع قطع، چہرے مہرے اور ظاہری شکل وصورت کو واضح کرتا ہے جس سے حسرت علی گڈھ پہنچے تھے، وہیں دوسری جانب اودھ کے اس دور کے قصباتی کلچر یا جاگیرانہ تہذیب کی ہلکی سی تصویر بھی پیش کرتا ہے۔

حسرت موہانی بحیثیت طالب علم جس ہیئت کذائی یا قدیم وضع قطع کے ساتھ علی گڑھ کے ماحول میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے مذاق کیا، پھبتیاں کسیں، نہ جانے کیا کیا القاب سے نوازا۔ وہ آج تک زبان زد ہے، لیکن حسرت موہانی اپنے مخصوص ذہنی رجحانی کیفیات پر اٹل رہے اور اپنی جرات، ذہانت اور صداقت میں ایسے کھرے ثابت ہوئے کہ پہلے اپنے ساتھیوں اور رفتہ رفتہ پورے ملک کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ اس لیے یلدرم اس بات کا اعتراف کرنے کے لیے مجبور ہوئے کہ:

"غرض ان اوصاف کا نتیجہ سمجھو یا ان کی خوش نصیبی کا کہ پورا سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ 'خالہ اماں' نے عدم کی راہ لی اور اس کے بجائے 'مولانا' بچے سے لے کر بوڑھے تک کی زبان پر جاری ہوگیا۔ کالج کی تاریخ القاب بخشی میں یہ ایسا واقعہ ہے جس کی نظیر نہیں۔"12

حسرت موہانی سچے انسان اور پکے دین دار تھے اس کے باوجود ان کا شیوہ شدت پسندی کے بجائے وسیع المشربی اور تعصب کے بجائے فراخدلی تھا۔ دراصل گھر کے مذہبی ماحول اور ان کے اساتذہ کی تربیت نے حسرت کو لڑکپن سے صوم وصلوٰۃ کا پابند بنا دیا تھا۔ وہ بڑے خوددار، خداشناس اور خداترس انسان تھے۔ حسرت نے اسلامی تعلیمات کو صرف کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے فرائض تک ہی محدود نہیں رکھا تھا بلکہ اسلام کو اس کے ہمہ گیر اور وسیع معنوں میں سمجھا تھا۔ جس کا مطالبہ قرآن وحدیث کی تعلیمات ایک مومن سے کرتی ہیں اور آخری دم تک اسی پر ثابت قدم رہے۔ یلدرم ان کی پابندی صلوٰۃ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"فضل الحسن ایک خوش عقیدہ مسلمان تھا۔ ایسا کہ پُرانی وضع کے مسلمان اس کے کسی قول وفعل پر گرفت نہ کر سکتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی اس کی زندگی کا جزو ضروری تھا مگر برخلاف عوام کے اس سے اس کی شیرینی طبع میں فتور نہیں آنے پایا تھا۔ بارہا دیکھا گیا کہ بے تکلفی کا جلسہ گرم ہے اور نماز کا وقت بن بلائے مہمان کی طرح آ پہنچا، فضلل مسکراتے ہوئے اُٹھے۔ معذرت بھی کرتے جاتے ہیں اور وضو بھی۔ یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو کر پھر آ بیٹھے۔ مگر ایسی حالتوں میں نماز بہت جلد جلد پڑھتے تھے، بلکہ ان کے دوستوں کا خیال ہے کہ کلام مجید کی سورتوں کے بجائے ان کے اعداد بحساب ابجد پڑھ لیا کرتے تھے۔"13

حسرت موہانی کے یہاں جتنی بے باکی اور بے خوفی تھی اتنی ہی سادگی اور صداقت بھی تھی۔ اس کا تعلق ان کے ایمان اور ایقان حق سے ہے۔ حق بات ہمیشہ اُن کی زبان پر بے ساختہ آتی تھی جس کے لیے انھیں اگرچہ سخت سے سخت اور بڑی سے بڑی مصیبت کا مقابلہ کرنا پڑا، وہ ڈٹ کے مقابلہ کرتے تھے اور اپنے ارادے پر اٹل رہتے تھے۔ آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنا تو جانتے ہی نہ تھے اس لیے انھیں ہمیشہ اپنے مقاصد میں کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ وقتی طور انھیں کالج انتظامیہ نے بہت تنگ اور پریشان کیا تھا۔ کیونکہ ہر ہنگامے اور ہر فتنے کے پیچھے انھیں حسرت کا ہی ہاتھ لگتا تھا اور وہ ہر یلغار کا سپہ سالار مولانا حسرت کو قرار دیتے تھے۔ دراصل ان کا پہچاننا اوروں کی نسبت آسان تھا اور ہر بار ان کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچا۔ اس نوع کے کئی واقعات یلدرم نے اس خاکے میں درج کیے تھے۔ صرف ایک واقعے کو میں بطور حوالہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ بقول یلدرم:

"شملے میں علی گڈھ کرکٹ ٹیم نے کسی انگریزی کلب سے بازی لی۔ علی گڈھ کالج کے بنی اسرائیل اس پر آپے سے باہر ہوگئے۔ ایک گروہ کثیر تمام آلات موسیقی جو کالج میں دستیاب ہو سکتے تھے۔ یعنی تھالیا، لوٹے، گلاس، کھانے کی پتیلیاں بجا بجا کر رات کی تاریکی میں شور محشر برپا کرتا پھرتا تھا فضل الحسن جنھوں نے اپنی عمر میں نہ کبھی بیٹ چھُوا تھا نہ گیند پھینکا تھا۔ یہ شور سنتے ہی ایک شکستہ حال کنستر لیے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور تیل کو حوالہ خاک کر کے سب سے آگے آگے اپنا کوس بجاتے ہوئے پروفیسروں حتیٰ کہ نواب محسن الملک مرحوم کی کوٹھی تک جا پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرد سیاہ میں جو پرنسپل کے دفتر کی میز کے داہنے خانے میں بند رہتی ہے ان کا نام لکھ لیا گیا۔"14

حسرت موہانی فطرتاً مشکل پسند تھے اس لیے

دشواریوں کا سامنا کرنے میں انھیں بڑا لطف آتا تھا۔ زمانہ طالب علمی سے لے کر ہندوستان کی کامل آزادی تک انھیں کتنی مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں اور انھیں کتنی بار جیل جانا پڑا۔ انھوں نے یہ سب برداشت کیا مگر اپنے ضمیر کا سودا کبھی نہیں کیا۔ ان حالات وواقعات سے وہ اکثر پریشان رہے لیکن خودداری، ایمانداری، سچائی اور غیرت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ انھوں نے اپنی آزادی کی دھن میں کبھی کسی کی مخالفت کی پروا نہیں کی بلکہ سچائی اور خلوص کے ساتھ اپنے کاموں میں لگے رہے جس کا جابجا اعتراف یلدرم نے اس خاکے میں کیا ہے:

حسرت موہانی بڑے ذہین اور طباع تھے۔ گھر کے ادبی ماحول نے ان کے لیے اردو شاعری سے دلچسپی کی راہیں پہلے ہی ہموار کر رکھی تھیں اور علی گڑھ کے ادبی ماحول نے اسے اور جلا بخشی۔ ان کے ساتھیوں میں سید سجاد حیدر یلدرم نے 15 مئی 1900 میں 'انجمن اردوے معلی' کی بنیاد ڈالی۔ حسرت اس انجمن کے بانی ممبران میں تھے۔ یلدرم کے بعد انجمن کا سکریٹری حسرت کو ہی بنایا گیا۔ اس انجمن کے پرچم تلے ہر ہفتے ایک ادبی نشست منعقد ہوتی تھی جس میں نظم ونثر کے پھول نذر کیے جاتے تھے۔ حسرت بھی اس انجمن کی اکثر نشستوں میں اپنی تخلیقات نثر ونظم پیش کرتے تھے۔ واقعی حسرت نے اس انجمن کی ترقی وترویج میں جس فراخدلی، جاں فشانی اور ذمے داری سے حصہ لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس حوالے سے یلدرم لکھتے ہیں:

''ایسی انجمن کی ترقی کے لیے مولانا سے بہتر رُکن کون ہوسکتا تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اردوے معلی اور مولانا ایسے لازم ملزوم ہوگئے کہ ایک کا خیال دوسرے کے بغیر ممکن ہی نہ معلوم ہوتا تھا۔ مولانا کی غزلیں مشاعرے کی جان اور ان کے مضامین مشاعرے کی روح رواں خیال کیے جانے لگے۔''[15]

حسرت موہانی کو نہ انگریزی زبان کے ساتھ لگاؤ تھا اور نہ ہی ریاضی وسائنس پڑھنے میں دلچسپی تھی۔ ''وہ بلا کے ذہین اور طباع تھے۔ درس کی کوئی انگریزی کتاب شاید انھوں نے دوسری مرتبہ نہیں پڑھی اور اس بارے میں مخالفین تعلیم انگریزی میں اور ان میں بس اتنا ہی فرق تھا کہ جہاں وہ قطعاً انگریزی پڑھنے کو کفر سمجھتے تھے یہ کسی صحیفہ فرنگ پر دوسری مرتبہ نظر ڈالنا گناہ جانتے تھے۔ اسی لیے ان کو کبھی انگریزی لکھنا یا بولنا نہ آیا۔ حقیقت میں ان کا میلان طبع اردو اور فارسی کی طرف تھا۔ سائنس وغیرہ علوم سے بھی ان کی طبیعت کو بیگانگی سی تھی اور گو ایک امر اتفاقی سے مجبور ہوکر انھوں نے بی۔ اے میں ریاضی پڑھی۔''[16]

دراصل وہ اردو اور فارسی کے عاشق اور دلدادہ تھے اور آزادی ہند کے سچے متوالے تھے۔ اس لیے بی اے پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کے بجائے انھوں نے اپنے آپ کو ملک وقوم کی خدمت وفلاح اور شعرو ادب کے فروغ کے لیے وقف کردیا۔ اپنے حصول مقصد کے لیے انھوں نے جولائی 1903 میں علی گڑھ سے اپنا مایہ ناز ادبی رسالہ 'اردوے معلی' جاری کیا۔ جس میں ادبی پھولوں کے ساتھ سیاست کے چبھتے ہوئے کانٹے بھی تھے۔ اس رسالے نے اردو صحافت کو زبان دی، آداب واخلاق سکھائے، شائستگی کے اصولوں سے ہمکنار کیا، شعر وادب کے نکات سے آشنا کیا، سیاست کو وسعتِ ذہن اور بلند نگاہی عطا کی۔ مگر شومیِ قسمت اپریل 1908 میں یہ رسالہ اس وقت بند ہوا جب اس میں اعظم گڑھ کے مشہور شاعر اور وکیل جناب اقبال سہیل کا ایک مضمون بعنوان 'مصر میں انگریزوں کی حکمت عملی' شائع ہوا۔ اس مضمون پر اس کے مصنف کا نام ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ حکومت حسرت سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ یہ مضمون کس کا لکھا ہوا ہے لیکن حسرت کی حمیت، غیرت اور دلیری نے اجازت نہ دی کہ مضمون نگار کا نام ظاہر کریں۔ برعکس اس کے انھوں نے اس واقعے کی ساری اور پوری ذمے داری اپنے سر لے لی۔ اس پر گورنمنٹ کی طرف سے مقدمہ چلا اور تقریباً دو سال کی قید بامشقت ہوئی۔ قید خانے میں حسرت نے وہ شعر کہا جو بے حد مقبول ہوا:

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

الغرض حسرت کا خاکہ اتنا جاندار اور معلومات افزا ہے کہ اس کے ذریعے ان کی شخصیت بھرپور انداز میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس خاکے میں یلدرم نے ان کے عادات، اطوار، مشاغل، معمولات اور افکار کے ساتھ ان کے مزاج کی سادگی، حوصلے کی بلندی، یقین کی استواری، حق پسندی، حق شعاری، جرأت، صداقت، خلوص، تقوٰی، ایثار، ہمدردی اور بے باکانہ اظہار رائے جیسی خوبیوں اور پہلوؤں پر بھی اظہار خیال کرکے خاکے کو توانا بنادیا ہے۔ نیز ہمدردانہ لہجے میں بشری کمزوریوں کے بیان نے خاکے کو متوازن بنایا ہے۔ ان تمام خوبیوں اور کمزوریوں کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کی حسرت اپنے اعمال، افکار، خیالات، نظریات، کردار، گفتار اور معاملات سے انسان تھے۔ فرشتہ نہیں۔

حواشی وحوالہ جات

1 'آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ' مرتب پروفیسر شمیم حنفی، ص16، ناشر: اردو اکادمی، دہلی
2 'ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی... کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی مرتب رشید حسن خان، ص7، 2009، ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی
3 'اردو کے بہترین شخصی خاکے (جلد اول) مرتب مبین مرزا ص13، جون 2005، ناشر: کتابی دنیا، دہلی
4 'یہ لوگ بھی غضب تھے' (خاکے اور شخصی مطالعے) از ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی، ص9، 1989، ناشر: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور، راولپنڈی، کراچی
5 اردو کے چند خاکہ نگار از قدرت اللہ شہزاد، ص9، 2007، ناشر: مکتبہ الہام، ماڈل ٹاؤن اے بہاول پور
6 یہ خاکہ رسالہ 'زمانہ' کانپور مرتب دیا نرائن نگم
7 بحوالہ رسالہ ماہنامہ 'برہان' دہلی مرتب سعید احمد اکبر آبادی، ستمبر 1962، ص177
8 'کار جہاں دراز ہے' (سوانحی ناول) از قرۃ العین حیدر، ص129، فصل سوم، جلد اول، 2003، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
9 مولانا محمد عارف ہنسوی نے سب سے پہلے مولانا حسرت موہانی پر ایک کتاب بعنوان 'حالات حسرت' 1918 میں لکھی۔ اس میں حسرت موہانی کی سوانح عمری اور مکمل حالات اسیری درج ہیں۔ یہ کتاب صدر دفتر انجمن اعانت نظر بندان اسلام، دہلی سے شائع ہوئی۔ لیکن اس سے دس سال قبل یلدرم نے حسرت پر خاکہ لکھا تھا۔ جو حسرت اور ان کی شخصیت پر نہ صرف پہلا خاکہ ہے بلکہ ان پر لکھی جانے والی پہلی تحریر بھی۔
10 حسرت کے عہد کا پس منظر از عتیق صدیقی مشمولہ سہ ماہی 'اردو ادب' نئی دہلی (حسرت نمبر) اڈیٹر: خلیق انجم، ص32-34، شمارہ 1 تا 4، ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی۔
11 شعر یلدرم از سید مبارز الدین رفعت، مشمولہ ماہنامہ 'پگڈنڈی' امرتسر (سید سجاد حیدر یلدرم نمبر) جلد 9، شمارہ 5، مدیر امریک سنگھ، ناشر: ادارہ گلوبستان اردو ہال بازار امرتسر، مرتب سید مبارز الدین رفعت۔
12 حسرت موہانی (ایک قدر دان کی نظر سے) از خافی خان (سید سجاد حیدر یلدرم) مشمولہ ماہنامہ 'زمانہ' کانپور مرتب دیا نرائن نگم، جلد 11، دسمبر 1908، ص292
13 ایضاً، ص 292-293
14 ایضاً، ص 293
15 ایضاً، ص 293
16 ایضاً، ص 296
17 ایضاً، ص 297
18 ایضاً، ص 294
19 ایضاً، ص 293

■

Irshad Afaqui
Assistant Professor Department of Urdu
Govt.Degree College Ajas Bandipora
Kashmir-193502 (J&K)
Cell.: 7780911279
Email:iafaqui80@gmail.com

فخر مالوہ عمیق حنفی

غلام حسین

ہندوستانی تہذیب وثقافت میں تین شاہکار، جمالیاتی فطرت کے مظہر ہیں۔ پہلا 'صبح بنارس' دوسرا 'شام اودھ' اور تیسرا 'شب مالوہ'۔ تاریخ میں ارض مالوہ کی عظیم الشان روایت رہی ہے۔ قابلِ فخر آرائے سلطنت کا تعلق اس سرزمین سے رہا ہے۔ اس خطۂ خاص میں علم و ادب کی ایسی لازوال اور باکمال ہستیاں عالم وجود میں آئیں جن کی آفاقیت مُسلّم ہے۔ شاعرِ اعظم کالیداس اور بھرتر ہری کی نسبت اسی خاک زریک (اُجین) سے ہے۔ یہاں امیر خسرو کے قیام کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے پیر بھائی مولانا مغیث الدین موج کا مستقر اُجین تھا اور یہیں وہ سپرد خاک ہوئے۔ آج بھی ان کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ عہد سلطنت میں شادی آباد (مانڈو) اور دورِ ریاست میں گلشن آباد (جاؤرہ) اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے اہم مراکز تھے۔ دستور ہند کے معماروں میں کلیدی کردار ادا کرنے والی مایہ ناز ہستی ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی جائے پیدائش ہونے کا فخر مہو کو حاصل ہے۔ ملک کے ایسے سپوت کی گرانقدر خدمات کے پیش نظر حکومت وقت نے اب 'مہو' کا نام تبدیل کر ڈاکٹر امبیڈکر نگر کر دیا ہے۔

جہاں تک اس علاقے میں اردو زبان کے ارتقائی سفر کا تعلق ہے تو ابتدائی اور تشکیلی دور سے ہی جو صورت حال برصغیر میں تھی تقریباً انھیں عوامل کی کارفرمائی بھی یہاں نظر آتی ہے۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہونے کے بعد اس زبان کی خوشبو پورے ملک میں پھیلنے لگی۔ جنگ آزادی 1857 کے بعد اس عمل میں اور تیزی آگئی۔ نواح دہلی اور مغربی یوپی کے باشندے جن کی زبان اردو تھی وہ جب انگریزوں کے ظلم و جبر کا شکار ہوئے تو اس کو جائے امن سمجھ کر یہاں آباد ہونے لگے اور اردو زبان و ادب کی شمع روشن کرنے لگے۔ یہاں کے والیان ریاست کو بھی فارسی اور اردو زبان سے بڑا لگاؤ تھا۔ ایسے سازگار ماحول میں اردو زبان کا اقبال بلند ہوا۔ تدریس اور دفاتر میں اس زبان کی اہمیت کا اعتراف کیا گیا۔ اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ مہو میں تعلیم کا معیار اس قدر بلند تھا کہ یہاں کے پرائمری اسکولوں کا شمار ایشیا کے نمبر ایک کی تعلیم گاہوں میں ہوتا تھا۔ جہاں موقر اساتذہ کا تقرر ہوتا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں حامد حسن قادری جیسی اردو کی نامور ہستی یہاں استاذ کے عہدے پر فائز تھی۔ آج بھی اس کے آثار باقی ہیں۔

مہو کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اندور سے متصل ایک غیر آباد ٹکڑا تھا جو جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ انگریزوں نے غالباً 1812 میں ایک معاہدہ کے تحت ہو لکر سے حاصل کیا اور عسکری ضروریات کے لیے استعمال کیا۔ انگریزوں کا یہ دور اندیشانہ لائحہ عمل تھا۔ انگریزوں نے اس کا نام مہو (MHW) رکھا جو مخفف Military Headquarters Of War. ہے برٹش حکومت میں اسے مرکزیت حاصل تھی۔ 1857 میں انگریزوں نے جنگ یہاں سے لڑی تھی۔ اس کی اتنی اہمیت تھی کہ ایک بار یہاں ونسٹن چرچل بھی آئے تھے جبکہ وہ محض ایک رپورٹر تھے...... یہ چھاؤنی اردو زبان کے لیے بڑی سود مند ثابت ہوئی۔ اس لحاظ سے اگر اسے دورِ جدید کا 'اردو بازار' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ سربرآوردہ دانشور، ادیب و شاعر عمیق حنفی کی پیدائش اسی مہو میں 3 نومبر 1939 کو ہوئی جو ان کا ننہیال ہے۔ یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور تخلیقی سفر کا یہیں سے آغاز ہوا۔ ان کا اصل نام محمد عبدالعزیز حنفی تھا جو دنیائے ادب میں عمیق حنفی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالبصیر تھا اور ان کے ماموں محمد یعقوب اپنے زمانے کے معروف وکیل تھے۔ اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں سے انھیں بڑی انسیت تھی۔ انھیں کے زیر سایہ ان کی تربیت ہوئی۔ بسلسلۂ ملازمت ان کے والد کی اقامت دیواس میں تھی حسن اتفاق وہ موسیقی کے نامی گرامی استاد رجب علی خان کے ہمسایہ تھے۔ عمیق جب اپنے والد سے ملنے جاتے تو استاد کے گھر بھی آنا جانا ہوتا۔ اس وقت وہ کم سن تھے۔ مگر اس چھوٹی سی عمر میں بھی وہ موسیقی کے استاد کی

> عمیق حنفی طبعاً بڑی جو شیلی، متحرک اور پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔ان کی ذہنی اور وجدانی دنیا میں جس طرح کا جوش اور جیسی توانائی دیکھنے میں آتی تھی۔ اس طرح کی فعالیت اور تب و تاب ان کی تخلیقی زندگی میں بھی نمایاں رہی۔

ریاضت اور مباحث سے ازحد متاثر ہوئے اور ایک موسیقار بننے کا خواب دیکھنے لگے۔ان کی اس دیوانگی پر والدہ سخت برہم ہوئیں چنانچہ انھیں یہ سلسلہ ترک کرنا پڑا مگر انھوں نے مشقِ سخن جاری کیا تو سُر، تال اور لے کے ادراک سے انھیں بڑی مدد ملی۔جب وہ اظہارِ خیال کرنے لگے تو سحر آفریں نغمگی سے ان کے الفاظ میں جان سی پڑ گئی۔

لکھنے پڑھنے کا شوق انھیں بچپن ہی سے تھا۔جب وہ مڈل اسکول میں زیرِ تعلیم تھے تبھی سے وہ اپنے خیالات کو قلم بند کرنے لگے تھے۔اسکول اور کالج کے زمانے میں ہی وہ ہندی میں کویتا لکھنے لگے تھے۔اخبار و رسائل میں ان کی کویتائیں چھپنے بھی لگی تھیں۔انھوں نے دو مضامین سیاست اور تاریخ میں ایم اے کیا اس کے بعد وہ اردو میں بھی شعر کہنے لگے۔رسائل میں کلام کی اشاعت اور نشستوں کی شرکت سے ان میں دن بہ دن اعتماد پیدا ہوتا گیا۔تکمیلِ تعلیم کے بعد مہو کے ایک مشنری اسکول میں وہ بحیثیت استاذ کام کرنے لگے۔اس وقت ان کا پہلا شعری مجموعہ ''سانسوں کا سنگیت (ہندی رسم الخط) میں شائع ہوا۔انھیں اردو زبان و ادب سے بہت شغف تھا۔غرضیکہ اردو میں طبع آزمائی کی شروعات کی تو خوب سے خوب تر انداز میں وہ آگے قدم بڑھاتے گئے اور ایک دن ان کا شمار صفِ اول کے فنکاروں اور قلم کاروں میں ہونے لگا۔انھوں نے تعلیم و تعلّم، تحریر و تقریر، مطالعہ و مشاہدہ اور مناظرہ کو اپنا وظیفۂ حیات بنالیا۔انھوں نے اپنی ذہانت، فطانت اور گہری بصیرت سے اہلِ علم و ہنر کو متاثر کیا۔ پروفیسر صادق ان کی تبحر علمی اور ہمہ دانی کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''وہ شعر و ادب کے علاوہ موسیقی، مصوری، رقص اور ڈراما وغیرہ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہندوستانی ادب، فلسفہ، تاریخ اور جمالیات پر ان کی گہری نظر تھی۔علم نجوم سے شغف رکھتے تھے۔ان کے عمیق مطالعہ اور گہری بصیرت کے مظہر وہ مضامین ہیں جو انھوں نے چھٹی دہائی میں مختلف موضوعات پر لکھے تھے۔مرحوم کو ہندی زبان و ادب پر بھی عبور تھا۔'' (ادب کے سروکار، ص 18)

پروفیسر قمر رئیس نے ان کی ادبی شخصیت کا تذکرہ بجا طور پر اس انداز میں کیا ہے:

''عمیق حنفی طبعاً بڑی جوشیلی، متحرک اور پہلودار شخصیت کے مالک تھے۔ان کی ذہنی اور وجدانی دنیا میں جس طرح کا جوش اور جیسی توانائی دیکھنے میں آتی تھی۔ اس طرح کی فعالیت اور تب و تاب ان کی تخلیقی زندگی میں بھی نمایاں رہی۔''

(ترقی پسند ادب۔پچاس سالہ سفر، مرتبہ قمر رئیس، عاشور کاظمی، ص 378)

عمیق حنفی نے اردو ادب کے میدان میں جس وقت قدم رکھا تو اس وقت بڑا سازگار ماحول تھا مگر فی زمانے کے تناظر میں اس صورت حال کا اندازہ لگایا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے ع

بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

جب وہ اندور ریڈیو اسٹیشن پر مامور تھے تو اس وقت اردو شعر و ادب کی ایک کہکشاں جلوہ گر تھی۔فخر مالوہ کرامت علی کرامت کے شاگرد چراغِ سخن جلائے ہوئے تھے۔فخر مالوہ ثانی شاداں اندوری بقید حیات تھے۔ڈاکٹر عزیز اندوری، ڈاکٹر مختار شمیم، رشید اندوری اور ڈاکٹر راحت اندوری سے بزم آراستہ تھی۔اندور سے متصل اُجین میں اشہر گوز، گویا قریشی، عطا الٰہی صدیقی، کاشف الہاشمی، حسرت قریشی، محمود زکی، محمود احمد سحر، پروفیسر عبد الباقی، پروفیسر اظہر راہی، پروفیسر وسیم الدین، پروفیسر خلیل احمد مشیر، پروفیسر آفاق حسین صدیقی جیسی ہستیاں محفلِ سخن کو بارونق بنا رہی تھیں۔ اس دور کی دو اور نامور ہستیاں پروفیسر صادق، پروفیسر عتیق اللہ تعلیم و تدریس کے ساتھ تخلیق کی طرف بھی قدم بڑھا رہے تھے گویا یہ حضرات اپنے وطن میں گمنام نہیں تھے اور غربت میں جا کے خوب چمکے۔اُجین سے اورنگ آباد کا ادبی سفر ایک منزل تھی۔ وہاں سے دلی بہت قریب ہوگئی۔ جہاں وہ اردو ادب کے مرکز نگاہ بن گئے۔ مذکورہ حضرات کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے احمد کمال پروازی، رشید امکان، پروفیسر واجد قریشی، ڈاکٹر مسیح الدین انصاری، ڈاکٹر شہناز قریشی، ڈاکٹر کشور سلطان، پروفیسر حدیث انصاری، ڈاکٹر مظہر محمود، پروفیسر فہمیدہ منصوری، ڈاکٹر ظفر محمود، ڈاکٹر عشرت ناہید وغیرہ اردو زبان کی آبیاری میں سربراہی فرما رہے ہیں۔ان میں سے کچھ حضرات اپنی ملازمت سے سبکدوش بھی ہوگئے ہیں۔

عمیق حنفی نے عملی زندگی کی شروعات تدریس سے کی مگر ان کی سیمابی اور متحرک طبیعت نے انھیں ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیا۔وہ زندگی بھر خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہے اور ستاروں پر کمند ڈالنے کی کاوش کرتے رہے۔ ان کے مزاج و معیار کے مطابق انھیں ریڈیو اسٹیشن کی افسری مل گئی تو ان کے خلاقانہ ذہن میں چار چاند لگ گیا۔ انھوں نے جدید ذرائع ترسیل سے بڑے کارآمد کام کیے۔ ان کی ذات سے اردو زبان کو بھی فائدہ پہنچا خصوصاً ریڈیائی ڈرامے کو انھوں نے ایک جہت دی۔ وہ خود بہترین ڈرامہ نامہ نگار تھے۔ ریڈیو پر ان کے پیش کردہ ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔انھوں نے اپنی ذہانت اور بصیرت سے اپنے فرائض کو ہنرمندی اور سلیقے سے نبھایا، اس میدان میں ان کی صلاحیت خوب صیقل ہوئی اور ترقی کے منازل طے کرتے گئے۔آل انڈیا ریڈیو بھوپال میں ایک اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے اپنے کریئر کا آغاز کیا۔

> عمیق حنفی کو اپنے وطن مالوف مہو سے بڑی انسیت تھی۔ عزیز و اقارب اور دوست و احباب سے انہیں والہانہ لگاؤ تھا۔اب تو ان کے دور کے لوگ اجل رسیدہ ہو گئے۔فقط عبد الهادی صاحب بقید حیات ہیں۔اس وقت ان کی بھی عمر 80 برس سے تجاوز کر گئی ہے مگر ہوش و ہواس درست اور یادداشت ماشاء اللہ۔ گوکہ عمیق حنفی اور ہادی صاحب کی عمر میں بڑا تفاوت تھا مگر ہم مشرب، ہم مسلک اور ہم ذوق ہونے کی وجہ سے دونوں صاحبان ایک روح دو قالب تھے۔

پروگرام ایگزیکٹیو ہوئے، آل انڈیا ریڈیو امبیکا پور اور لکھنؤ میں اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1984 میں اسٹاف ٹریننگ کے ڈائریکٹر منتخب ہوئے۔وہ بڑے ہر دلعزیز ڈائریکٹر تھے اور مرنجان مرنج شخصیت کے مالک تھے۔ 30 نومبر 1987 کو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ دورانِ ملازمت انھیں دل کا عارضہ ہوا۔ بائی پاس سرجری ہوئی مگر وہ مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو سکے اور 13 اگست 1988 کو انھوں نے دہلی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وہیں بستی حضرت نظام الدین میں فخر مالوہ پیوند خاک ہوئے۔

عمیق حنفی کو اپنے وطن مالوف مہو سے بڑی انسیت تھی۔ عزیز و اقارب اور دوست و احباب سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ اب تو ان کے دور کے لوگ اجل رسیدہ ہو گئے۔ فقط عبدالہادی صاحب بقید حیات ہیں۔ اس وقت ان کی بھی عمر 80 برس سے تجاوز کر گئی ہے مگر ہوش و ہواس درست اور یادداشت ماشاء اللہ، گو کہ عمیق حنفی اور ہادی صاحب کی عمر میں بڑا تفاوت تھا مگر ہم مشرب، ہم مسلک اور ہم ذوق ہونے کی وجہ سے دونوں صاحبان ایک روح دو قالب تھے۔ آج بھی ہادی صاحب سے ملاقات ہو جاتی ہے تو عمیق حنفی سے ان کی قربت کا اندازہ ہوتا ہے اور نصف الملاقات کا گمان ہوتا ہے۔ مہو سے عمیق حنفی کو جذباتی لگاؤ تھا۔ وہ اپنے حین حیات میں کہیں بھی رہے مگر وہ مہو کی یاد میں محو رہے۔ اس کا ذکر ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ ایک نظم میں وہ مہو کو اس طرح یاد کرتے ہیں۔

پہاڑوں کے احاطے میں یہ ذرا سا شہر
حسین پیالے کے مانند جگمگاتا ہے
انڈیلتی ہے شب مالوہ یہاں مئے نور
یہاں وہ لوگ جو اردو سکھائیں غیروں کو
یہاں وہ لوگ جو گونگوں کو بولنا سکھلائیں

عمیق حنفی کی شخصیت کثیر الابعاد تھی۔ انھیں اپنے دور کی تحریکات اور رجحانات سے غیر مشروط وابستگی تھی۔ وہ ترقی پسند بھی تھے اور 'حلقہ ارباب ذوق' کے ہمنوا بھی۔ طرفہ تماشا یہ کہ وہ جدیدیت کے سرگرم رضا کار بھی تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک روشن خیال دانشور تھے۔ وہ اپنی راہ کے راہی بھی تھے اور رہبر بھی۔ جدیدیت کے آثار ان میں 1958 سے نمودار ہونے لگے تھے۔ جب ان کا پہلا شعری مجموعہ 'سنگ پیرہن' منظر عام پر آیا تو ماہنامہ 'ادیب' کے مدیر کو یہ خدشے لاحق ہوا کہ عمیق حنفی ترقی پسند فکر و شعور سے کہیں دور تو نہیں ہو گئے ہیں۔ اس کا ازالہ انھوں نے اپنے ایک مراسلہ میں کیا جو نومبر 1958 کے ماہنامہ ادیب میں شائع ہوا اس سے ان کے زاویہ نظر کا اندازہ ہوتا ہے:

''میں نے ترقی پسندی کو اپنا ذہنی فکری مسئلہ اور جمالیاتی مذہب مانا ہے اگر مارکسی جمالیات کی صحیح تصویر سامنے رکھی جائے تو شاعری میں ادب کی ترقی پسندی کے درشن آپ کو ضرور ہوں گے ترقی پسند فکر میری شاعری کے رگ و ریشے میں سمائی ہوئی ہے۔''

اس کے علاوہ یہ بھی حوالہ ملتا ہے کہ جب 1967 میں علی گڑھ یونیورسٹی نے جدیدیت کے عنوان پر ایک سیمینار منعقد کیا تو اس میں شرکت سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ اس وقت کے نامور ادیبوں نے ان کی ترقی پسندی کا اعتراف کیا ہے۔

رومانیت اور انانیت کی آمیزش سے متشکل عمیق حنفی کی تہہ دار شخصیت کی صراحت ایک مشکل امر ہے۔ ایک طرف وہ ترقی پسندی سے دست بردار نہیں تھے تو دوسری طرف اگر ہم ایک کوہ قامت ترقی پسند ادیب اور دانشور پروفیسر احتشام حسین سے ان کی محاربہ آرائی اور معرکہ آرائی کو پیش نظر رکھیں تو وہ جدیدیت کے سالار کارواں نظر آتے ہیں۔ جدیدیت اور ترقی پسندی کے مابین مکالمہ کو مناقشہ بنانے میں 'سوغات' اور 'شب خون' کا بڑا ہاتھ رہا ہے، جس کی حمایت میں شمس الرحمٰن فاروقی اپنی کمک کے ساتھ میدان جنگ میں اتر آئے۔ یہ بھی سچ ہے کہ فاروقی صاحب، عمیق حنفی کے فکر و فلسفہ، دانشوری، علمیت اور تخلیقات کے قائل ہی نہیں بلکہ گرویدہ تھے۔ وہ تو انھیں اپنا 'پیر و مرشد' گردانتے تھے۔ لیکن 1983 میں 'شعر چیزے دیگر است' پر اردو اکیڈمی یو پی نے انھیں ڈیڑھ ہزار کا انعام دیا۔ علی الرغم اس سے بڑا انعام شمس الرحمٰن فاروقی کو دیا گیا۔ جس سے ان کی خودداری کو ٹھیس پہنچی اور انھوں نے وہ انعام ٹھکرا دیا۔ یقیناً اس وقت عمیق حنفی کا ادبی قد بہت بلند تھا مگر نہ جانے ارباب حل و عقد کس مصلحت کے شکار ہوئے۔ ان عوامل سے ان کے ادبی معیار کے شایان شان ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ ان کی جائے پیدائش کے صوبہ مدھیہ پردیش کی اردو اکادمی نے انھیں ایک حقیر سا انعام دے کر ٹرخا دیا۔ عمیق حنفی کا الف ہو ناحق بجانب تھا۔ ممکن ہے شدید قسم کی جدیدیت سے گریز کا یہ سبب بھی ہوا ہو۔ خیر کچھ بھی ہو اس مناظرے اور مذاکرے سے اردو ادب کو بڑا فائدہ پہنچا۔ افکار اور اظہار میں جمہوریت آئی۔ علاوہ ازیں دو بلند قامت ادیبوں اور دانشوروں کے تبحر علمی اور وزن و وقار کا اندازہ اہل علم کو ہوا۔ اس بحث کو سمجھنے کے لیے قارئین کو 'شب خون' میں شائع شدہ خطوط کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اردو ادب میں عمیق حنفی کی شعر گوئی کی ابتدا 1952 میں ہوئی۔ اس میدان نے انھوں نے بڑے طمطراق سے قدم رکھا۔ چھ سال کی مدت میں ہی ان کا پہلا شعری مجموعہ 'سنگ پیرہن' 1958 میں منظر عام پر آیا۔ انھوں نے اپنی بات میں جو اظہار خیال کیا اس سے ان کی شاعری کی سمت و رفتار، میلانات، رجحانات اور ترجیحات کا اندازہ ہوتا ہے:

''میری شاعری میں آپ کو ہندستانی بالخصوص مالوے کی فضا ملے گی بعض ایسے الفاظ تشبیہات و تلمیحات ملیں گے جنھیں ہندی یا ہندوی کہا جا سکتا ہے۔ میں اپنی شاعری کی آفاقیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنے دیس کے آب و گل سے رنگ و روغن حاصل کر کے اس کی اجنبیت ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے کلام میں آپ کو کہیں کلاسیکی اور کہیں رومانی کہیں انقلابی کہیں تجرباتی عناصر نظر آئیں گے لیکن ایک اور بات نظر آئے گی کہ میرا ذہنی مسلک ترقی پسندانہ ہے۔''

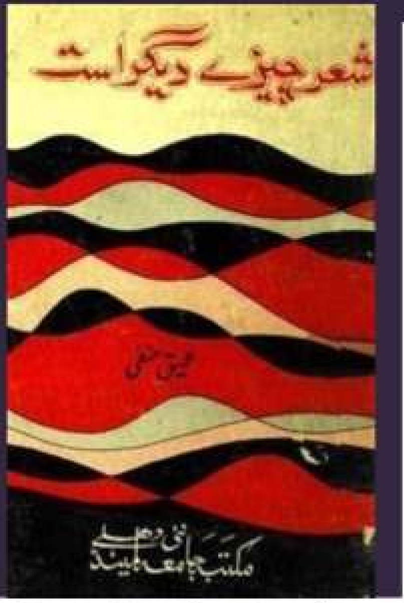

عمیق حنفی کا دوسرا شعری مجموعہ 'شب گشت' 1969 میں شائع ہوا۔ اس میں کئی نظمیں مختلف موضوعات پر بدلے ہوئے رویے کے ساتھ ملتی ہیں۔ اس میں اشکال اور ابہام نہیں ہے۔ سائنسی اور مشینی دور کے شور و شرابے سے عاجز آکر وہ ماضی کی طرف لوٹ جانے کے متمنی ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

اپنے کھنڈر چھوڑ کر آؤ چلو میدان میں
اس طرف وہ جھاڑیوں کا جھنڈ ہے حجلہ نما
آؤ اس میں چل کر ہم ایک دوسرے کو دیکھ لیں
اور دیکھیں پتھروں کے یگ میں کیسا پیار تھا

عمیق حنفی کا تیسرا مجموعہ کلام 'شجر صدا' 1975 میں شائع ہوا۔ ان کے شعری مجموعوں میں نظموں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ طویل نظموں میں سند باد، شہزاد، سیارگان، شب گشت، کیوپیڈیا، بصورت ناقوس، ویت نام، سبز آگ، صلصلۃ الجرس ہیں۔

صلصلۃ الجرس، عمیق حنفی کی ایک معرکۃ الآرا طویل نظم ہے۔ اس نظم میں رسولؐ کی سیرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کتابی شکل میں پہلی بار یہ نظم 1971 میں نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان، حیدرآباد سے شائع ہوئی اور مقبول خاص و عام ہوئی۔ یہ روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے حضور اکرمؐ سے یہ استفسار کیا کہ وحی کیسے آتی ہے تو رسولؐ نے فرمایا کہ مثل صلصلۃ الجرس (گھنٹی کی خوبصورت آواز) اسی عنوان کا شاعر نے انتخاب کیا ہے۔ اس میں درجنوں

ذیلی نظمیں ہیں۔ یہ نظم 1433 مصارع پر مشتمل ہے۔ اس رعایت سے کہ 1390 ہجری میں جب یہ نظم پایۂ تکمیل کو پہنچی تو قمری حساب سے 1443 میلادی چل رہا تھا۔ اس نظم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب چودھویں صدی کی تقریب منائی جارہی تھی تو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم قاری طیب صاحب نے انھیں اپنے ادارے میں مدعو اور ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔ جس وقت وہ 'صلصلۃ الجرس' لکھ رہے تھے تو اس وقت انھیں تصوف سے گہرا شغف ہوگیا تھا اور ان پر ایک مجذوبیت کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ ''بارہویں، تیرہویں صدی کا صوفیا کا طریقۂ تبلیغ وترسیل'' پر مقالہ تحریر کررہے تھے۔ عہد حاضر میں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ اس میں اتنی وسعت اور بصیرت ہے کہ اسے مدو جزر عالم کہا جاسکتا ہے۔

عمیق حنفی کے یہاں غزل کی حیثیت تنگ نائے ظرف کی ہے۔ پھر بھی ان کے مجموعوں میں غزل کے اچھے اشعار مل جاتے ہیں مثلاً ؎

دیکھا تھا ہم نے جس کو سر شام راہ میں
چہرہ وہ ساری رات نظر میں پھرا کیے
محفل میں اپنی بات پہ ناراض ہی سہی
تنہائی میں وہ اپنا کہا مانتے تو ہیں
عمیق چھیڑ غزل، غم کی انتہا کب ہے
یہ مالوے کی جنوں خیز چودھویں شب ہے
کبھی حرم میں ہے کافر، تو دہر میں مومن
نہ جانے کہاں دل دیوانہ تیرا مذہب ہے
رکھے ہیں داغ بھی اشعار کی جبینوں پر
کرم یہ کم نہ کیا اپنے نکتہ چینوں پر

بہرکیف عمیق حنفی کا شمار عہد حاضر کے صفِ اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں مقامی احساس وجذبات کی عکاسی ہنرمندی سے کرتے ہیں اور اس میں آفاقیت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ وہ اپنے فن میں یگانۂ روزگار ہیں۔ دانشوروں اور ناقدوں نے ان کی شاعری کو کسوٹی پر پرکھا ہے اور انھیں ایک مستحسن شاعر قرار دیا ہے۔ معروف ناقد پروفیسر شمیم حنفی ان کے ہم دم وراز داں تھے اور ان کے کلام کے مداح بھی۔ انھوں نے ان کی حیات وشاعری کا مطالعہ ومشاہدہ بہت قریب سے کیا تھا۔ ان کی شاعری کے متعلق انھوں نے اپنی رائے کا اظہار بڑے ہی مدلل ومتوازن انداز میں کیا ہے جو ان کی شخصیت اور شاعری کا سرنامہ ہے:

''عمیق حنفی کے یہاں ایک غیر معمولی صلاحیت خود کو گردوپیش کی دنیا میں جذب کردینے کی تھی۔ ان کی شخصیت اور شاعری کا حصار کبھی ٹوٹا نہیں۔ عمیق حنفی نے زندگی کو اپنی شرطوں پر گزاری اور شاعری میں ہمیشہ ان تقاضوں کے پابند رہے جو ان کی سرشت کا حصہ تھے۔ یہ شاعری زندگی کے ایک مخصوص اسلوب سے بندھی ہوئی تھی اور زندگی کا اسلوب ہمیشہ فکر وجذبے کے ایک مخصوص اسلوب کی تحلیل میں رہا... ایک وصف جو ہماشما سے الگ صرف غیر معمولی انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک طرح کے درویشانہ استغراق اور جستجو کے انہماک کا عمیق اس سے بھی متصف تھے۔'' (پیش لفظ، انتخاب اردو اکادمی دہلی)

شاعری کے ساتھ ساتھ انھیں نثر نگاری میں بھی یکساں قدرت حاصل تھی۔ خصوصاً تنقید کے میدان میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کا شمار ممتاز ترین ناقدین میں ہوتا ہے۔ مشرقی شعریات پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ شعروادب کی روایات اور رجحانات سے کما حقہ واقف تھے۔ جب وہ شاعری کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں تو ابتدائے آفرینش کے تذکرے سے قاری کو مبہوت کردیتے ہیں۔ شعر کے وجود سے پہلے قدرتی مناظر آلات وحربات کی آواز سے موسیقی کیسے پیدا ہوئی؟ اور اس سے سُر وتال کی ترتیب کس طرح ہوئی آگے چل کر الفاظ شعری قالب میں کیسے ڈھلنے لگے؟ ان سب منبع ومخرج کو بڑے نکتہ رس انداز اور گہری بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے لفظ دانائی کے آب دار موتی بن جاتے ہیں اور جملوں میں تاریخ وتہذیب اور شعروادب کے عرفان وادراک کا دریا موجزن ہوجاتا ہے۔

1965 کے آس پاس عمیق حنفی بڑے دھماکہ خیز انداز میں تنقید کے میدان میں وارد ہوئے۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعے اور تنقیدی بصیرت سے ارباب علم و ادب کو متحیر کردیا۔ اس دوران ترقی پسندی اور جدیدیت کے مابین معرکہ آرائی شروع ہوگئی تھی اور شعروادب کا نیا منظرنامہ ترتیب وتشکیل پارہا تھا۔ جدید شاعری کی حمایت میں ان کے عالمانہ بصیرت افروز مباحث کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ مگر وہ اپنی اس طرز فکر کی وجہ سے جدیدیت کی علامت پرستی کے جال سے بہت جلد نکل آئے اور صلاح الدین پرویز کی نظم 'ژاژ' کے متعلق انھوں نے یہ فرمایا کہ

> **اردو شعرو ادب میں عمیق حنفی کو امتیازی اور انفرادی حیثیت حاصل ہے۔انھوں نے اپنے زریں خیالات وسحر آفریں تخلیقات سے ادب کے اثاثے میں اہم اضافہ کیا ہے جسے اہل ہنر نے نظر استحسان سے دیکھا ہے۔وہ اپنے اعلیٰ و ارفع ادبی و شعری اکتشافات، کمالات و فتوحات کے پیش نظر نہ صرف 'فخر مالوہ' ہیں بلکہ دنیائے اردو ادب میں بھی باعث افتخار ہیں۔**

''یہ ہمارے معاشرہ میں کسی دوسرے سیارے سے آئی اڑن طشتری کے مانند ہے جو معاشرہ کے آدمی سے رابطہ قائم نہیں کرتی۔'' انھوں نے علامت پرستی کے متعلق کہا ''میں علامت پرست نہیں میرا خیال ہے کہ علامت پرستی بت پرستی پیدا کرتی ہے۔ وہ اردو تنقید کی بے راہ روی سے ناخوش نظر آتے ہیں اور تنقید کی موجودہ صورت حال پر وہ اس طرح طنز کرتے ہیں:

''اردو میں بھی تنقید کے مزے آگئے۔ نقاد نے کہنے اور لکھنے والے اور سننے اور پڑھنے والے کے درمیان مفاہمت کا پُل تعمیر کرتے کرتے ٹرافک کے سپاہی کا رول ادا کرنا شروع کردیا اور اردو کا نقاد شعروادب کے راہ گیروں کا خضر راہ بن بیٹھا۔''

عمیق حنفی نظریہ ساز نہیں بلکہ نظر ساز نقاد ہیں۔ وہ ''اے روشنی طبع کہ برمن بلا شدی'' کے مصداق زندگی بھر بنے رہے۔ دراصل ان کی تخلیق اور تنقید ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ان کی شاعری میں جو روایت سے بغاوت اور نئے تجربات کی جسارت ہے وہی تنقید میں بھی جلوہ گر ہے۔ وہ نعرے بازی اور نقالی کے سخت مخالف ہیں۔ وہ ناقدین اردو کے اس رویے سے نالاں ہیں کہ بات بات پر مغرب کے بڑے بڑے نقادوں کے قول کو ترپ کے پتوں کی طرح استعمال کرتے ہیں جبکہ اپنی زمین کی شاندار روایت موجود ہے۔ ان کی تنقید مشرقی شعریات پر مبنی ہے وہ شعری تخلیق میں موسیقی، رقص، رس، دھون کو معاون سمجھتے ہیں۔ وہ شعریات کو نئے زمانے کے تقاضے کے تحت ڈھالنے کے خواہاں ہیں۔ انھیں مروجہ عروض وبحر کی تبدیلی میں بھی آر نہیں۔ تنقید کے باب میں ''شعر چیزے دیگر است'' اور ''شعلے کی شناخت'' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اردو کے اس شعلہ جوالہ کو ناوقت موت نے شعلۂ مستعجل بنا دیا ورنہ اس انقلاب آفریں شخصیت سے اردو تنقید میں مثبت تبدیلی متوقع تھی۔

فی الجملہ اردو شعروادب میں عمیق حنفی کو امتیازی اور انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے زریں خیالات وسحر آفریں تخلیقات سے ادب کے اثاثے میں اہم اضافہ کیا ہے جسے اہل ہنر نے نظر استحسان سے دیکھا ہے۔ وہ اپنے اعلیٰ وارفع ادبی وشعری اکتشافات، کمالات وفتوحات کے پیش نظر نہ صرف 'فخر مالوہ' ہیں بلکہ دنیائے اردو ادب میں بھی باعث افتخار ہیں۔

■

Dr. Ghulam Husain
Head, Dept. of Urdu
Govt of Madho College
Ujjain - (MP)
Mob.:9893853183

محمد اکرم السلام اعظمی

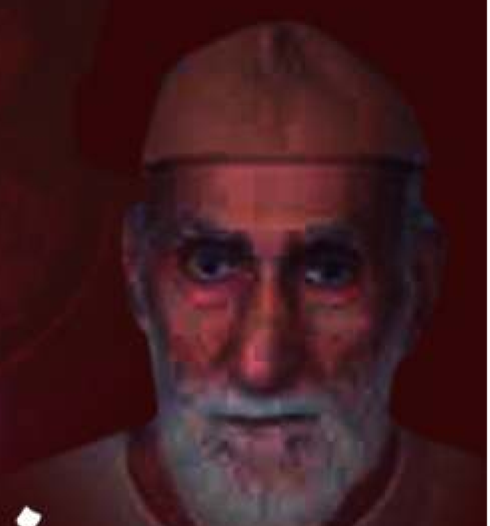

پروفیسر فارق اور عربی اردو ترجمہ نگاری

(عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان کے خصوصی حوالے سے)

❞ ابتدائی عملی زندگی میں پروفیسر فارق نے مسلسل دس سال تک اینگلو عربک کالج دہلی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1953 میں ان کا تقرر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی میں بہ حیثیت ریڈر ہوگیا۔ بعد ازاں وہیں پر 1972 میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئے اور 1985 میں یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔ پروفیسر فارق کے امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی رہا ہے کہ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے وہ اولین ریڈر اور سب سے پہلے پروفیسر بنائے گئے۔ ❝

بیسویں صدی عیسوی کو علمی و ادبی سرگرمیوں کی معراج قرار دیا جاتا ہے۔ علمی اکتشافات، ادبی تخلیقات، سیاسی و معاشی نظریات اور نوع بہ نوع تحریکات کا جتنی کثرت، وسعت اور شدت سے اس صدی نے مشاہدہ کیا ہے، اتنا شاید دنیا نے کبھی نہ دیکھا ہو۔ خود ادب کے مختلف گوشوں اور متعدد اصناف و فنون کی دریافت و بازیافت اسی صدی کی مرہونِ منت ہے۔ جہاں تک فن ترجمہ کا تعلق ہے تو بلاشبہ وہ اس صدی کی پیداوار تو نہیں ہے تاہم عربی اور اردو زبانوں کے حوالے سے بڑے وثوق و اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ طبع زاد کاوشوں کے ساتھ اس دوران میں جس قدر لٹریری ذخیرہ ترجمے کے راستے اہل علم تک پہنچا ہے وہ بہت بے مثال ہے۔ تاریخ ادب عربی کے دور جدید نے جن گوناگوں نئے فنون و مضامین سے عربی دنیا کو روشناس کرایا ہے: شاید کچھ ایسی ہی خدمات علی گڑھ تحریک، سرسید کے رفقا، اردو زبان وادب کے عناصر خمسہ اور حیدرآباد کے دارالترجمہ نے اردو کے حوالے سے انجام دی ہیں۔ چنانچہ 'دور تراجم' کے مصنف احمد فخری بجا طور پر کہتے ہیں کہ:

''اس دور میں سب سے ممتاز اور نمایاں کام ترجمہ ہی نظر آتا ہے اور اگر اسے ترجمہ کا دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔'' (دور تراجم، ص 593)

حامدی کاشمیری نے بھی کہا ہے کہ ''بیسویں صدی کو تراجم کی صدی قرار دیا جائے تو درست ہوگا۔''

پروفیسر خورشید احمد فارق (پیدائش 1916، وفات: 2001) بھی اسی بیسویں صدی کا ایک روشن نام ہے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم انھوں نے اپنے والد گرامی مولانا محمود حسن سے حاصل کی تھی جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور گورنمنٹ انٹر کالج اٹاوہ میں عربی و فارسی زبانوں کے استاذ تھے۔ ہائر سکنڈری کے بعد فارق صاحب کا داخلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوگیا جہاں سے انھوں نے عربی زبان وادب میں گریجویشن، پوسٹ گریجویشن اور پی ایچ ڈی کی اعلی ڈگریاں حاصل کیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہاں کے شعبۂ عربی میں نادرۂ روزگار شخصیت پروفیسر عبدالعزیز میمنی علم و دانش کی قندیل فروزاں کیے ہوئے تھے۔ انھی کے زیرِ نگرانی 1945 میں فارق صاحب نے 'زیاد بن ابیہ' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ ترتیب دیا تھا۔

ابتدائی عملی زندگی میں پروفیسر فارق نے مسلسل دس سال تک اینگلو عربک کالج دہلی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1953 میں ان کا تقرر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی میں بہ حیثیت ریڈر ہوگیا۔ بعد ازاں وہیں پر 1972 میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہوئے اور 1985 میں یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے۔ پروفیسر فارق کے امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی رہا ہے کہ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے وہ اولین ریڈر اور سب سے پہلے پروفیسر بنائے گئے۔

پروفیسر فارق نے کل 42 سالوں تک تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ ظاہر ہے چار دہائیوں سے بھی زیادہ اس طویل زمانے میں بے شمار طلبہ اور تشنگان علم ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہوں گے لیکن ان کی زندگی کا نہایت روشن باب ان کا بے پایاں علمی انہماک اور مطالعہ کا تسلسل اور پابندی تھی۔ جس کا واضح ثبوت ان کے نوک

قلم سے نکلی ہوئی دو درجن سے زیادہ کتابیں ہیں جن میں تنہا ان کے جائزوں کے سلسلے کی انیس جلدیں ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی سترہویں جلد ہے جس کی پروفیسر محمد نعمان خان نے تحقیق کی ہے اور ترتیب و تصحیح کے بعد 2014 میں اسے از سر نو شائع کیا ہے۔ ان کی صراحت کے مطابق اس سلسلہ کی 13ویں، 18ویں اور 19ویں جلدیں مفقود ہیں (ص 5 تمہید) البتہ موجود سولہ جلدوں کے صفحات کی جو تعداد انھوں نے شمار کرائی ہے اس کے اعتبار سے کل صفحات کی مجموعی تعداد 6388 پہنچتی ہے جن میں ڈیڑھ سو سے زائد عربی مصادر و مراجع کا درجہ رکھنے والی کتابوں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ تنہا اسی سلسلے کے صفحات کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ بارہا لوگ پوری زندگی بہ مشکل اتنے صفحات کو پڑھ پاتے ہیں: انھیں قلم بند کرنا تو بہت بڑی دور کی بات ہے۔

جائزے کے علاوہ فارق صاحب کی سولہ اور تصانیف ہیں۔ ان میں عربی ادب کی تاریخ پر مشتمل دو جلدیں انگریزی زبان میں ہیں۔ اسی طرح ان کا تحقیقی مقالہ زیاد بن ابیہ بھی، جسے دہلی یونیورسٹی نے شائع کیا تھا، انگریزی زبان میں ہے۔ تین کتابیں عربی زبان میں ہیں اور باقی تمام کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اردو زبان میں لکھی جانے والی فارق صاحب کی بیشتر کتابیں 'ترجمہ' ہیں۔ چنانچہ تین کتابیں جو بالترتیب تین خلفاء راشدین حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط پر مشتمل ہیں، ظاہر ہے عربی سے ہی ترجمہ ہیں ایک اور کتاب 'اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں' بھی اصلاً مقدسی کی 'أحسن التقاسيم في معرفة الأقاليم' کے اہم حصوں کا ترجمہ ہے۔ ان کی مشہور کتاب 'تاریخ الردۃ' بھی دراصل کلاعی بلنسی کی کتاب 'الاكتفاء بما تضمنه من مغازي رسول الله و الثلاثة الخلفاء' کے ان منتخب اقتباسات کی تحقیق و تدوین ہے جن کا تعلق فتنۂ ارتداد سے تھا، پھر انہی کا اردو ترجمہ کرکے الگ سے بھی شائع کیا۔ اسی طرح 'عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان' فارق صاحب کی ایک نہایت مہتم بالشان کتاب ہے۔ یہ کتاب بھی درحقیقت کم و بیش 30 مختلف عربی مراجع و مصادر کے موضوعاتی انتخاب کا اردو ترجمہ ہے۔

جہاں تک 'جائزوں' کا تعلق ہے تو بلاشبہ وہ ڈیڑھ سو سے زیادہ عربی علمی و ادبی ذخائر کا تجزیاتی مطالعہ اور ان پر تبصرہ ہے تاہم ان میں بھی معتد بہ حصہ ترجموں پر مشتمل ہے، چنانچہ پہلی جلد کے مقدمے میں خود لکھتے ہیں:

''جائزے کے لیے میں نے عربی کی بنیادی، قدیم اور مستند کتابیں منتخب کی ہیں۔''

آگے مزید لکھتے ہیں:

''ان ضخیم کتابوں کی نئی، اچھوتی اور قدر و قیمت کی حامل بہت سی معلومات کا میں نے جائزے میں ترجمہ دے دیا ہے تاکہ قاری میری طرح ان سے مستفید ہوسکے اور اپنے موجودہ معتقدات کو تحقیق کی مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے پر قادر ہوجائے۔'' (مقدمہ جلد اول)

اسی خیال کا اعادہ کرتے ہوئے چوتھی جلد کے اندر مزید صراحت کرتے ہیں کہ:

''جائزے والی کتابوں کے قدر و قیمت کے حامل، معلومات افزا یا اچھوتے بیانات کا اردو میں ترجمہ بھی کردیا گیا ہے تاکہ قاری کتاب کے اہم محتویات سے آشنا ہوجائے۔'' (مقدمہ جائزہ حصہ چہارم، صفحہ الف)

گرچہ فارق صاحب نے اپنی بہت سی طبع زاد تخلیقات سے بھی علمی دنیا کو مالا مال کیا ہے تاہم ان کے اکثر و بیشتر کاموں کو ہم ترجمے کے خانے میں رکھ سکتے ہیں۔ ان کے ان تراجم کے صفحات کی تعداد اس قدر بڑی اور پھیلی ہوئی ہے کہ بلاخوف تردید ہم انھیں بیسویں صدی کے عظیم مترجمین میں شمار کرسکتے ہیں اور اگر ہم ان کے تراجم کے موضوعات کا احاطہ کریں تو اس اعتبار سے یہ بھی کہنے کی جسارت کی جاسکتی ہے کہ اپنے منتخب موضوعات کے تنوع اور کثرتِ مراجع کے حوالے سے وہ عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے والے ایک عظیم ترین مترجم ہیں۔

فارق صاحب کے ان تمام تراجم میں 'عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان' کو شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی سے 1973 میں طبع ہوئی ہے۔ فہرست اور انڈکس کے علاوہ کتاب کے صفحات کی تعداد 324 ہے۔ اس کے اندر تقریباً 190 موضوعات کے تحت مختلف عربی مصادر کے اقتباسات کے اردو تراجم نہایت مربوط انداز میں اور بڑے سلیقے سے درج کیے گئے ہیں۔ اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ کتاب موضوعاتی ہے، اس میں محمود غزنوی سے پہلے یعنی نویں دسویں صدی عیسوی تک کے ہندوستان کے مذہب، تمدن، علوم، تاریخ اور تجارت وغیرہ سے متعلق عرب مؤلفوں کے بیانات کو یکجا کیا گیا ہے اور ان کا بامحاورہ اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مقدمے میں فارق صاحب نے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ:

''جہاں تک ہمیں معلوم ہے اردو زبان میں پرانے ہندوستان کے تمدن، مذہب اور علوم کے بارے میں عربی تحریروں کا اب تک کوئی تفصیلی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔'' (ص 11 مقدمہ)

کتاب کی تدوین کے زمانے تک اردو زبان میں اس موضوع پر ہونے والے کاموں کا جائزہ اپنے مقدمے میں فارق صاحب نے یوں لیا ہے:

''اردو کی دو تین کتابیں جو پچھلے تیس چالیس سال میں اس موضوع پر سپرد قلم کی گئی ہیں۔ ان میں عربی تحریروں کے معدودے چند ادھورے اور غلط ترجمے یا خلاصے ہی پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں نہ تو مماثل موضوعات سے متعلق ساری اہم تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے، نہ ان میں ترجمے کی صحت کا اہتمام ہے، نہ تحریروں کی معلومات کو پرکھا گیا ہے کہ وہ کس حد تک درست ہیں اور تحقیق کی میزان میں ان کا کیا مقام ہے۔'' (ص 11 مقدمہ)

واضح رہے کہ فارق صاحب کی اس کتاب سے قبل دارالمصنفین اعظم گڑھ سے مطبوعہ کتاب 'ہندوستان عربوں کی نظر میں' چھپ کر عام ہوچکی تھی۔ اوپر کے اقتباس میں جن کمیوں اور خامیوں کی طرف فارق صاحب نے اشارے کیے ہیں غالباً ان کا ایک ہدف یہ کتاب بھی رہی ہوگی۔ مذکورہ اقتباس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ فارق صاحب نے عربی مصادر سے نقل و انتخاب اور ترجمے میں تنقید اور پرکھ و معیار پر جانچا اور پرکھا ہے، مثلاً ایک گفتگو ملاحظہ ہو۔

عربی مصادر میں کوکن کے علاقے میں بلہرا راجہ کے بعد راجہ تکا کا ذکر ملتا ہے جس کے لیے عربی مصادر میں 'طافن' کا لفظ لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس لفظ کی تحقیق پیش کرتے ہوئے فارق صاحب رقم طراز ہیں:

''طافن یا سافن اور اس کا مسمی بہت سے لوگوں کے لیے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ مرحوم مولانا سلیمان ندوی اور ان کے متبعین 'طافن' اور 'سافن' کو دکن کی تحریف قرار دیتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے۔ یہ دونوں لفظ طاقی کی تحریف ہیں۔ طاقی یا طافی مسعودی کی تحریروں میں بھی موجود ہے۔ طاقی، تاکا یا تکا بتشدید الکاف کی تحریف ہے۔ تکا ایک قوم کا نام ہے جو قدیم زمانے میں پنجاب کے زیریں پہاڑوں اور میدانوں میں حکمراں تھی۔ اسی مناسبت سے ان کی قلم رو کا نام تکادیس پڑ گیا ہے۔ تکادیس کا مہابھارت میں بھی ذکر ہے۔ پرانے زمانے میں تکا قوم سارے پنجاب پر چھائی ہوئی تھی۔'' (ص 135 حاشیہ نمبر 4)

اسی طرح 'پرانے ہندوستان' کے زیر عنوان مسعودی کے ایک طویل اقتباس کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے علم نجوم کی مشہور کتاب 'سدھانت' کا ذکر کیا ہے۔ مسعودی نے سدھانت کا مطلب 'دھرالدھور' یعنی سب سے بڑا زمانہ بتایا ہے۔ چنانچہ فارق صاحب نے یہاں ایک اہم توضیحی حاشیہ لکھا ہے، جس میں وہ رقم طراز ہیں:

''سوائے بیرونی کے سارے عرب مصنف یہی سنے سنائے معنی لکھتے چلے آئے ہیں، جو غلط ہیں۔ سدھانت ریاضی یا نجوم کے ایسے کام کو کہتے ہیں جو علمی بنیادوں پر قائم ہو اور اغلاط سے پاک ہو۔'' (صفحہ 31 حاشیہ نمبر 1)

اسی طرح بعض عربی متون میں واقع تصحیفات کی جانب بھی فارق صاحب نشاندہی کرتے ہیں مثلاً ابن رستہ کی ایک عبارت 'لا یشتری ما ارتفاعه خمس اذرع' کی اصلاح کرتے ہوئے اسے 'الا ما ارتفاعه' قرار دیتے ہیں۔ (ص 142)

فارق صاحب نے خود اپنے تراجم کو بامحاورہ بتایا ہے۔ بلاشبہ ان کا یہ دعویٰ درست ہے۔ اس حوالے سے یہاں پر دو ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مقدسی کی کتاب 'البدء والتاریخ' کی ایک عبارت ''ومنهم المصفدة قوم يصفدون أوساطهم الى ظهورهم بالحديد قالوا لئلا ينشق بطونهم من غلبة الفكر وكثرة العلم" ہے۔ اس کا ترجمہ فارق صاحب کرتے ہیں ''وجود خالق کے قائل لیکن رسول کی بعثت کے منکر برہمن فرقوں میں سے ایک فرقہ مصفدہ ہے۔ یہ لوگ لوہے کی زنجیر سے کمر تا پشت اپنا جسم جکڑ لیتے ہیں تا کہ کثرتِ علم اور ریاضت فکر سے ان کا پیٹ نہ پھٹ جائے۔'' (صفحہ 97-296)۔ فارق صاحب کے اس ترجمہ کی خوبی اس وقت اور نکھر کر سامنے آتی ہے جب ہم 'ہندوستان عربوں کی نظر میں (حصہ اول)' کے اندر موجود اسی عبارت کے ترجمہ سے اس کا موازنہ کرتے ہیں وہاں پر ترجمہ کیا گیا ہے:

''مصفدہ وہ فرقہ ہے جو لوہے میں اپنی کمر اور پشت کو اس لیے جکڑ دیتا ہے کہ علم وفکر کی زیادتی کی جگہ سے اس کا پیٹ نہ پھٹ جائے۔'' (ص 257)

اسی طرح بزرگ بن شہریار کا ایک اقتباس ہے جس میں یہ عبارت ہے کہ "وهو جالس على سرير من ذهب مرصع بالجوهر لا تعرف له قيمته" کا ترجمہ ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔'' (صفحہ 148، ج 1) کیا ہے جب کہ اس پورے جملے کو فارق صاحب کی قدرت کلام اور کمال ترجمہ نے محض ایک لفظ 'انمول' میں سمیٹ دیا ہے۔ جس سے عبارت بہت چست و درست ہوگئی ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو ''وہ سونے کے انمول موتی جڑے تخت پر متمکن تھا۔'' (ص 150)

واضح رہے کہ 'ہندوستان عربوں کی نظر میں' کے مولف مولانا ضیاء الدین نے اپنی کتاب میں جن بعض اقتباسات کو جگہ دی ہے اتفاق سے بہت سے وہی اقتباسات فارق صاحب کی نگاہ انتخاب کا بھی حصہ بنے ہیں۔ دونوں کی تدوین میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں عربی عبارتیں بھی نقل کردی گئی ہیں جب کہ آخر الذکر میں محض ترجمے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

بہرحال پروفیسر فارق نے شگفتہ ترجمانی کا ایک عمدہ معیار قائم کیا ہے اور عربی سے اردو ترجمہ کے بہترین نمونے انھوں نے پیش کیے ہیں لیکن کہیں کہیں سہو قلم سے بعض کوتاہیاں بھی در آئی ہیں جن کا اندازہ اولاً پروفیسر محمد نعمان صاحب کے تحقیق شدہ جائزے کے سترہویں حصے کے مطالعہ سے ہوا جہاں متعدد جگہوں پر اس طرح کی بعض چیزوں کی طرف انھوں نے اپنے حواشی میں اشارہ کیا ہے۔ مثلاً عربی کے ایک عام مستعمل لفظ غارات (حملوں/ invasion) کا ترجمہ فارق صاحب نے جگہ جگہ 'غارت گری' سے کیا ہے (ملاحظہ ہو ص 169 جائزہ حصہ 17) جو ظاہر ہے صحیح ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح ایک جگہ پر "هو أول من ولد للمهاجرين بعد الهجرة" کا ترجمہ فارق صاحب نے یہ کیا ہے کہ ''ہجرت کے پہلے سال مدینے میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔'' (ص 103 ایضاً) ظاہر ہے بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش میں یہاں تعبیر کا انداز کچھ سے کچھ ہوگیا ہے اور عبارت کا اصل مفہوم باقی نہیں رہ پایا ہے۔

بہرحال فارق صاحب کی کتاب 'عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان' ان کے مطالعے کی وسعت، تنوع، دقت نظر، علمی جاں فشانی، حسنِ انتخاب، تحقیقی کمال اور زبردست قدرت ترجمہ کا نہایت روشن نمونہ ہے۔ اس کتاب میں فارق صاحب نے البیرونی کی 'کتاب الہند' کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور جابجا اسی کی فراہم کردہ معلومات کے معیار پر دوسرے عرب مولفین کے اقتباسات کو پرکھا ہے۔

فارق صاحب کی کتاب 'عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان' ان کے مطالعے کی وسعت، تنوع، دقت نظر، علمی جاں فشانی، حسن انتخاب، تحقیقی کمال اور زبردست قدرت ترجمہ کا نہایت روشن نمونہ ہے۔ اس کتاب میں فارق صاحب نے البیرونی کی 'کتاب الھند' کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور جابجا اسی کی فراہم کردہ معلومات کے معیار پر دوسرے عرب مولفین کے اقتباسات کو پرکھتا ہے

کتاب کے مقدمے میں فارق صاحب نے اپنے مراجع کا بہت جامع تعارف کرایا ہے۔ ان کے مراجع دو طرح کے ہیں بالواسطہ اور بلاواسطہ۔ ان دونوں میں جیسا کہ پیچھے کہیں ذکر کیا گیا کل 32 کتابیں شامل ہیں۔ آٹھ بالواسطہ اور 24 بلاواسطہ۔ مذکورہ تمام مصادر سے چھوٹے بڑے اقتباسات نقل کر کے انھیں جس طرح متعین موضوعات کے تحت رکھا ہے وہ ان کی ژرف نگاہی اور دیدہ ریزی کا بین ثبوت ہیں۔

آخر میں بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر خورشید احمد فارق نے اپنی 42 سالہ تدریسی زندگی کی بے پایاں خدمات کے ساتھ اپنی عمدہ نگارشات کا جو عظیم دفتر اور خزانہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے، ان کے محض ایک سرسری جائزے سے ہی یہ واضح ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اپنی شعوری زندگی کی کوئی گھڑی بھی شاید قلم وقرطاس کے بغیر نہیں گزاری۔ ان کی اس علمی شیفتگی کا جیتا جاگتا ثبوت جائزے کی موجود 16 جلدیں ہیں جن میں 156 کتابوں پر تبصرے اور ان کے اہم حصوں کے ترجمے درج ہیں۔ طبع زاد مقالات اور تحریریں نیز دوسری کتابیں ان پر مستزاد ہیں۔ اس طرح ان کی کاوشِ قلم سے اردو دنیا عربی زبان کی تقریباً تمام بنیادی مصادر ومراجع سے روشناس ہوسکی۔ ان کا یہ منفرد کام جہاں انھیں برصغیر کے عربی اسکالرس میں ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے وہیں عربی اردو ترجمے کے ایک سالار کی حیثیت سے بھی انھیں متعارف کرتا ہے۔

■

Dr. Mohd Akram Al-Salam Azmi
Dept. of Arabic
Delhi University
Delhi - 110007
Email.: mmakram1971@gmail.com

ولی الرحمٰن کاکوی
حیات اور ادبی کاوشیں

محمد مجاہد حسین

ولی کاکوی کو مشاہیر بہار میں اس لحاظ سے بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ انھیں نثری و شعری دونوں اصناف پر غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ وہ سید شاہ عظیم آبادی کے ممتاز اور عزیز شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ لیکن خود بھی ایک صاحب طرز شاعر اور نثر نگار کی حیثیت رکھتے تھے۔

سید شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی کی پیدائش 30 شوال المکرم 1316ھ بمطابق 1899 کو قصبہ کاکو ضلع جہان آباد صوبۂ بہار میں ہوئی۔ ان کا تاریخی نام شاہ رضی ہے اور تخلص ولی نسباً رضوی سید، خاندانی لقب شاہ۔ والد محترم کا نام سید شاہ غفور الرحمٰن حمد کاکوی ہے۔

سید شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی صوبۂ بہار کے ایک ممتاز اور برگزیدہ خاندان کے فرد تھے، بزرگوں کا مسلک فقر، تصوف اور خانقاہی تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ 1924 میں پٹنہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور اول پوزیشن حاصل کیا۔ قانونی سند بھی فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ 1927 میں بہار سول سروس میں ملازمت اختیار کی اور ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ نہایت تندہی اور ایمانداری سے اپنے فرائض منصبی کو انجام دینے کے بعد 1957 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ کئی سالوں تک توسیع ملازمت کی بنا پر کام کیا لیکن 1961 میں خرابیِ صحت کی بنا پر ملازمت چھوڑنی پڑی اور بالآخر 13 جون 1963 کو وفات پا گئے۔

شعر و شاعری کا ذوق و شوق بچپن سے ہی والد محترم کی صحبت میں پیدا ہوا جو اردو ادب کے ایک صاحب دیوان شاعر کے ساتھ ایک مایہ ناز مؤرخ بھی تھے اور فارسی زبان میں دادِ سخن دیتے تھے۔ ان ہی سے شاعری میں اصلاح کی۔ اردو میں نثر نگاری کا بھی ذوق و شوق ابتدا سے ہی تھا اور بے شمار علمی و ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین تحریر کیے۔ اگر چہ وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور ڈپٹی مجسٹریٹ و ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے انھوں نے اپنے فرائض منصبی کو نہایت ایمانداری اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا لیکن اردو شعر و ادب سے ان کا غیر معمولی تعلق تھا۔ ان کے مقالات ہندوستان و پاکستان کے مشہور و معروف ادبی اور معیاری جرائد میں مثلاً نگار (لکھنؤ) معارف (اعظم گڑھ) ہمایوں اور نقوش (لاہور) آج کل (دہلی) ندیم (گیا) نوائے ادب (بمبئی) اور مہر نیم روز (کراچی) میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری کی گونج ہر طرف پھیلتی رہی انھوں نے اپنے تنقیدی مقالات و مضامین میں متعدد ادبی و تنقیدی مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور بہت سے فنکاروں کے کلام کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے اہل قلم اور کامیاب شاعروں کے ضمن میں ان کا نام بہت ہی ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ولی کاکوی کی شاعری شائستگی، تہذیب، سنجیدگی اور مقصدیت کی حامل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ناسخ اور ذوق کی پیروی کو ناپسند کیا اور طرز غالب اور رنگ اقبال کے ہموار رہے۔ وہ ادب برائے حیات کے قائل تھے۔ جیسا کہ وہ خود اس طرح فرماتے ہیں۔

ادب برائے حیات اپنا شعار ہے شعر و شاعری میں
ادب برائے ادب کا حامی میرا مزاجِ سخن نہیں ہے

سید شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی ایک بہت بڑے شاعر کے علاوہ ادیب بھی تھے۔ ادب و شعر کے تمام مباحث میں ولی کاکوی کو سب سے زیادہ دلچسپی زبان اور اصلاح زبان سے ہے۔ اس ضمن میں عربی اور فارسی کے علاوہ دکنی دور سے لے کر عہد حاضر تک لسانی ارتقا کی داستان ان کے پیش نظر رہی ہے۔ ان کے مقالات کی اہمیت ان کے ذاتی حوالے سے بھی ہوتی ہے۔ ان میں بعض واقعات اور ادبی معاملات خالصتاً ولی کاکوی کے ذاتی تجربات اور مشاہدات سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ولی کاکوی کے تنقیدی مقالات ہر اعتبار سے بہت اہم ہیں۔

ولی کاکوی بیسویں صدی میں اردو غزل کا ایک روشن نام ہے۔ انھوں نے اس وقت اپنی شاعری اور خصوصاً اپنی غزل گوئی کی بساط بچھائی جب کہ راسخ اور شاد کا دور گزر چکا تھا اور ان ہی کی مادر علمی کے ایک سپوت، بحیثیت نقاد غزل کے حق میں نیم وحشی صنف سخن کا فیصلہ سنا چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ولی کاکوی نے جو زمانہ پایا تھا، وہ اپنا ایک خاص ادبی اور ثقافتی منظر و پس منظر رکھتا تھا اور ادبی اسکولوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے ماحول نے 'پوربیوں' کو ایک خاص نوعیت کی کمتری کے احساس میں ڈال رکھا تھا، لیکن ولی دکنی کا یہ تاریخ ساز کارنامہ ہے کہ ایک طرف انھوں نے یہ کہہ کر کہ

اجارہ بھی ہے ولی اس پر کسی کا
زباں اپنی اپنی کلام اپنا اپنا

ولی الرحمٰن ولی کاکوی بلا شبہ نابغہ روزگار اور منفرد استاد سخن کا درجہ رکھتے ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے دہلی اور لکھنؤ اسکول کی خلیج ختم کرنے میں جو تاریخی کارنامہ انجام دیا اس سے زمانہ واقف ہے اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ان کی اس عظیم الشان کاوش کو ان کے بعد جس فنکار نے ایک خاص نہج سے قائم و دائم رکھا وہ ان کے شاگرد، حضرت ولی کاکوی کے سوا شاید کوئی دوسرا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کی شخصیت، ان کی زندگی اور ان کی نثری خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری پر خصوصیت کے ساتھ ارباب قلم نے اپنے بہترین علمی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ولی کاکوی کی شاعری اور شخصیت پر پروفیسر کلیم الدین احمد جیسے عظیم و نامور نقاد نے بھی قلم اٹھایا ہے۔ وہ ولی کاکوی کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی غزلوں اور نظموں سے کافی مشق و مہارت اور پختگی عیاں ہے۔ ان کا اپنا ایک علاحدہ رنگ ہے۔

اس کے علاوہ پروفیسر کلیم عاجز ڈاکٹر ذکی الحق اور سید منظور الرحمٰن منظور اور مہ جبیں ناز نے بھی ان کے کلام کے بارے میں مقالہ سپرد قلم کیا ہے اس سے ان کی شاعرانہ صلاحیت پر کافی حد تک روشنی پڑتی ہے۔

ولی کاکوی کے کلام میں خطبات، رباعیات، نظمیں اور غزلیں بھی ملتی ہیں۔ لیکن ان کی شاعری در اصل غزل کی

شاعری ہے۔ان کے کلیات کا زیادہ حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ تعداد کے لحاظ سے غزلوں کے بعد نظموں کا نمبر آتا ہے۔ رباعیات وقطعات کے بعد اعلیٰ نمونے ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔

ولی کاکوی کی غزلیں بنیادی طور پر عشقیہ ہیں۔ ہر جگہ عشق و عاشقی کے مضامین بکھرے پڑے ہیں۔ اس کے علاوہ عارفانہ مضامین کو بھی انھوں نے قلم بند کیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم ان کی شاعری کو دو دور میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ابتدائی دور میں وہی روایتی مضامین کی بہتات ملتی ہے۔یعنی عشق اور لوازمات عشق سے بھرپور جدائی، تڑپ، ہجر ووصال، ناز وادا، رشک ورقابت غرض ان کا کلام ان ہی مضامین سے پُر ہے۔ساقی وشراب،شمع وپروانہ،گل وبلبل جیسے روایتی اشارے وکنائے سے ہی ان کی شاعری شروع ہوتی ہے۔سب سے پہلی غزل کا مقطع پیش ہے جو انھوں نے اپنے والد صاحب کے پاس اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔

اے ساقیِ وقت غنیمت ہے میری پیاس بجھا پیانے سے
دیکھ اٹھی ہے گھنگھور گھٹا اس وقت ترے میخانے سے

ولی کی شاعری رنگا رنگ خیالات کا مجموعہ ہے۔ جس میں حسن وعشق کی بے تابیاں اور مجبوریاں، زندگی اور موت کا فلسفہ،عقل و دل کی کشمکش،عرفان وحقیقت کا ترانہ،مناظر قدرت کی تصویر کشی اور مختلف انسانی جذبات کی مصوری نمایاں ہے۔اور ہر جگہ انداز بیان شاعرانہ ہے۔ معمولی سی بات کو خوبصورت الفاظ کے پیکر میں اس طرح سجا کر پیش کرتے ہیں کہ وہ نئی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ولی کہتے ہیں۔

کیوں نکتہ آفریں نہ تری طبع ہو ولی
غالب کی طرح یہ بھی نوائے سروش ہے

ولی کا انداز بیان ملاحظہ ہو۔

آئی بہار طاقت پرواز ہی نہیں
تکتے ہیں بال وپر کو عجب بے کسی سے ہم
اہل خرد ہیں ہوش پہ نازاں ہوا کریں
حاصل کریں گے یار کو دیوانگی سے ہم
اے دوست یہ کمال محبت کا ہے ثبوت
دشمن سے پیش آنے لگے دوستی سے ہم
عجب طرح کا سفر تھا میری جوانی کا
غریب ایسی گئی پھر پلٹ کے آ نہ سکی

شاعری جذبات کی دل آویز موسیقی اور احساسات کی حسین مصوری ہے۔شاعر اپنے جذبات واحساسات کو شعر کے پیکر میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔ولی کے ابتدائی کلام میں حسن و عشق کے ترانے گونج رہے ہیں۔عاشق کے جذبات کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔ عشق کے متعلق ولی فرماتے ہیں۔

جو عشق میں سرمستی ہے ولی، وہ زہد میں سرمستی ہی نہیں
زاہد یہ حقیقت کیا جانے آنکھوں کی کبھی جب پی ہی نہیں
کیا درد وتپش سے کام تمہیں عشرت کے مبارک جام تمہیں
تکلیف شب غم کیا جانو تم پر تو کبھی بیتی ہی نہیں

عشق بے پروا کی دلکش بے نیازی ملاحظہ ہو۔

آزاد محبت کا مداوا نہ کریں گے
ہرگز نہ علاج دل دیوانہ کریں گے
دم گھٹ کے بھی رہ جائے تو پروا نہ کریں گے
ہم جرأت اظہار تمنا نہ کریں گے

حسن وعشق کی رنگین ادائیں کتنے دلکش انداز میں ادا کی گئی ہیں۔

ایک مدت پر ہوا ہے اتصال حسن وعشق
آنکھ سب کچھ کہہ رہی ہے گو زباں خاموش ہے
کھول دے اے چشم میگوں اہل محفل کا بھرم
کس کو کتنی بے خودی ہے کس کو کتنا ہوش ہے
کس قدر دلکش ہے یہ کیف محبت کا سماں
عشق بھی مدہوش ہے اور حسن بھی خاموش ہے

جذبات کی سچی مصوری، واردات وکیفیات کی خوبصورت اور صاف تصویر کشی دل میں ہیجان برپا کر دیتی ہے۔ولی کے اس دور کا کلام عشق کی رنگین وسرمستی محرومی وناکامی، رنگ وبو، وجد وکیف، رقص ونغمہ سے بھرپور ہے۔

عشق کی بیتابی اور جذبۂ بے اختیار کی سرشاری ملاحظہ ہو۔

رنگین نقاب رخ سے اٹھا اے جمال یار
پھر میری آنکھ ذوق تماشا بدوش ہے
آشفتہ حال ہیں تیرے دیوانگان شوق
دامن کی کچھ خبر نہ گریباں کا ہوش ہے
دل کو ہے یونہی جستجو برق جمال یار کی
موج کو جیسے ہو تڑپ ماہ تمام کے لیے
پھر انتظار شوق میں بیٹھا ہوں مضطرب
رگ رگ میں سوز وساز کی دنیا لیے ہوئے
پھر دل میں اٹھ رہی ہیں محبت کی سوزشیں
قطرہ ہے پھر تلاطم دریا لیے ہوئے
دیر وحرم کی قید سے ہو گئے بے نیاز ہم
جب سے یہ دل اسیر ہے زلف شکن طراز میں

غزلیہ شاعری میں محرومی وناکامی کے مضامین عام ہیں، درد و غم، رنج والم، عشق کا لازمی نتیجہ ہے، سبھی شعرا نے اپنے اپنے انداز میں اس مضمون کو باندھا ہے۔غالب کا انداز بیاں ملاحظہ ہو وہ اپنے غم والم اور خلش عشق کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

ولی کاکوی کے یہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں جس میں انھوں نے عشق کی محرومی وناکامی کا تذکرہ کیا ہے۔ان کی غزلیں ان خیالات و جذبات سے معمور ہیں اور اپنے مضامین ان کے یہاں روایتی نہیں لگتے بلکہ ان کی اپنی سرگذشت غم کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔ان میں تاثیر اور شدت احساس ہے،ولی کا انداز دیکھیے۔

خاموش ہوں اشکبار ہوں میں   گویا شمع مزار ہوں میں
روتی ہے لپٹ کے مجھ سے حسرت   ناکام وصال یار ہوں میں
نہیں کوئی شریک رنج وفرقت   فقط اے دل تو ہے اور میں ہوں
ہجوم غم سے تنگ آ کر ولی اب   اجل کی جستجو ہے اور میں ہوں

پہلے حیات موت تھی اب موت ہے حیات
مر مر کے عاشقی میں جئے جا رہا ہوں میں

ولی کے حسن وعشق میں روایت کا احترام موجود ہے۔مگر یہ تصور محض روایتی نہیں ہے اور نہ بازاری ہے۔ان کا عشق معصوم ہے۔یہ لطیف بھی ہے اور جاندار بھی اس میں مفکرانہ سنجیدگی کم ہے۔مگر جذبات کی گہرائی اس کے اثر کو زائل ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔

عشق کی سلگتی ہوئی کیفیت اور حسن کی جیتی جاگتی تصویریں ولی کی غزلوں کی جان ہیں۔ان کے یہاں عشق کی طرح حسن کی بھی بڑی دلکش تصویریں نظر آتی ہیں۔ان کا احساس حسن اور ذوق جمال ایک تہذیب یافتہ انسان کا احساس حسن اور ذوق جمال معلوم ہوتا ہے۔اور اس حسن کی ترجمانی ان کی عشقیہ شاعری کا ایک اہم پہلو ہے۔محبوب کی تصویر اور اس کی ہر ادا کی مصوری ولی نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔جس کو پڑھ کر دل و دماغ وجد کرنے لگتے ہیں۔ان تصوروں میں رنگینی وشوخی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ ان میں شدت احساس اور گہرائی موجود ہے۔ عمومیت کے باوجود ان کی انفرادیت اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

تم پھول ہو اور میں بلبل ہوں تم شمع ہو میں پروانہ ہوں
تم حسن کی ایک کہانی ہو میں عشق کا ایک افسانہ ہوں
زلفوں میں مشک ہاتھوں میں مہندی نفس میں عطر
دریائے رنگ و بو میں نہاتی چلی گئی

فضا میں مستی برس رہی ہے نگاہ زاہد ترس رہی ہے
نشیلی آنکھوں کے ساغروں سے چھلک رہی ہے شراب رنگین
ولی جو ایسے میں بھی پیے نہ کوئی تو یہ ہے کفر نعمت
ادھر مچلتی ہیں رخ پہ زلفیں ادھر فلک پر سحاب رنگین
محشر میں وہ آئے زلفوں کو بکھرائے ہوئے رخساروں پر
سب اہل قیامت بول اٹھے خورشید سیماب آلودہ ہے

جلوۂ حسن سے ولی مٹ گئی دل کی تیرگی
مطلع صبح بن گیا مطلع شام زندگی

ولی کی غزل میں روایتی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ عصری رجحانات کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔ عشق وحسن کے قصے، راز ونیاز کی وہی باتیں جو متعلقات غزل میں ان کی زبان پر بھی ہیں۔مگر کہیں کہیں طرز ادا اتنی دلکش اور دل نشیں ہوتی ہے کہ پامال باتوں میں بھی انفرادیت کی لہر

دوڑ جاتی ہے اور شعر کے کیف واثر کو دوبالا کر دیتی ہے۔

تری جفائے ناز سلامت ستم شعار
درس وفا اسی سے لیے جا رہا ہوں میں
پہلے حیات موت تھی اب موت بے حیات
مر مر کے عاشقی میں جیے جا رہا ہوں میں
راس نہ آئی ہم کو محبت بلکہ ہوئی رسوائی نصیب
ہم تو پشیماں ہو ہی چکے اب ان کو پشیماں کون کرے

اپنے جذبات کو انھوں نے بخوبی تغزل کے پیرائے میں خوبصورت الفاظ اور دل نشیں انداز میں سجا کر پیش کیا ہے۔عاشق ولی کو دیکھیے

پھر چشم آرزو ہے میر خانہ جمال
آغوش میں کسی کا سراپا لیے ہوئے
اس جلوہ گاہ ناز میں پہنچا ہوں پھر ولی
ایک محشر امید و تمنا لیے ہوئے

فریفتہ و دیوانہ پن کی مثال ملاحظہ ہو

میں حرم نشیں جو نہ ہو سکا تو بلا سے دیر نشیں سہی
مجھے تیرے جلوے سے کام ہے جو وہاں نہیں تو یہیں سہی
مجھے حشر میں یہی آس ہے مری آنکھ جلوہ شناس ہے
انھیں دیکھ لے گی کسی طرح وہ ہزار پردہ نشیں سہی

ولی کے جذبات کا محور غزل ہی ہے جو محبت کی متنوع، کیفیات کا آئینہ ہے۔لیکن آخر میں انھوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات کا اثر بھی قبول کیا۔انسان کی فطرت اور اس کی نفسیات کو بھی اپنی شاعری میں مناسب جگہ دی یعنی غم عشق کے ساتھ ساتھ غم دوراں کو بھی اپنایا۔

ولی ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے زندگی کی نئی آوازوں اور نئے تقاضوں کو بھی سمجھا ہے۔ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی ملتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تصوف ہی کے دائرے میں آکر تغزل کا حقیقی رنگ نکھرتا ہے۔ جتنے بھی بڑے شاعر گذرے ہیں انھوں نے تصوف اور فلسفیانہ مسائل کو اپنی شاعری میں ضرور پیش کیا ہے۔شاید ہی کوئی شاعر ایسا ملے جس نے ان مضامین پر خامہ فرسائی بالکل نہ کی ہو۔یہ الگ بات ہے کہ میر درد اور مرزا مظہر جان جاناں کی طرح تصوف اس کی شاعری کا مسلک نہیں ہوتا۔لیکن تھوڑی بہت تصوف کی چاشنی ہر شاعر کے کلام میں ملتی ہے۔تصوف کی شاعری داخلی شاعری ہوتی ہے۔جہاں دل کے آئینے میں دنیا کا تماشا دیکھا جاتا ہے۔مسرت و بصیرت دونوں موج کوثر و تسنیم میں ڈوبے رہتے ہیں۔ظاہر و باطن کا سلیقہ آ جاتا ہے۔اس سے شاعری کی دنیا میں معیار اور مذاق صحیح کا پتہ چلتا ہے۔یہ شاعری کی بلندی کی دلیل ہے۔ڈاکٹر کلیم عاجز صاحب نے ولی کاکوی کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ:

''آج بھی بہار کی اردو شاعری میں گرچہ تصوف ایک مسلک زندگی کی حیثیت سے زندہ نہیں ہے۔مگر کم از کم شاعری میں ایک بہترین آرٹ کی حیثیت سے یہ زندہ ہے۔یہ وہ کائناتی اور آفاقی رنگ ہے جو ہر رنگ پر چڑھ جاتا ہے اور ہر رنگ کو حسین و دلکش اور پائیدار بنا دیتا ہے۔شاعری میں اس کی وجہ سے کتنے پہلو پیدا ہوئے اور شاعری کی تاثیر معنویت میں کتنا اضافہ ہوا اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔''

ولی کے فن میں شعریت، شگفتگی، دلگدازی اور درد مندی کے آثار اکثر نمایاں ہیں۔ان کو اپنی شخصیت اور فکری صلاحیتوں کا شعوری احساس تھا۔ان کے فن میں ان کے احساس کی جھلک ملتی ہے، خود کہتے ہیں۔

تری جو غزل ہے وہ اے ولی ہے خزانہ فکر بلند کا
نہ محاورے کی ہے جستجو نہ تجھے زبان کی تلاش ہے

ان کے احساسات کی لہروں پر ان کے سفینۂ شاعری کی سبک روی، ان کے نظریۂ حیات اور نظریہ فن کی تابندگی دیکھی جا سکتی ہے۔ولی کا نظریہ فن ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

جب سننے والا کوئی نہیں خاموش ولی اب شعر نہ پڑھ
یہ بزم ہے مردہ ذوقوں کی بیکار غزل خواں ہوتا ہے
ہر ہر شعر میں مضمر ہے جذبات کا ایک طوفان ولی
ان کو سنا کر اپنی غزل بیکار پریشاں کون کرے
اشعار ہیں یہ پر جوش ولی یا نغمے ہیں بیداری کے
اقبال کا پیغام ان کو کہو ٹیگور کا یہ پیغام نہیں
ولی بدل دے عروس سخن کا رنگ کہن
مثال حضرت اقبال نام پیدا کر

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ ولی کاکوی کی شاعری صحت مند نظریہ حیات کی حامل ہے۔ان کی بیشتر تخلیقات شعری کا عہد دور غلامی ہے۔وہ ایک ڈپٹی کلکٹر تھے یعنی ایک سرکاری ملازم تھے لیکن ان کا ذہن غلام نہ تھا وہ ایک حساس دل اور بیدار ذہن کے مالک تھے۔ان کے جذبات و محسوسات دل نشیں الفاظ کے پیکر میں سج کر پیش ہوئے ہیں۔

دبستان شاد میں ولی مخصوص انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کا ذہن فلسفیانہ ہے۔ان کا مزاج عاشقانہ ہے۔ان کا انداز دردمندانہ ہے۔اور ان کا لہجہ حوصلہ مندانہ ہے۔ولی کاکوی کی شاعری میں مناظر فطرت کی جلوہ گری بھی بڑے خوبصورت انداز میں ملتی ہے۔صبح کی پہلی گھڑی بے حد پُر سکون اور وجد آور ہوتی ہے۔اس منظر کی بھرپور جلوہ گری کے لیے شاعر نے بڑی پُر سکون اور مترنم بحر کا انتخاب کیا ہے۔الفاظ و تراکیب کی بندش ایسی ہے جس سے سحر کی سحر کاری ظاہر ہو جاتی ہے۔

خاموش فضا میں وقت سحر جذبات کا دریا جاری ہے
ایک کیف طوفاں انداز ہے اک وجد کا عالم طاری ہے
وہ چاک ہوا دامان سحر وہ ظلمت شب کافور ہوئی
عالم عالم پُر نور ہوا، دنیا دنیا مسرور ہوئی

ولی کا لب وہ لہجہ نہایت شستہ پاکیزہ اور شیریں ہے۔صنائع اور بدائع کی آرائش تشبیہ و استعارے کی لطافت سے ان کا کلام آراستہ ہے۔وزن و بندش کا بھی انھیں خاص خیال رہتا ہے۔ان کے اشعار تراشیدہ مکمل اور مربوط ہوتے ہیں۔کلام میں روانی، تازگی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔

ولی نے نظمیں بھی کافی تعداد میں لکھی ہیں۔ان کی بیشتر نظمیں بے حد کامیاب ہیں ان میں شاعرانہ تناسب اور ربط بھرپور ملتا ہے۔کیف سحر، عالم اضداد، فردوس تمنا، اعتراف وغیرہ کامیاب نظمیں ہیں۔ان نظموں میں موضوع کا حسن بھی ہے اور طرز ادا کی دلکشی بھی، ساتھ ہی ساتھ آپ کی نظمیں حرکت و عمل اور جد و جہد کا بھی پیغام دیتی ہیں۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ سرکاری نوکری کی مشغولیت کے باوجود ادبی شغل کو جاری رکھا۔ لیکن افسوس ہے کہ حضرت ولی کاکوی اپنے سامنے اپنے کلام کے مجموعے کو مطبوع نہ دیکھ سکے۔

المختصر سید شاہ ولی الرحمٰن ولی کاکوی کی شاعری ایک انفرادیت کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کی شاعری میں تمام اصناف سخن کی باتیں موجود ہیں۔بحیثیت شاعر ولی کاکوی کا مرتبہ بہت بلند و اعلیٰ ہے۔یہ صاحب دیوان بھی ہیں۔ ان کے دیوان میں غزلیں، نظمیں، قطعات و رباعیات بھی موجود ہیں۔البتہ قصائد، مراثی، مثنوی، جیسے اصناف سخن میں ان کا کلام دستیاب نہ ہو سکا۔شاعری میں وہ ہر طرح کامیاب و کامران مکمل طور پر ثابت ہوئے۔

حوالہ جات

1 منیر شریف، از ڈاکٹر محمد طیب ابدالی، حیات کلیم
2 ''گلشن حیات'' سوانح شاد عظیم آبادی مع نمونہ کلام و تذکرہ تلامذہ مؤلفہ سید معین الدین احمد قیس رضوی،
3 کلیات شاد، حصہ اول 4 ندیم بہار نمبر 1933، 5 کلیات شاد
6 شعرائے بہار اور ان کے ہم عصر ایک جائزہ، صنم 63، 1962
7 رسالہ ندیم گیا، اگست 1941، ص 69
8 عہد حاضر میں بہار کے شعراء، ندیم بہار نمبر 1940
9 ندیم بہار نمبر 1940 10 ندیم بہار نمبر 1940
11 کلیات شاد، مرتب کلیم الدین احمد
12 خدا بخش جرنل 5، ڈاکٹر حمیرا خاتون
13 ندیم بہار نمبر 1940

■

Dr. Md. Mujahid Hussain
Asst Profe., Dept. of Urdu, Purnea College
Purnia- 854301 (Bihar)
Mob.: 9955978665
Email.: drmdmujahidhussain88@gmail.com

شہناز بیگم

ہندوستان میں فارسی تاریخ نگاری کا آغاز وارتقا

ایرانی تاریخ نگاری کا آغاز شاہناموں سے ہوتا ہے۔ ایرانی تہذیب کے تحت لکھی گئی تاریخوں کا موضوع سیاسی تھا۔ شخصی حکومت ہونے کی وجہ سے پورے عہد کی تاریخ نہ لکھ کر بادشاہوں کی تاریخ لکھی جانے لگی۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کے مطابق:

''ایران کے تاریخی نظریات تخت وتاج کے گرد گھومتے تھے۔ شاہ نامہ تاریخی فکر کا مرکز ومحور تھا۔ وہاں صرف شاہی خاندانوں کی تاریخ لکھی جاتی تھی، عوامی زندگی سے مؤرخ کو کوئی سروکار نہ تھا چنانچہ ایرانی طرز پر لکھی ہوئی تاریخیں امرا اور سلاطین کی رزم وبزم کی داستانیں ہیں اور ان کے ہی نام سے انتساب ہے۔''[1]

چونکہ شخصی حکومت میں ایرانی مؤرخ اپنے مربی حکمرانوں کے تنخواہ دار ملازم ہوتے تھے اور انھیں کی فرمائش پر تاریخیں لکھتے تھے۔ لہٰذا خوشامد اور چاپلوسی کی راہ سے مبالغہ آرائی داخل ہوئی اور تاریخ نگاری قصیدہ گوئی تک محدود ہوگئی چونکہ قصیدہ گوئی آسان اور سیدھی سادی عبارت میں ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا عبارت آرائی اور لفاظی تاریخ نگاری کا لازمی جز قرار پایا اور چند واقعات کے لیے کئی کئی صفحات لکھے جاتے تھے۔ اس طرح ایرانی تاریخ نگاری میں ابتدا ہی سے مقفّٰی ومسجع عبارت کو استعمال کیا گیا اور واقعات کو سادگی سے بیان کرنے کے بجائے عبارت آرائی کو اختیار کرکے پیچیدہ اور علامتوں وتشبیہات کے ذریعے اظہار بیان کو اپنایا گیا۔

بقول پروفیسر اقتدار حسین صدیقی:

''ایرانی تاریخی کتابوں میں قدم قدم پر حقیقت اور افسانویت کی آمیزش ہوجاتی ہے۔''[2]

اسلامی دور کے ایرانیوں نے تاریخ لکھنے کے لیے سب سے پہلے عربی زبان کا سہارا لیا۔ اس کے نتیجے میں محمد بن ابی جعفر جریر الطبری کی کتاب تاریخ الرسل والملوک وجود میں آئی جو تاریخ بلعمی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ تاریخ کی سب سے پہلی کتاب ہے جو ایران میں ظہور اسلام کے بعد لکھی گئی ہے۔ ہندوستان میں فارسی تاریخ نگاری کے آغاز سے پہلے ایران میں لامحدود فارسی تاریخیں لکھی گئیں۔

ہندوستان میں فارسی تاریخ نگاری کی روایت

مسلم تاریخ نگاری اپنی بدلتی ہوئی شکل میں جس میں ایرانی اور عربی دونوں اجزا شامل تھے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ یہاں جو تاریخیں لکھی گئیں وہ فارسی زبان میں ایرانی طرز پر ہی لکھی گئیں۔ ہندوستان میں فارسی تاریخ نگاری کو حسب ذیل عہد میں بانٹا جاسکتا ہے:

(i) عہد سلطنت میں فارسی تاریخ نگاری

(ii) مغل عہد میں فارسی تاریخ نگاری

(iii) آخری مغل عہد میں فارسی تاریخ نگاری

(i) عہد سلطنت میں فارسی تاریخ نگاری: عہد سلطنت میں تاریخ نگاری کی جو روایت ہندوستان میں قائم ہوئی اس میں اسلامی اور ایرانی روایتوں کے اجزا موجود تھے۔ اس عہد میں مختلف اقسام کی تاریخیں لکھی گئیں ان میں سے اہم ترین انواع یہ ہیں: تاریخ عمومی، تاریخ خصوصی، منظوم تاریخیں اور علاقائی تاریخیں، تاریخ کی یہ اقسام جو اس عہد میں ایران میں رائج تھیں، ہندوستان میں بھی اسی عہد میں رائج ہوگئیں۔ عہد سلطنت میں تاریخ کے موضوع سے متعلق کتابیں عربی روایت کی بہ نسبت فارسی روایت سے زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔ یعنی جو طرز تاریخ نگاری میں اختیار کی وہ ایرانی تھی۔ اس کا اندازہ اس عہد کی ابتدائی تاریخوں جیسے صدرالدین حسن نظامی نیشاپوری کی تاج الماثر[3] منہاج الدین بن سراج الدین کی طبقات ناصری[4] سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ مؤرخین ہر اعتبار سے ایرانی تاریخ نگاری کی دیرینہ روایت کے علمبردار تھے۔ لیکن امیر خسرو مؤلف تاریخ علائی، ضیاء الدین برنی مؤلف 'تاریخ فیروز شاہی'[5] اور شمس سراج عفیف مؤلف 'تاریخ فیروز شاہی' جیسے مؤرخین کے ظہور پذیر ہونے کے ساتھ اس عہد کی فارسی تاریخ نگاری نے بتدریج مستقل بالذات ہوکر ایک حد تک اپنا علیحدہ رنگ اختیار کیا۔

سلطنت عہد کے مؤرخین نے تاریخ کی ترجمانی کے لیے مذہب اور اخلاق کو پس منظر کے طور پر اپنانے کی کوشش کی اس طرح تاریخ کا جو تصور امیر خسرو، عصامی مؤلف 'فتوح السلاطین'، شمس سراج عفیف، ضیاء الدین برنی اور یحییٰ بن احمد سرہندی مؤلف تاریخ مبارک شاہی[6] کے یہاں ملتا ہے۔ ان میں بڑے بڑے آدمیوں، شہزادوں اور سلاطین کا ذکر بھی شامل ہے۔ وہ عام طور پر تاریخ کو خدائی حکم یا خدائی فعل سمجھتے تھے جس میں انسان محض ایک کارکن کا درجہ رکھتا ہو۔ اس عہد کی تاریخ میں ناصحانہ عنصر پائے جاتے تھے۔

عہدِ سلاطین کی تاریخ کا اہم موضوع صوفیا اور ان کا کردار ہے چونکہ عہد سلاطین میں صوفیا کی معاشرے میں اہم حیثیت تھی لہٰذا اس پورے عہد کی تاریخ نگاری میں صوفیا کو دشمن سے دفاع کرنے، جنگ میں فتح دلانے، اور معاشرے میں خوش حالی قائم کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ضیاء الدین برنی کی تاریخ میں نظام الدین اولیا اگر ایک طرف منگولوں کے حملے سے دہلی کا دفاع کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کی شخصیت کی وجہ سے ملک میں خوش حالی کا دور دورہ ہے۔ سلطان اور صوفی کی شخصیتوں کے درمیان عوام کا کوئی کردار تاریخ نگاری میں اُبھر کر نہیں آتا۔ عوام خاموش، ساکت منجمد، بے عمل اور بے کار افراد کا جم غفیر ہے۔ جنھیں سلطان اور صوفی کی شخصیتیں ہدایت دیتی ہیں۔ احکامات جاری کرتی ہیں اور انھیں ہر مصیبت سے تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ سلطان اور صوفی کے بعد تاریخ میں علما اور امرا کا تذکرہ ہے۔ وہ امرا جو سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور حکومت کے اداروں میں باعمل تھے۔ یہ رعیت اور سلطان کے درمیان بطور رابطہ قائم کرتے تھے۔ علما و فقہا سلطنت کے امور میں بطور قاضی، صدر، شیخ الاسلام اور مفتی کے شرکت کرتے تھے۔ اس لیے تاریخ نگاری سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ تاریخی عمل شخصیتوں کی وجہ سے حرکت کرتا ہے اور یہی واقعات و حالات کی تشکیل کے ذمے دار ہیں حالات کے پس منظر میں سماجی و معاشی اور سیاسی قوتوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔

اس تاریخ نگاری سے مؤرخوں کے اپنے مفادات ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ ان میں سے اکثر کا تعلق اعلیٰ طبقے سے تھا اس لیے ان کی ہمدردیاں اسی طبقے سے تھیں اور تاریخ نگاری کے ذریعے وہ حکومتی ڈھانچے کو اسی حالت میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ حکومت و سلطنت کے خلاف بغاوت ان کے نزدیک سخت جرم تھا۔ اس لیے انھوں نے باغیوں کے لیے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور ان کی بغاوت کے پس منظر یا ان کے مطالبات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ پندرہویں صدی میں علاقائی سلطنتوں کے قیام کے ساتھ وہاں کے حکمراں طبقے نے تاریخ نگاری کی روایت کو جاری رکھا۔ گجرات، مالوہ، جونپور، اور بنگال میں پندرہویں اور سولہویں صدی میں مختلف کتابیں تحریر ہوئیں۔

(ii) مغل عہد میں فارسی تاریخ نگاری: مغل عہد کے تاریخی ادب پر روشنی ڈالی جائے تو ایک واضح تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور میں تاریخ روایت کی پابند یا مذہب سے زیادہ وابستہ نہیں تھی۔ ناصحانہ عنصر کی جگہ اسباب، واقعات نگاری اور غیر جانبداری پر توجہ دی جانے لگی۔ اس کے علاوہ اس عہد کے مؤرخوں نے غیر مذہبی انداز اختیار کیا۔ اس دور میں ایسے بہت سے سرکاری، غیر سرکاری مؤرخین،

> اکبری دور کی تاریخ نگاری میں سیکولر رجحانات نظر آتے ہیں۔ ان رجحانات کی نمائندگی ابوالفضل نے بڑی عمدگی کے ساتھ کی ہے۔ اس کے یہاں انسانی برادری کا نقطۂ نظر ہے کہ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ثقافتی رشتوں میں منسلک ہیں اور مذہبی اختلاف کے باوجود معاشرتی یکجہتی اور ہم آہنگی میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

سوانح نگار اور توزک نگار ملتے ہیں جنھوں نے عصری تاریخیں لکھیں۔ انھوں نے قابل اعتماد واقعات کو ترجیح دی۔ اس عہد کی تاریخ کافی حد تک سیاسی تاریخ ہے لیکن اس کے باوجود واقعات میں شہادت استدلال اور غیر جانبداری کو اہمیت دی گئی ہے۔

مغل تاریخ نگاری کی اہم ترین خصوصیت مغل امپریل ازم کی حمایت ہے۔ اس عہد کی تاریخ نگاری میں صوفیا کا کردار گھٹ گیا اور تاریخی عمل میں ان کی شرکت کم ہوگئی۔ جس طرح وہ عہد سلاطین میں حکمرانوں پر حاوی تھے اور فتح و شکست کے ذمے دار تھے، عہد مغلیہ میں ان کی وہ حیثیت نہیں رہی اور وہ ایک محدود دائرے میں مصروف عمل رہے۔ اس عہد کی تاریخ نگاری میں امرا کی بہادری، شجاعت، فیاضی اور سخاوت کے تذکرے ملتے ہیں ان امرا کے تذکرے علیحدہ بھی لکھے گئے جیسے ذخیرۃ الخوانین، تذکرۃ الامرا اور 'مآثر الامرا' یا ان کے خاندانوں پر علیحدہ سے تاریخیں لکھی گئیں۔ جیسے عبدالباقی نہاوندی نے عبدالرحیم خان خاناں کے خاندان پر 'مآثر رحیمی' لکھی۔

مغل عہد کی ابتدائی کتاب ظہیر الدین محمد بابر کی خودنوشت سوانح عمری 'توزک بابری' ہے۔ جوترکی زبان میں لکھی گئی۔ اس کا فارسی میں ترجمہ اکبر کے حکم سے عبدالرحیم خانخاناں نے کیا۔ ہمایوں کے عہد میں اس کی بہن گلبدن بیگم کا 'ہمایوں نامہ' اور جوہر آفتابچی کی 'تذکرۃ الواقعات' تحریر ہوا۔

اکبر کے عہد کے لیے ابوالفضل کا 'اکبر نامہ' اہم ترین مستند تاریخ ہے۔ یہ تین جلدوں پر مبنی ہے۔ جلد اوّل کے دو حصے ہیں۔ اول حصے میں دیباچہ اور اکبر کے آبا و اجداد کے حالات درج ہیں۔ یہ حصہ ہمایوں بادشاہ کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔ حصہ دوم میں اکبر کی تخت نشینی تک حالات ہیں۔ جلد دوم میں 18 عیسوی جلوس سے 46 جلوس تک کے واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ جلد سوم آئین اکبری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جلد اکبر کے عہد حکومت کے امور انتظامی کا مرقع ہے۔ رشید مولوی عنایت اللہ عرف محمد صالح کا تکملہ اکبر نامہ، ملا عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ'، نظام الدین احمد کی طبقات اکبری وغیرہ تاریخیں اکبر کے عہد کی اہم ترین تاریخیں ہیں۔

اکبری دور کی تاریخ نگاری میں سیکولر رجحانات نظر آتے ہیں۔ ان رجحانات کی نمائندگی ابوالفضل نے بڑی عمدگی کے ساتھ کی ہے۔ اس کے یہاں انسانی برادری کا نقطۂ نظر ہے کہ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ثقافتی رشتوں میں منسلک ہیں اور مذہبی اختلاف کے باوجود معاشرتی یکجہتی اور ہم آہنگی میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس کی تاریخ میں ہندو اور مسلمان تصادم نہیں، بلکہ انتشار اور استحکام کے درمیان ایک کشمکش ہے۔ مغل حکومت استحکام کی علامت ہے جبکہ اس کے مخالفین انتشار کے، اس لیے اس نے مغل فوجیوں کے لیے 'مجاہدین اقبال' اور 'غازیان دولت' کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور انھیں غازیان اسلام یا مجاہدین اسلام نہیں کہا۔

ابوالفضل اپنے پیش رو مؤرخوں کی طرح صرف مسلمان بادشاہوں کے کارنامے بیان نہیں کرتا بلکہ ہندوستان کی تاریخ کے تسلسل کو سمجھنے کے لیے وہ قدیم ہندوستان کی تاریخ اور ان کے فلسفے کو جاننا انتہائی ضروری سمجھتا ہے۔ ابوالفضل کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ ہم عصر تاریخ لکھتے وقت سرکاری دستاویزات اور کاغذات کے

ساتھ ساتھ زبانی تاریخ سے بھی استفادہ کرتا ہے۔اس نے تاریخ کے دائرے کو وسعت دی اور سیاست کے ساتھ سماجی، انتظامی، ثقافتی اور معاشی پہلوؤں پر بھی لکھا ہے۔ تاریخ نگاری کی ایک اہم تبدیلی نظام الدین کی 'طبقاتِ اکبری' ہے۔نظام الدین احمد نے صرف ہندوستان کی تاریخ لکھی اور اپنے پچھلے مؤرخین کی پیروی نہیں کی جو اسلامی تاریخ کو نقل کر دیتے تھے۔

'طبقاتِ اکبری' مقدمہ، خاتمہ اور نو طبقات پر مشتمل ہے، مقدمہ میں شاہانِ غزنوی کے حالات امیر سبکتگین سے لے کر ملک خسرو کے قتل تک درج ہیں۔ طبقہ اوّل میں ہندوستان کے حالات شہاب الدین محمد غوری سے شروع ہوکر اکبر کے 38 ویں سنہ جلوس پر ختم ہو جاتے ہیں اس کے آخر میں منصب داروں، امیروں اور شاعروں وغیرہ کا ذکر ہے۔ دوسرے طبقے میں شاہان دکن کے حالات درج ہیں۔ چوتھے طبقے میں شاہان مالوہ کے حالات درج ہیں۔ پانچواں طبقہ شاہان بنگال کے حالات پر مشتمل ہے۔ چھٹے طبقے میں جون پور کے بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔ ساتویں طبقے میں کشمیر کے بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔آٹھویں طبقے میں سندھ کے حالات درج ہیں۔نویں طبقے میں تاریخ ملتان بیان کی گئی ہے۔محمد بن قاسم کے حملے سے شروع ہو کر ملتان کے الحاق تک کے حالات مذکور ہیں۔ خاتمہ میں مؤلف نے ہندوستان کا مکمل جغرافیہ تحریر کیا ہے۔

'تاریخ الفی' اکبر کے عہد کی اہم ترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جو اکبر بادشاہ کے حکم سے مرتب کی گئی۔اس کتاب کی تین جلدیں ہیں اور ہر جلد کا مصنف بھی جداگانہ ہے۔ جلد اوّل کے منشی نظام الدین احمد، جلد دوم کے ملا عبدالقادر بدایونی اور جلد سوم کے مصنف حکیم ہمایوں تھے مگر یہ تاریخ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی اور ادھوری تصور کی جاتی ہے۔

جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں تاریخ نگاری ایک بار پھر روایتی بنیادوں پر آ گئی۔اس دور کی اکثر تاریخیں درباری مؤرخوں نے لکھیں۔ جہانگیری عہد کی خود اس کی سوانح 'توزک جہانگیری' اور معتمد خاں کی 'اقبال نامہ جہانگیری' اہم ترین تالیفات ہیں۔

شاہجہاں کے عہد سے متعلق تاریخوں میں بادشاہ نامہ، محمد صالح کنبوہ کی تاریخ 'عمل صالح'، محمد صادق کی تالیف 'صبح صادق' وغیرہ مستند ماخذ ہیں۔ بادشاہ نامہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد کا مصنف جداگانہ ہے۔ جلد اوّل میں اوائل عمر سے تخت نشینی تک کے حالات درج ہیں۔ یہ جلد 1590 تک کے حالات پر مبنی ہے۔ اس حصے کا مصنف معتمد خاں ہے۔ جلد دوم تین دفتروں میں منقسم ہے۔ یہ جلد عبدالحمید لاہوری کی مرتب کی ہوئی ہے۔ جلد سوم محمد وارث نے تصنیف کی۔ محمد صالح کمبوہ نے جلد چہارم کو ترتیب دیا۔

'صبح صادق' ابتدائی اسلام سے 1048ھ/ 1639 تک کے تاریخی واقعات کا مجموعہ ہے۔ یہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ہر حصے کی تقسیم مطلعوں میں کی گئی ہے۔ 'عمل صالح' دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں شاہ جہاں کے بزرگوں کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ یہ حصہ نویں سنہ جلوس کے واقعات پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا حصہ دسویں سال سنہ جلوس سے شروع ہو کر بادشاہ کی نظر بندی کے حالات پر ختم ہو جاتا ہے۔ شاہ جہاں کی علالت اور مابعد کے تفصیلی حالات کے علاوہ اس جلد میں مشاہیر زمانہ سادات مشائخ، جراح، سوانح نگار، مشہور شاعروں اور حکیموں کے حالات کا بھی تذکرہ ہے۔ شہزادوں اور منصب داروں کی فہرست دی گئی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے متعلق تاریخوں میں محمد کاظم شیرازی کا عالمگیر نامہ[7]، پنڈت ایشور داس ناگر کی 'فتوحاتِ عالمگیری'، ساقی مستعید خاں کی 'مآثر عالمگیری' نعمت خاں عالی کی 'وقائع عالمگیری'، جنگ نامہ عالمگیری نیز بھیم سین کی 'نسخہ دلکشا' کے نام سے اس عہد کے بہت سے، بالخصوص مہم دکن سے متعلق واقعات درج ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ درباری قسم کی تاریخ نویسی کا سلسلہ معظم بہادر شاہ اوّل کے عہد تک برابر جاری رہا اور ایک حد تک اس کے جانشینوں کے زمانے تک بھی۔ اس عہد کی تاریخ نگاری کی یہ خصوصیت رہی کہ مؤرخوں نے انتہائی مشکل ادق اور پیچیدہ زبان کو استعمال کیا ہے اور واقعات کو صاف لکھنے کے بجائے، علامتوں، تشبیہات واستعارات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ زبان محاورے اور عبارت آرائی پر زیادہ زور دیا ہے۔ جس نے عبارت کو مشکل بنا کر بعض اوقات بے معنی کر دیا ہے۔ خصوصیت سے ابوالفضل کی زبان و عبارت انتہائی پیچیدہ ہے۔ بعد کے مؤرخین نے اس کی پیروی اور تاریخ نگاری کو مشکل بنا دیا۔ ان تاریخوں میں محض واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کا تجزیہ نہیں کیا۔ معاشرے کے ثقافتی و سماجی پہلوؤں پر کم توجہ دی زیادہ تر سیاست پر لکھا اور اس میں تاریخی عمل کو متحرک رکھنے میں شخصیتیں با عمل ہیں۔ عوام محض خاموش تماشائی ہے۔

(iii) آخری مغل عہد میں فارسی تاریخ نگاری: آخری مغل عہد میں فارسی تاریخ نگاری میں انتہائی اہم تبدیلیاں آئیں کیونکہ اس دور میں مغل دربار کی طاقت واہمیت کمزور ہو چکی تھی۔ اس عہد کی تاریخ نگاری میں آخری عہد مغلیہ کا انتشار سیاسی بے چینی، عدم استحکام، تحفظ کا فقدان اور لاقانونیت نظر آتی ہے۔ بقول پروفیسر اقتدار حسین صدیقی:

''ہندوستان میں تاریخ نگاری مغلیہ سلطنت کے سیاسی زوال سے بری طرح متاثر ہوئی۔ مغل بادشاہ محمد شاہ (م، 1747) اور اس کے جانشینوں کے عہد میں جو تاریخ پر کتابیں لکھی گئیں ان میں باشاہوں کی بے بسی دربار سے منسلک امرا کی باہمی رقابت اور گروہ بندی ایک گروہ کی دوسرے گروہ کے خلاف سازشیں، باغیوں کے خلاف فوجی مہموں کی ناکامی کی داستان اور آشوب زمانہ کی شکایت ملتی ہے۔''[8]

اس عہد میں مؤرخین نے ایسی کتابیں تصنیف کیں جن میں مختلف حکومتوں کے سلسلہ وار احوال بیان کیے گئے ہیں اور مغل حکومت کے زوال کے اسباب تلاش کیے گئے ہیں، اس کی تباہی پر افسوس ظاہر کیا گیا ہے۔ اس عہد کی تاریخیں اس زمانے کے ان سیاسی حالات وواقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں جو پے در پے نمودار ہوتے رہے۔ علاوہ ازیں اس عہد کی تاریخوں میں اس دور کے بحران اور مستقبل کے بارے میں سوالات ملتے ہیں۔ ان تاریخوں میں بادشاہ کی مظلومیت، امرا کی سازشیں، قدیم وجدید امرا کے درمیان کشمکش اور حکومت کی بے بسی کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے یہاں تاریخ ایک المیہ بن جاتی ہے اور بادشاہ وشاہی خاندان کے افراد مظلومیت کا پیکر بن کر ابھرتے ہیں۔ لیکن ان میں مؤرخ مغل سلطنت کے زوال، اور معاشرے کی پست حالت کا تجزیہ نہیں کر سکا۔ اس کے یہاں مایوسی، عبرت اور مظلومیت کا احساس ہے جسے وہ وقت کے ساتھ منسوب کر دیتا ہے اور قدرت کی جانب سے پیش ہونے والے حادثات کہہ کر ان کا تجزیہ کیے بغیر خاموش ہو جاتا ہے۔

اس دور کے مؤرخین کی فہرست کافی طویل ہے، چند اہم مؤرخوں میں خافی خاں، اعتماد علی خاں بن اعتماد خاں عالمگیری، ارادت خاں، یحیٰ خاں، محمد آشوب پوری، رستم علی خاں اور محمد بخش آشوب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دور حاضر کے مؤرخ ظہیر الدین ملک کا اٹھارہویں صدی کے مؤرخین کے بارے میں کہنا ہے۔

''ان کے نزدیک قفل تاریخ کی کنجی ان افراد کے عروج وزوال میں پوشیدہ تھی جنھوں نے سیاسی معاملات کی راہ متعین کرنے میں ایک واضح کردار ادا کیا تھا۔ بادشاہ یا امیر

ابتدائی دور میں ہندوستان میں جو تاریخیں لکھی گئیں وہ ایک حد تک حبیب السیر اور روضتہ الصفا کے مقابلے کی تھیں اور ایک معنی میں انھیں عالمی تاریخیں کہا جا سکتا ہے۔ ان تاریخوں میں ابھی تک قدیم واقعہ نگاری کا رنگ جھلکتا ہے۔ مؤرخ کی حیثیت درباری وقائع نویس کی سی ہے اور اس کی تصنیف کردہ تاریخ کا مرکز بادشاہ کی ذات ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ رجحان کم ہوتا گیا۔ جس کی بڑی وجہ مرکزی حکومت کی بتدریج کمزوری اور سلطنت کے مختلف صوبوں کی آزادی و خود مختاری تھی۔

سارے واقعات کا مرکز اور سرچشمہ تھا۔ سماج کے مختلف طبقے وقت کے اندھیرے میں پھینک دیے گئے تھے حالانکہ یہ محققین مغل تمدن کی مادی بنیاد سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ پھر بھی یہ ان اقتصادی اور سماجی عنصروں کا تجزیہ نہ کر سکے جو مغل انحطاط کے اسباب میں شامل تھے۔"[9]

اس دور کی تاریخ نگاری میں اسلوب اور انداز بیان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ جب کہ مغل حکومت کے زمانہ عروج میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان کی زبان انتہائی مرصع ہے اور حقیقی سے زیادہ مصنوعی عنصر انداز بیان پر غالب ہے۔ چونکہ اٹھارہویں صدی سیاسی اور معاشی انتشار کا زمانہ تھا۔ لہٰذا اس دور کے مؤرخوں کے انداز بھی بدل گئے۔ مؤرخین حسن بیان سے زیادہ واقعات کی صحت پر توجہ دینے لگے۔ یہی اس دور کی فن تاریخ نگاری کا خاصہ ہے۔ اس کے علاوہ اٹھارہویں صدی میں لکھی جانے والی تاریخوں میں سابقہ تاریخوں کے مقابلے میں جامعیت کی کمی اور بالعموم مرکزیت کا فقدان تھا۔ ابتدائی دور میں ہندوستان میں جو تاریخیں لکھی گئیں وہ ایک حد تک حبیب السیر اور روضتہ الصفا کے مقابلے کی تھیں اور ایک معنی میں انھیں عالمی تاریخیں کہا جا سکتا ہے۔ ان تاریخوں میں ابھی تک قدیم واقعہ نگاری کا رنگ جھلکتا ہے۔ مؤرخ کی حیثیت درباری وقائع نویس کی سی ہے اور اس کی تصنیف کردہ تاریخ کا مرکز بادشاہ کی ذات ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ رجحان کم ہوتا گیا۔ جس کی بڑی وجہ مرکزی حکومت کی بتدریج کمزوری اور سلطنت کے مختلف صوبوں کی آزادی و خود مختاری تھی۔ اس دور میں بہت سی ایسی تاریخیں لکھی گئیں جن کے موضوع بحث کا دائرہ کسی صوبے یا صوبے کے حکمراں بلکہ بعض اوقات ایک حاکم کے حالات زندگی تک محدود ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو تاریخی کتابوں میں کافی تنوع پیدا ہوگیا اور دوسری جانب ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

چونکہ اس عہد میں مؤرخوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا اس لیے انھوں نے تاریخ کے روایتی خاکے کو بدل ڈالا۔ مثلاً وہ تاریخ کی ابتدا قدیم ہندوستان سے کرتے اور پھر اسے تسلسل کے ساتھ عربوں اور ترکوں کی ہندوستان کی فتح سے ملا دیتے جیسے سجان رائے کی 'خلاصۃ التواریخ' ہے کہ جس میں ہندوستان کی مکمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس عہد کی تاریخ نگاری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متوسط طبقے کے لوگوں نے تاریخ لکھنی شروع کی جیسے کھتری، صراف اور منشی، اس وجہ سے اب تک تاریخ پر جو اعلیٰ طبقے کا قبضہ تھا وہ ٹوٹ گیا اور متوسط طبقے نے اپنے نقطۂ نظر سے تاریخ کو جانچنا اور پرکھنا شروع کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ نویسی کی زبان سادہ ہوگئی عبارت آرائی اور پیچیدگی جو پہلے کے مؤرخوں کی خصوصیات تھیں وہ ختم ہوگئیں۔ اس عہد میں مؤرخوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ کیونکہ زوال کے دور میں دلوں پر جو مایوسی طاری تھی اور معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ سے جس سے لوگ متاثر ہو رہے تھے۔ اس وجہ سے لوگ تاریخ نگاری کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے مختلف موضوعات کو اپنایا چونکہ ان کی اکثریت دربار سے وابستہ نہیں تھی اس لیے ان کی تحریر میں آزادی، تنقید اور بیباکی ہے۔ وہ صاف اور واضح الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں۔

مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ مرہٹہ، جاٹ، سکھ اور راجپوت اقوام قومی جذبے کے ساتھ اُبھریں اور انھوں نے اپنی اپنی قوموں کی قدیم اور ہم عصر تاریخ کی تشکیل کی طرف توجہ دی جس کے نتیجے میں تاریخ نگاری میں ایک اہم تبدیلی آئی اور اس میں قومی جذبہ و فخر کا عنصر شامل ہوگیا۔ اس زمرے میں خود مختار ریاستیں بھی آجاتی ہیں جیسے اودھ، رامپور، میسور وغیرہ ریاستیں جن کے نوابوں اور راجاؤں نے اپنی ریاستوں کی تاریخ اپنی سرپرستی میں لکھوائی۔

اس طرح اورنگ زیب کے بعد کا زمانہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے تاریخی زوال، تخت نشینی کے لیے جنگ وجدال اور نتیجۂ علوم وفنون سے ایک گونہ بے رخی کا دور تھا۔ علاوہ ازیں مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ اگر ایک طرف فارسی زبان زوال پذیر تھی تو دوسری طرف اردو نثر ترقی کی راہ پر گامزن تھی اور اردو کی تخلیق کی وجہ سے فارسی زبان کی طرف کم توجہ ہوتی گئی اور تاریخ سے متعلق کتابیں فارسی کے بجائے اُردو زبان میں لکھی جانے لگیں۔

حواشی

1 مولانا شبلی بہ حیثیت مؤرخ، پروفیسر خلیق احمد نظامی، معارف، مارچ 1986، 189

1 عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں تاریخ نگاری، پروفیسر اقتدار حسین صدیقی، تحقیقات اسلامی، 1989، ص 63

2 درحقیقت یہ کتاب دہلی سلطنت کی سب سے پہلی تاریخ ہے۔ اس میں سلطان شہاب الدین محمد غوری، قطب الدین ایبک اور التتمش کے حالات و واقعات اس میں درج ہیں حسن نظامی ان سلاطین کے عہد میں موجود تھا اس کو اصل واقعات حاصل کرنے کے ذرائع میسر تھے، اس لیے یہ کتاب معتبر سمجھی جاتی ہے۔ مگر یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں تاریخی مواد کم اور سلاطین کی مدح سرائی زیادہ ہے۔

3 بقول پروفیسر اقتدار حسین صدیقی 'طبقات ناصری خاص طور پر بارہویں صدی عیسوی سے وسط ایشیا، ایران اور ہندوستان میں مسلم حکمرانی پر تاریخ کا بہت اہم ماخذ ہے (تحقیقات اسلامی 1989، ص 50) ہیئت کے اعتبار سے یہ تاریخ عمومی تاریخ ہے طبقات ناصری اسلامی حکومت کی ایک بلند پایہ تاریخ ہے یہ کتاب 23 طبقات پر مشتمل ہے۔ اس کا اسلوب اپنی ہمعصر تاریخوں جیسے تاریخ یمینی اور راحۃ الصدور کے برعکس سادہ اور سلیس ہے۔

4 اس کو طبقات ناصری کا تتمہ کہا جا سکتا ہے۔ جس جگہ سے سراج نے طبقات ناصری لکھنا ختم کیا اسی جگہ سے ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی کا آغاز کیا، یعنی غیاث الدین بلبن کے عہد سے فیروز شاہ تغلق کے چھ سال کے عہد تک کے حالات درج ہیں۔

5 یہ کتاب بنیادی طور پر تاریخ عمومی عالم اسلامی کے ضمن میں آتی ہے۔ جو معزالدین محمد بن سام کے عہد حکومت سے شروع ہوکر مبارک شاہ کے حالات پر ختم ہو جاتی ہے۔ مبارک شاہ کے عہد کی یہ تاریخ ایک مفصل تاریخ ہے۔

6 اس میں صرف دس سال کے واقعات درج ہیں جب دس سال کے واقعات مرتب ہو چکے تو شاہی حکم سے اس کتاب کی ترتیب کا کام بند کردیا گیا۔

7 اُردو زبان میں تاریخ نگاری کی ابتدا، اقتدار حسین صدیقی، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، اکتوبر تا دسمبر 1998، ص 46،

8 اٹھارہویں صدی کے دوران ہندوستان میں فن تاریخ نگاری، ظہیر الدین ملک، ہندوستانی دور وسطیٰ کے مورخین، محب الحسن، ص 253،

■

Dr. Shahnaz Begum
3234, Kucha Pandit, Lal Kuan
Delhi - 110006
Mob.:9899730241
Email.: shahnaz.history@gmail.com

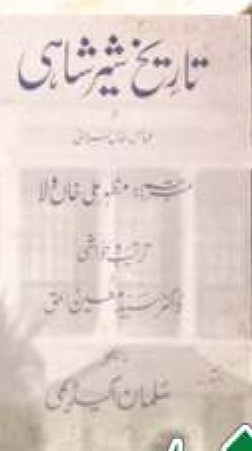

فورٹ ولیم کالج کی تاریخی تصنیفات کا مختصر تعارف

حنا کوثر

اردو زبان وادب کے فروغ میں مختلف دبستانوں، اداروں، کالجوں اور تحریکوں نے نمایاں اور بے پایاں کردار ادا کیا ہے۔ان کالجوں میں سے ایک اہم کالج فورٹ ولیم کالج (1800) تھا جو زبان وادب کی تاریخ کی نشوونما اور فروغ میں نمایاں حیثیت کا حامل رہا۔فورٹ ولیم کالج محتاج تعارف نہیں لیکن اس کے قیام واستحکام کے متعلق مختصراً ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کالج کے قیام اور اس کے استحکام کا سہرا گورنر جنرل لارڈ ویلزلی کے سر جاتا ہے۔ 1798 میں وہ گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے اور 1805 تک اسی عہدے پر قائم رہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم اپنی کتاب میں فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات اور اس کالج کے قیام کا پس منظر کچھ یوں پیش کرتی ہیں:

''گورنر ویلزلی کا عہد آتے آتے مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ فارسی کا بھی زوال ہو رہا تھا۔ ویلزلی نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مقامی حکمرانوں کو مغلوب کرنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ خوش قسمتی سے اسے ہر سیاسی محاذ پر فتح حاصل ہوتی گئی اور یوں جنوبی ہند سے لے کر شمالی ہند میں لکھنؤ کے نواب و وزیر تک کو اس نے اپنی پالیسیوں کے دام میں اسیر کر لیا...... سول ملازمین کو مذکورہ دونوں زبانوں سے واقف کرانے کے لیے ویلزلی نے باقاعدہ تعلیمی سلسلہ شروع کیا تا کہ نظام سلطنت عمدہ طور سے چلایا جا سکے اور برٹش حکومت کو مستحکم کیا جا سکے اس خیال کے پیش نظر اس نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ اورینٹل سیمیناری تھا...... ویلزلی کو اس زمانے کے انگریزوں میں گل کرسٹ ہندوستانی زبان کا ماہر نظر آیا چنانچہ اسی کی رائے سے یکم جنوری 1799 میں کلکتہ میں اورینٹل سیمیزی قائم کی گئی۔فروری 1799 میں جونیئر سول ملازمین کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ 'اورینٹل سیمیزی' میں ہی تعلیم حاصل کریں، چنانچہ نو وارد جونیئر سول ملازمین یہاں ایک سال تک تعلیم حاصل کرتے تھے۔اس ادارے کے دیگر مراحل اس کے قیام سے قبل ہی طے کر لیے گئے تھے۔ بحیثیت استاد گل کرسٹ کا تقرر 25 دسمبر 1798 میں ہوا۔ فروری 1799 سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہو گیا۔فورٹ ولیم کے قیام کے بعد اس ادارے کو ختم کر دیا گیا۔''[1]

اس ملک میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد سب سے بڑا مسئلہ در پیش آیا کہ اگر ملک میں حکومت کو مستحکم بنانا ہے تو یہاں کے عوام وخواص کی بولی اور رسم ورواج کا علم ہونا بہت ضروری ہے۔ گورنر ویلزلی کو یہ محسوس ہونے لگا کہ حکومت کا انتظام ہندوستانیوں کو ساتھ لیے بغیر ممکن ہی نہیں تو ان کے لیے اعلیٰ تعلیم کا انتظام شروع کیا جائے۔ 1781 میں وارن ہیگنز (Warren Hinged) نے کلکتہ میں مدرسہ عالیہ قائم کیا، جہاں مسلمانوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔اسی کے ساتھ ساتھ بنارس میں 1791 میں سنسکرت کالج کا قیام عمل میں آیا۔ان دو اداروں کے قیام کے بعد 1800 میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد لارڈ ویلزلی نے ڈالی جس کا اصل مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کو تعلیم دینا تھا کہ وہ ہندوستان میں بہتر خدمات انجام دے سکیں۔ ہندوستانی ادب و زبان کو کالج نے اس معیار تک پہنچایا جس کی اہمیت آج تک قائم و دائم ہے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو ہر لحاظ سے ہندوستانی زبان کے حامی تھے انھیں اس کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا، گرچہ اس کالج کے قیام کا مقصد انگریز آفسروں کو ایک تربیت گاہ فراہم کرنا تھا اس کے نتیجے میں ایک ایسی موثر تحریک وجود میں آ گئی جس نے اردو ادب کو زیادہ متاثر کیا۔

فورٹ ولیم کالج میں یونانی، لاطینی اور یورپ کی جدید زبانوں اور انگریزی ادب کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، بنگالی، مراٹھی اور تامل زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا لیکن مشرقی زبانوں بالخصوص اردو اور فارسی خاص توجہ کی حامل تھی کیونکہ مغلیہ سلطنت میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ ہندوستانی حکومت کے اختتام کے ساتھ ساتھ فارسی کا زوال قریب تر تھا اور اس کی جگہ ہندوستان کی عام بول چال کی زبان یعنی اردو عروج پر تھی۔اس ادارے کے قیام کے وقت اس زبان کا سرمایہ نہ کے برابر تھا صرف کچھ داستانوں اور مذہبی تحریروں کی شکل میں موجود تھا جو تعلیمی مقاصد کے لحاظ سے مختصر تھا اور اس ادارے کے منتظمین یہ ارادہ رکھتے تھے کہ وہ اپنے طالب علموں کو ایسی زبان میں تعلیم دیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم وقت میں لائق اور عالم بن جائیں۔ اسی مقصد کے لیے کالج نے ملک کے مختلف حصوں سے ادیبوں کو جمع کرنا شروع کیا اور ان سے عام فہم اور سادہ و سلیس زبان میں ایسی کتابیں ترجمہ و تصنیف کروائیں جن سے ہندوستان کے رہن سہن، رسم ورواج، عقائد، عادات و اطوار اور عوامی زندگی کے اہم پہلوؤں سے واقفیت ہو سکے۔نورالحسن نقوی اپنی کتاب 'تاریخ ادب اردو' میں گلکرسٹ سے متعلق رقمطراز ہیں:

''گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں رہ کر اردو زبان کی زبردست خدمت کی۔انھی کی کوشش سے کالج کے ساتھ ساتھ ایک بڑا کتب خانہ اور پریس بھی قائم کیا گیا تھا جس میں نستعلیق ٹائپ سے کتابیں چھاپی جاتی تھیں۔''[2]

فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی دور میں مختلف قسم کی پریشانی کے ساتھ ساتھ جب اردو کی تعلیم دینے کی شروعات ہوئی تو گلکرسٹ کی تحقیق کے مطابق اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جس کو ہندوستانی عام بول چال کی زبان کہا جاتا تھا اس کو گری پڑی بولی کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔اس زبان میں کوئی خاص مواد موجود نہیں تھا جو طلبا کے علم میں اضافہ کر سکے کتابوں اور مواد کی فراہمی کے لیے وہاں کے منتظمین نے اہل قلم کی تلاش میں اشتہار

جاری کیا۔ گلکرسٹ کی اس کوشش کی بنا پر کلکتہ میں سارے ملک کے دانشور و اہل قلم جمع ہونے لگے جو مختلف موضوعات اور زبانوں کے ماہر تھے۔ اردو زبان و ادب اور تاریخ نگاری کے خاص مصنفین میں میر امن، میر شیر علی افسوس، میرزا علی لطف، میر بہادر علی حسینی، میر حیدر بخش حیدری، کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، للو لال جی، مظہر علی خاں ولا، خلیل علی خاں اشک، سید بخشش علی فیض آبادی اور بنی نراین وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ گلکرسٹ کی کوششوں کے بارے میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اپنی کتاب میں اس طرح لکھا ہے۔

''گلکرسٹ کل چار سال شعبہ ہندوستانی سے وابستہ رہے۔............گل کرسٹ کی صدارت میں ہی ہندوستانی شعبے نے تصنیف اور تالیف کے میدان میں ایسے کارنامے انجام دیے جو ہمارے لیے باعث افتخار ہیں۔ انھوں نے فاضل منشیوں اور پنڈتوں کو ملازم رکھ کر ان سے نہ صرف درس وتدریس کا کام لیا بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی بروئے کار لائے۔''3

فورٹ ولیم کالج کے زیر نگرانی ترجمہ نگاری، تاریخ نگاری، مولف اور تالیف کی گئی کتابوں کے مطالعے سے یہ علم ہوتا ہے کہ اس ادارے میں عوامی دلچسپی کو نظر میں رکھتے ہوئے داستانوی ادب کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ ان داستانوں اور کہانیوں میں فارسی، سنسکرت اور ہندی زبان کے قصوں کو اردو زبان کے قالب میں ڈھال کر طالب علموں کی دلچسپی کا سامان مہیا کیا گیا جس سے داستان گوئی کے فن کو فروغ ملا انھیں داستانوی ادب سے ہندوستانی تہذیب و معاشرت کے اہم پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔ داستانوی ادب کے علاوہ اردو زبان وقواعد پر بھی اچھی خاصی کتب سامنے آتی ہیں۔

اردوادب میں تاریخ نگاری کی روایت کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوا، جو کسی حد تک ترجموں اور دوسری روایتوں کی مرہون منت رہیں کیونکہ ترجمے ہی اردو میں تاریخ نگاری کی ابتدائی روایت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج نے بڑی تعداد میں اردو میں تاریخ نگاری کے موضوع پر کتابیں ترجمہ وتالیف کی ہیں۔ تاریخ نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر شہناز بیگم نے اپنی کتاب میں اس طرح ذکر کیا ہے:

''اردو تاریخ نگاری کی روایت کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں ہوا......اس سلسلے میں فورٹ ولیم نے نمایاں کارنامہ انجام دیا کیونکہ اردو نثر کی تصنیف و تالیف نیز تراجم کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج کے تحت شروع ہوا۔ فارسی کی چند تاریخ کے موضوع سے متعلق کتابوں کو بھی اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش ہوئی لیکن فورٹ ولیم کالج سے قبل چند اردو میں تاریخیں مل جاتی ہیں۔ ان میں 'قصہ و احوال روہیلہ' ہے جسے محققین نے اردو میں تاریخ کے موضوع پر پہلی کتاب مانا ہے۔

فورٹ ولیم کی ان خدمات سے مابعد کے مصنفین میں تحریک پیدا ہوئی اور انھوں نے ابتدائی کوششوں کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اردو تاریخ نگاری کے تصنیفی رجحان کو بھی فروغ دیا......''4

تاریخ نگاری سے متعلق فورٹ ولیم کالج میں جو بھی ترجمہ نگاری یا تصنیف وتالیف عمل میں آئی اُن میں یہ مصنفین خاص طور پر اہمت کے حامل ہیں۔ جیسے بہادر علی حسینی، میر شیر علی افسوس، سید بخشش علی فیض آبادی، حیدر بخش حیدری، مظہر علی خاں ولا، مرزا کاظم علی جوان اور خلیل علی خاں اشک وغیرہ۔ ان مصنفین کی تاریخی کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

تاریخ آشام: ولی احمد شہاب الدین تالش کی فارسی تاریخ کا ترجمہ' تاریخ آشام' کے نام سے بہادر علی حسینی نے 1805 میں مکمل کیا تھا۔ یہ ایک تاریخی واقعے پر محیط ہے جو کہ آسام کی طرف کوچ کا ہے جس میں اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کی سلطنت میں نواب عمدۃ الملک میر محمد سعید جو کہ آشام (آسام) کی مہم تھی اسی پر پورا واقعہ بیان کیا اس مہم میں کیا کیا واقعات پیش آئے کیونکہ اس مہم کے سفر میں ولی محمد شہاب الدین نواب کے ہمراہ تھے جن کی وجہ سے تمام سفر کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا نام فتحیہ عبرت تھا۔ اس کتاب میں دو سفر کے واقعات ہیں پہلا بہار اور دوسرا آسام۔ آسام کی فتح کے لیے لشکر کے کوچ سے لے کر اس مہم میں آنے والی تمام دشواریوں جیسے راستے کی آب وہوا کی ناواقفیت کا ذکر بھی ہے۔ 'تاریخ آشام' میں مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے فتح تک کے حالات کا ذکر ملتا ہے۔

'تاریخ آشام' صرف ایک تاریخی کتاب ہی نہیں بلکہ اُس وقت کے آسام کے سیاسی، سماجی، فکری، معاشی حالات پر ایک مکمل دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب میں بہادر علی حسینی نے جو زبان استعمال کی ہے وہ صاف، سادہ، رواں اور بامحاورہ ہے لیکن بعض جملوں میں بڑی بے کیفی اور الجھاؤ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ترجمے میں انہوں نے کہیں کہیں مقامی زبان اور ہندی کے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو بوجھل پن کا احساس دلاتا ہے جس سے روانی میں کمی محسوس ہوتی ہے۔

آرائش محفل: میر شیر علی افسوس نے کتاب 'خلاصۃ التواریخ' کے ایک حصے کا ترجمہ 'آرائش محفل' کے نام سے مسٹر ہارنگٹن اور کالج کونسل کی فرمائش پر کیا جو تقریباً 1805 میں مکمل ہوا۔ 'خلاصۃ التواریخ' منشی سبحان رائے بھنڈاری کی تاریخی کتاب ہے جس میں انھوں نے اٹھارہ صوبوں کے احوال اور مسلم سلاطین کے مختصر تذکرے بھی شامل کیے ہیں۔

افسوس نے اصل ماخذ کے مطابق 'آرائش محفل' میں حذف و اضافے کا سہارا لیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی ابتدا میں ہندوستان کی تعریف وتوصیف ذکر کرتے ہوئے اپنے ملک کی آب وہوا اور جغرافیائی حالات کا ذکر کیا ہے۔ اپنے ملک کے اختصاص کا ذکر کرتے ہوئے پھل، پھولوں، میووں، جانوروں، علم وکمال، رسم ورواج، تجارت، فقیری وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ افسوس نے 'آرائش محفل' میں 22 صوبوں کے علاوہ کچھ ایسے مقامات کا ذکر بھی کیا ہے جو اصل کتاب میں موجود نہیں۔ جیسے ناول، مرزاپور، مرشدآباد، ہوگلی، بندر ہوگلی، کلکتہ اور چندن نگر وغیرہ۔

راجاؤں اور سلاطین کے ذکر میں افسوس نے راجہ جدہشٹر سے لے کر پرتھوی راج (پتھورا) تک کا احوال شامل کیا۔ ترجمے میں انھوں نے حرف بہ حرف اور لفظ بہ لفظ کی پیروی کی ہے اور بعض جگہ پر صرف مفہوم ہی کو ادا کیا ہے۔

'آرائش محفل' تاریخی لحاظ سے بے حد اہم کتاب ہے اور جو زبان وبیان کے اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ افسوس نے تاریخی بیانات کو بے حد دلکش انداز میں اور شہروں کے بیان میں وجہ تسمیہ کا خیال بھی رکھا ہے۔

کلی طور پر جب ہم 'آرائش محفل' کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ کتاب زبان وبیان کا ایسا نمونہ لگتی ہے کہ جس سے اس دور کی نثری کاوش کا گمان ہوتا ہے۔

اقبال نامہ: 'اقبال نامہ' جو کہ منشی غلام حسین کی کتاب فارسی تاریخ 'سیر المتاخرین' کے ایک حصے کا ترجمہ ہے۔ سید بخشش علی نے ولیم ٹیلر اور مارٹن کی فرمائش پر اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب میں مترجم نے انگریزوں کی ابتدائی حکومت، شجاعت وبہادری اور عدل وانصاف کا ذکر حسب ضرورت تفصیل ومبالغہ آرائی سے کیا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل کی تاریخ نہیں ملتی لیکن جب یہ فورٹ ولیم کالج تبصرے کے لیے پہنچی وہ سنہ 1825 تھا۔

'اقبال نامہ' انگریزوں پر مدحیہ کلمات کی کتاب ہے۔ جو سراج الدولہ کے جنگی واقعات کے ذکر سے شروع ہوتی ہے۔ بخشش علی نے اس کتاب میں سراج الدولہ کا کلکتہ پر حملہ اور انگریزوں کی حکمت عملی، ان کی فہم وفراست، غور وفکر کی تعریف کرتے ہوئے سراج الدولہ کی جنگ میں شکست ہونا، قید ہونا اور قتل کیے جانے کا ہولناک منظر پیش کیا ہے جو روح کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔

'اقبال نامہ' میں ہندوستانی حکومت کے آخری دور کی تاریخ بیان کی گئی ہے جس میں نوابین یا امرا کے جنگی

حالات اور ان کا انگریزوں سے شکست یا صلح کرنا ان تمام حوالوں کا ذکر کیا گیا ہے جو تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس تاریخی کتاب میں تاریخی تسلسل پایا جاتا ہے۔ خاص تاریخی ہستیوں کے علاوہ ان کے درمیان جو بھی معمولی معاملات ہوئے ان کا ذکر بھی ملتا ہے۔ خاص طور سے بنگال کی تاریخ کے حوالے سے یہ کتاب ایک آسان اور عمدہ دستاویز بھی ثابت ہوئی۔

بخشش علی نے 'اقبال نامہ' کی زبان و انداز بیان کو بہت ہی دلچسپ اور عام فہم گفتگو کے انداز میں لکھا ہے جس کی وجہ سے اس کے بیان میں لطف محسوس ہوتا ہے۔

تاریخ نادری: 'تاریخ نادری' نادر شاہ منشی محمد مہدی کی فارسی تصنیف ہے۔ جس کتاب کا ترجمہ حیدر بخش حیدری نے 1809 میں ولیم ٹیلر کے کہنے پر 'تاریخ نادری' کے نام سے کیا۔ اس تاریخی کتاب میں نادر شاہ کے حالات زندگی اور ایران کی بہت مفصل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں نادر شاہ کی پیدائش، عقد، اولاد، تخت نشینی، مہموں اور عادات واطوار وغیرہ کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب میں تقریباً ایک سو تیرہ تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اس کتاب کے متعلق جو بیان کیا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں:

''تاریخ نادری سے اس زمانے کے ایران کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس سے علم ہوتا ہے کہ ایران میں سکون واطمینان کا فقدان تھا۔ حکومت اور اقتدار کے لیے سیاسی کشمکش عروج پر تھی۔ ارباب حل وعقد سازشوں اور طرح طرح کی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے..... منشی محمد مہدی نے نادر شاہ کی بے انتہا تعریف وتوصیف کی ہے جس سے جانب داری کی بو آتی ہے۔ نادر شاہ ظالم و جابر اور مطلق العنان حکمراں تھا لیکن مصنف نے بادشاہ کی کمزوریوں اور خامیوں پر پردہ ڈالنے یا اس کے بہیمانہ سلوک کے اثر کو کم کرنے کے لیے طرح طرح کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔''[5]

اس تاریخی کتاب میں سید حیدر بخش حیدری نے زبان وبیان پر زیادہ توجہ مرکوز نہیں کی بلکہ انہوں نے اصل کی طرح ہو بہو ترجمہ کر دیا جس وجہ سے بعض جگہوں پر پڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اس کی اصل فارسی ہے یا اردو جبکہ ایسی عبارتیں کم ہی ہیں۔ اس ترجمہ میں قابل دید چیز ترکی الفاظ کی مختصر فرہنگ ہے جو اہمیت کی حامل ہے۔

تاریخ شیر شاہی: مظہر علی خاں ولا کی ایک اہم تاریخی کتاب 'تاریخ شیر شاہی' ہے جو ناقابل فراموش ہے۔ فارسی کی تاریخی کتاب 'تاریخ تحفۂ اکبر شاہی' کے تیسرے طبقے کا ترجمہ 'تاریخ شیر شاہی' کے نام سے مظہر علی خاں نے کیپ ماونٹ کی فرمائش پر کیا۔ یہ کتاب 1805 میں مکمل ہوئی جس کا ذکر ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اپنی کتاب میں اصل متن کے حوالے سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے ملاحظہ فرمائیں:

''ترجمہ شیر شاہی کا پانچویں تاریخ جمادی الاول بعد از نماز جمعہ سنہ بارہ سے بیس ہجری مطابق دوسری ماہ اگست سنہ اٹھارہ سو پانچ عیسوی میں سرانجام ہوا۔''[6]

'تاریخ شیر شاہی' اصل میں شیر شاہ سوری کے عہد حکومت کی تفصیلی تاریخ ہے، جس کی ابتدا سلطان بہلول لودی کی دہلی پر تخت نشینی سے ہوئی۔ اس کتاب میں پٹھانوں کا ذکر بھی ملتا ہے اور زیادہ تر شیر شاہ کے متعلق ہی تفصیلی بیان ملتا ہے جیسے ان کی پیدائش، زندگی کے حالات تحصیل علم، سیاسی میدان میں کس طرح قدم رکھا وغیرہ اس کے علاوہ شیر شاہ صرف سلطنت کے حصول و فروغ ہی میں کوشاں نہیں تھے بلکہ وہ بہترین منتظم بھی تھے ان کی حکومت میں ہر خاص وعام محفوظ و مطمئن تھا۔

مظہر علی خاں نے اس کتاب میں اس بات کا خصوصی خیال رکھا ہے کہ کوئی تاریخی واقعہ نہ چھوٹنے پائے جس کے بنا پر لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے کی کوشش کی اور روانی، سادگی اور سلاست و انداز بیان کا لحاظ بھی رکھا ہے۔ اس کتاب کے ترجمے میں فارسی کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

جہاں گیر شاہی: مظہر علی خاں ولا کی ایک اور نادر تاریخی کتاب 'جہاں گیر شاہی' جو فارسی تاریخی کتاب 'اقبال نامۂ جہاں گیری' کا مفصل ترجمہ ہے جس کو مظہر علی ولا نے 1809 میں مکمل کیا۔ اس کتاب میں بادشاہ جہاں گیر کے عروج کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔ اس تاریخی کتاب کی ابتدا شاہجہاں گیر کی تخت نشینی، ارکان حکومت اور دیگر دوسرے امرا وروسا کے عہدوں کی تقسیم وترقی کے ذکر سے ہوتی ہے۔

ترجمہ نگار نے اس کتاب میں خاص واقعات پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہے۔ جیسے بادشاہ شاہ پرویز کے ذریعے رانا کا استقبال، دوسرے چھوٹے چھوٹے تاریخی واقعات کا ذکر پیش کیا ہے جس کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ترجمہ نگار نے اس کتاب کے ذریعے اُس دور کی سماجی معاشی ثقافتی، معاشرتی حالات، سیاسی حالات پر تفصیلی معلومات پیش کی ہے۔ یہ کتاب شاہجہاں کی 22 سالہ حکومت پر محیط ہے جو فتوحات، جنگ وجدال، عادات واطوار، شجاعت، دریا دلی کے بیانات سے پُر ہے جس میں بادشاہ کے کردار کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کو اصل کا عکس کہا جاتا ہے کیونکہ حرف بہ حرف یکساں ہے۔ بادشاہ کی حکومت کا صرف ایک پہلو ہی نظر آتا ہے جبکہ اصل میں دوسرا کچھ اور ہی ہے۔

مظہر علی خاں ولا نے اس کتاب کے ترجمے میں بہت ہی صاف، سادہ سلیس، آسان و دلکش زبان کا استعمال کیا ہے۔ ولا کے انداز بیان میں شگفتگی بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

انتخاب سلطانیہ: مسٹر مارونٹ رکٹس کے کہنے پر خلیل علی خاں اشک نے 1805 میں 'انتخاب سلطانیہ' کو تالیف کیا۔ اشک نے اس کا تاریخی نام دیا ہے جو کہ اسی کتاب کے دیباچے میں شامل ہے جس کا ذکر وہ کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ اس کتاب میں شاہ عالم کے شہر کے مختلف بادشاہوں کے احوال مذکور ہیں اس لیے اس کتاب کا نام 'انتخاب سلطانیہ' رکھا ہے۔ یہ کتاب ابھی بھی غیر مطبوعہ ہے جو کہ ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔

اس تاریخی کتاب کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ کسی خاص کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ متعدد کتابوں سے اخذ کرکے اپنے الفاظ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں دلی سلطنت کی بنیاد سے شاہ عالم بادشاہ تک تمام شاہوں کا حال اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تاریخ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ معراج الدین شام کا ہندوستان میں داخل ہونا، فتح وکامرانی، نظم ونسق اور غلام قطب الدین ایبک کو اپنا قائم مقام مقرر کرنا اور اس کی واپسی کا ذکر ہے۔ اس کے بعد قطب الدین ایبک، غلام بادشاہ، خلجی، تغلق، لودھی، پٹھان اور مغل بادشاہوں کے مختصر اور جامع تاریخی حالات اور واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بادشاہوں کا مختصر، جامع تاریخ اور اجمالاً اہم واقعات درج کیے گئے ہیں۔

'انتخاب سلطانیہ' اشک کی تاریخی کتاب کے ساتھ ساتھ مولف کے حالات زندگی کی تفصیل کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس کتاب میں اشک نے صاف، سلیس اور سادہ زبان استعمال کیا ہے جبکہ اس کے اسلوب میں پیچیدگی نظر آتی ہے کیونکہ اس میں اشک نے مقامی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔

حواشی

1. فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات: عبیدہ بیگم، نصرت پبلشرز لکھنؤ 1893، ص 30-28،
2. تاریخ ادب اردو، نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکٹ علی گڑھ 2010، ص 264
3. فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات: عبیدہ بیگم، ص 89
4. اردو میں تاریخ نگاری کی تاریخ: ابتدا اور ارتقا (اٹھارہویں صدی سے لے کر 1947 تک) ڈاکٹر شہناز بیگم، جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی 2008، ص 357
5. فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات۔ عبیدہ بیگم، ص 527
6. ایضاً، ص 530

■

Dr. Hina Kausar
Nai Aabadi, Berola, Jafrabad
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:9319215561

ساجد جلالپوری

پروفیسر مجاور حسین رضوی (ابن سعید) سے

خصوصی ملاقات

اردوادب کے ایک عظیم ادیب، ناول نگار، صحافی، خانقاہ اردو کے مجاور، نستعلیقی شخصیت پروفیسر مجاور حسین الٰہ آبادی جو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے سبکدوش ہوکر 92 سال کی عمر میں لکھنؤمیں اپنے بیٹے کے یہاں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس ضعیف العمری میں کہیں آنا جانابھی مشکل ہے لیکن انھوں نے اردو ادب میں ایک زمانہ دیکھا ہے اور جاسوسی ورومانی ناولوں‌سے دلچسپی رکھنے والی ایک نسل کی آبیاری کی ہے۔ وہ عہد قدیم کی یادگار ہیں انھوں نے فراق گورکھپوری کو دیکھا ہی نہیں ان کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ پروفیسر اعجازحسین، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسیح الزماں، پروفیسر عقیل رضوی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر ڈاکٹر رفیق حسین وغیرہ جیسے سیکڑوں ادیبوں، شاعروں کے بہت قریب رہے ہیں۔ دبستان الٰہ آباد سے لے کر دبستان حیدر آباد تک کی تمام داستانیں، واقعات، آج بھی وہ بڑے خوبصورت، دلنشیں اندازواسلوب میں بیان کرتے ہیں‌کہ انسان بغور سنتارہے۔پیش ہے اس سلسلے میں عزادارحسین ساجد جلالپوری کی ان سے خصوصی گفتگو۔

ساجدجلالپوری: محترم اپنامختصرتعارف پیش کریں؟

پروفیسرمجاور حسین: میرا اصلی نام مجاور حسین رضوی ہے۔ قلمی نام'ابن سعید'اس وجہ سے ہے کہ میرے والد کا نام علی سعید تھا۔میرا اصل وطن مچھلی شہرمحلّہ سیدواڑہ ضلع جونپور ہے۔لیکن میں یک لخت چالیس سال الٰہ آباد میں رہاہوں۔میری پیدائش سرائے قاضی بلریا گنج ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔اس زمانے میں میرے والد وہیں کسی ریاست میں ملازم تھے۔

س ج : آپ کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی ؟

م ح د: اسکول سرٹیفکٹ کے مطابق 1932 ہے لیکن میرے والد کی تحریر کے مطابق 28 دسمبر 1928 ہے۔

س ج: اپنے خاندانی حالات اور وطن کے بارے میں کچھ اظہارخیال فرمائیں؟

م ح د: ہمارے خاندان میں ڈاکٹر اشتیاق حسین اور ڈپٹی کلکٹر مختار حسین اور سید محمد نوح شہیر مچھلی شہری جن کا مشہور شعرآپ کو یاد ہوگا۔

فانوس بن کے آپ حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

یہ منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھےاور منیر صاحب ناسخ کے شاگرد تھےاور مجاہد آزادی تھے جن کو کالا پانی کی سزادی گئی تھی۔

نانیہالی اعزا میں سب پاکستان ہجرت کر گئے۔ بعض لوگ بہت مشہور ہوئے جیسے فہیم اعظمی میرے حقیقی بہنوئی تھے انھوں نے پاکستان سے ایک رسالہ'صریر' بھی نکالا تھا۔ میرے نانا بھی شاعر تھے۔ نانا کے والد باقر میاں بھی شاعر تھے ان کا ایک شعر بہت مشہور ہے۔

کون تھا کون نہ تھا اب اسے پہچانے کون
لے گیا دل مرا در پردہ خدا جانے کون

لیکن میرے اندر جو بھی ادبی ذوق پیدا ہوا وہ اسلامیہ کالج

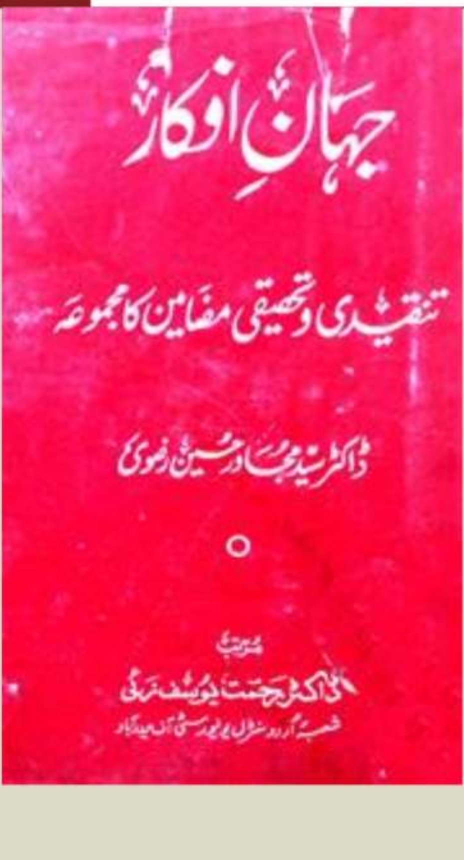

گورکھپور کا ادبی ماحول اور خاص طور سے ملک زادہ منظور احمد کی قربت و دوستی تھی۔

س ج: مچھلی شہر کے ادبی حالات کیا تھے؟

م ح د: یہاں پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ محفل کا خاص طور پر اہتمام ہوتا تھا۔ سرکار دو عالمؐ اور ائمہ طاہرینؑ کی ولادت کے موقع پر محفل بجتی تھی۔ مچھلی شہر کے مشہور لوگوں میں پہلا نام متین مچھلی شہری کا آتا ہے جو یادگار داغ کے نام سے مشہور ہیں۔ دوسرے شہیر مچھلی شہری۔ تیسرے ماڈرن عہد کا سب سے مشہور نام سلام مچھلی شہری تھے جو ترقی پسندوں میں شمار کیے گئے لیکن نیشنلسٹ ہونے کی وجہ سے ترقی پسند مصنفین میں نہیں شامل کیے گئے۔

س ج: کیا آپ کا بھی ترقی پسند تحریک سے تعلق تھا؟

م ح د: نہیں میرا تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ اس زمانے میں تقریباً جو بھی نئی نسل تھی ظاہری طور پر بانا کی چپل، لمبی مہری کا پائجامہ، لمبا کرتا اور نہرو جیکٹ پہنتی تھی اور ایک جملہ سب کو یاد تھا کہ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔'' یہ پریم چند کا 1936 کا وہ خطبہ صدارت تھا جو مینوفسٹو ہو گیا تھا۔

لیکن میرے استاد آنجہانی رگھوپت سہائے فراق گھورکھپوری یہ کھل کر کہتے تھے کہ ''شاعر کا کمٹمنٹ نہیں ہوتا، شاعر آزاد ہوتا ہے، آپ اس کے خیال کو بیڑی نہیں پہنا سکتے۔'' انھوں نے مجھے بی۔ اے میں پڑھایا تھا۔

س ج: آپ کی تعلیم و تربیت کہاں ہوئی؟

م ح د: ہائی اسکول وانٹر میڈیٹ میاں صاحب جارج اسلامیہ کالج گورکھپور سے پاس کیا جہاں ملک زادہ منظور احمد میرے ہم جماعت ہم محلّہ اور پڑوسی بھی تھے۔ بی اے، ایم اے الٰہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا اور وہیں سے پروفیسر مسیح الزماں کی نگرانی میں ''اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر'' موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مالی و معاشی مشکلات کی وجہ سے بی اے کر کے ہی نوکری کر لی۔ میرے خسر امیر حیدر صاحب ایک کمپنی میں منیجر تھے۔ انھوں نے ہی مجھے ایک سو تیرہ روپیہ ماہ وار کی نوکری دلائی۔ یہ 1949 کی بات تھی۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔

س ج: آپ نے ناول نگاری کا آغاز کب کیا؟

م ح د: میں نے پہلا ناول 'بازار' لکھا جو فروری 1953 میں شائع ہوا۔ جو میں نے ایک انگریزی ناول سے استفادہ کیا تھا اور آخر میں لکھ دیا تھا مستعار۔ میری فیورٹ تھیں اگاتھا کرسٹی۔

ہم نے ابن صفی کو دریافت بھی کیا، ان سے لکھوایا، شائع کیا، مقبول بنایا چونکہ وہ بہت باصلاحیت تھے۔

س ج: آپ کی ابن صفی سے ملاقات کیسے ہوئی؟

م ح د: ہماری ان کی ملاقات الٰہ آباد یونیورسٹی میں ہوئی۔ ہم دونوں الگ الگ کالجوں سے انٹر پاس کر کے بی۔ اے میں پہنچے دونوں کے دو مضامین مشترک تھے۔ اردو اور فلسفہ۔ ہمارے ایک استاد تھے حفیظ سید۔ ان کی چال بالکل صاف شفاف، حاشیوں پر سفید بالوں کے لچھے تھے اور خاص طور سے پیچھے وہ خاص وضع سے یوں بال لٹکائے رہتے تھے لگتا تھا کہ داڑھی ہے۔ کلاس میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے تو انھوں نے مجھے ٹہوکا مارا کہ ابے دیکھ دیکھ ہمارے سر کے پیچھے داڑھی ہے۔ سر تو ٹیچر کے لیے بھی کہتے ہیں تو حفیظ سید صاحب نے بھی سن لیا وہ چھڑی لے کر مارنے آئے اور یہ بھاگے مگر سر نے ان کو پکڑ لیا تو ابن صفی نے کہا سر معافی چاہتا ہوں۔

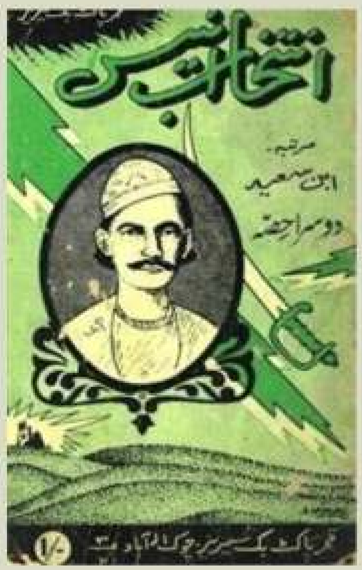

وہیں معلوم ہوا کہ حسن منزل جہاں میں رہتا ہوں اسی کے سامنے پندرہ عدد منزل کوارٹر میں یہ بھی رہتے ہیں اب ملاقات ہونے لگی۔ اسی میں عباس حیدر حسینی صاحب جو بعد میں ہمارے برادر نسبتی بھی ہوئے وہ ریلوے میں گارڈ تھے۔ وہ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان جانا چاہتے تھے لیکن ٹرین چھوٹ گئی اور ٹنڈلا یا خورجہ سے لوٹ آئے۔

س ج: آپ کے صحافتی سفر کا آغاز کیسے ہوا؟

م ح د: الٰہ آباد کے بہادر گنج سے ایک اخبار نکلتا تھا 'نیا دور' اس میں ہم رکھ لیے گئے۔ نعیم صدیقی صاحب وہ نکالتے تھے۔ ہمیں پندرہ روپیہ مہینہ ملتا تھا لیکن انھوں نے ہم کو بالکل اخبار کا ایڈیٹر ہی بنا دیا تھا۔ چنانچہ الٰہ آباد میں 18 جنوری 1948 کو فساد ہوا تو ہم نے اس کو کور کیا اور ایک ایک آدمی کا نام لکھا تھا کہ یہ آدمی فلاں دکان میں آگ لگا رہا تھا یہ آدمی فلاں دکان میں۔ اور دلچسپ بات یہ تھی کہ جو آدمی مسلمان کی دکان میں آگ لگا رہا تھا وہ بعد میں مسلمانوں کا سب سے بڑا ہمدرد ہو گیا۔ وہ بعد میں ایم ایل اے بھی ہوئے اور ہمیشہ مسلمان ووٹ سے کامیاب بھی ہوئے۔ اس طرح ہم اپنے کو ایک بڑا صحافی تسلیم کرنے لگے۔ حالانکہ اخبار سے وابستگی کا سلسلہ کچھ دن ہی چلا۔

س ج: نکہت پبلی کیشنز سے آپ کا خصوصی ربط رہا ہے اس سلسلے میں آگاہ فرمائیں؟

م ح د: خصوصی ربط ہی نہیں میں اس کے بنیاد گزاروں میں رہا ہوں۔ دو ہی آدمی تھے عباس حسینی صاحب جو میرے برادر نسبتی تھے میری بیوی کے بڑے بھائی، دوسرا میں۔ 1947 میں جب ملک تقسیم ہوا تو عباس حسینی صاحب کو بیوی کی طرف سے بڑی زمینداری ملی تھی اسے فروخت کیا اس زمانے میں بہت بڑی رقم پانچ، چھ ہزار روپیہ ملا تھا۔ تو سوچا ان پیسوں کا کیا کریں۔ ان کے اندر امنگ تھی جذبہ تھا تو سوچا کہ ہم رسالہ نکال سکتے ہیں۔ تو ہم سے مشورہ کیا۔ یونیورسٹی میں ہمارے استاد تھے مسیح الزماں صاحب انھوں نے اور ہم نے کئی نام تجویز کیے۔ ہم نے ایک نام تجویز کیا 'نُگہت'، مگر استاد نے ڈانٹ کر کہا یہ کوئی لفظ نہیں غلط العام ہے۔ صحیح لفظ ہے 'نکہت' اور ہم کو یاد کرایا۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تو عباس حسینی صاحب اور ہم نے نکہت نام سے پہلا شمارہ فروری 1948 میں نکالا۔ بعد میں سلام مچھلی شہری صاحب بھی مدیر اعزازی ہو گئے۔ پھر اس میں ابن صفی یعنی اسرار صاحب کا بھی نام جانے لگا تھا۔ اسی زمانے میں اسرار صاحب 'طغرل فرغان' کے نام سے طنزیہ مضامین نکہت میں لکھنے لگے تھے۔ چونکہ وہ نقل کرنے میں ماہر تھے۔ تو ہم کو یہ لگا کہ جو آدمی جسمانی طور پر اتنی اچھی نقل کر سکتا ہے وہ تحریری طور پر بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ نکہت سے ان کا تعلق پہلے شاعر کی حیثیت سے ہوا۔ بڑا اچھا ترنم تھا۔ ان کی نظم ہم نے شائع کی تھی 'مرگھٹ کا پیپل' اسی سے معلوم ہوا کہ اس شخص کی سوچ سب سے الگ ہے۔ پھر دو تین مضامین اور لکھے ان میں تھا ایک ادبی مشاعرہ جس میں سردار جعفری کا نام رکھا سردار ابولبول، میراجی کا ہیراجی۔ اس طرح انھوں نے مضامین لکھنے شروع کیے۔ جس میں مزاح کا عنصر غالب تھا۔ آگے چل کر وہ جاسوسی ناول لکھنے لگے۔

س ج: کیا نکہت کے علاوہ بھی دیگر رسالوں میں آپ کی تخلیقات شائع ہوئیں؟

م ح د: اس سلسلے میں میری پہلی تخلیق گیان چند جین پر جو مجھے دلی کالج سے کھینچ کر یونیورسٹی میں لائے تھے ان کی شخصیت پر تھی جو ماہنامہ 'شاعر' 1979 میں شائع ہوئی۔ یہ مضمون بہت مقبول ہوا بعد میں حیدرآباد اور پاکستان میں

بھی شائع ہوا۔

س ج: اس زمانے میں کتب ورسائل سے عوام کی کیا دلچسپی تھی؟

م ح د: کوئی دلچسپی نہ تب تھی نہ اب ہے اور تب بھی تھی اور اب بھی ہے۔ ایک طبقہ ہے جو دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کی روزی روٹی کا سوال ہے۔ کچھ اس لیے دلچسپی رکھتا ہے کہ الیکشن میں ان مسائل کو اٹھانے سے ووٹ مل سکتے ہیں۔ بس یہی چھوٹا سا طبقہ ہے، جن کو لکھنے پڑھنے سے دلچسپی ہے۔

س ج: سنا ہے ابن صفی کے ناولوں کے حقوق بھی آپ کے پاس ہیں؟

م ح د: ابن صفی کا معاملہ یہ ہے کہ ہم نے دوسرے ایڈیشن کا سلسلہ شروع بھی کیا لیکن لوگوں نے ایک ایک ناول اس طرح محفوظ کر لیا کہ لائبریری سسٹم بھی چلنے لگا۔ دوسری بات یہ کہ ان کی وہ مقبولیت بھی اب نہیں رہ گئی جو اس وقت تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ حافظے کی زینت ہیں۔

کوئی بھی زبان جب تک انسان رہے گا تب تک زبان رہے گی اور ترسیل و ابلاغ کا عمل جاری رہے گا یہاں تک کہ لوگوں نے سنسکرت کو اعلان کردیا کہ ختم ہوگئی لیکن دیکھیے وہ پھرسے زندہ ہوگئی۔کوئی زبان نہیں مرتی۔ہم آپ سے بات کریں گے۔لفظ ڈھونڈھیں گے لفظ تراشیں گے تو زبان وجود میں آئے گی۔اس طرح لسانیات کاسلسلہ جاری رہے گا۔

س ج پ: سنا ہے آپ کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے؟

م ح د: ہاں، میں نے مختلف ناموں سے لکھا ہے۔ ہندی میں زیادہ اردو میں کم۔ اردو میں 75 ناول ابن سعید کے نام سے لکھے ہیں تقریباً ساٹھ ناول دوسرے ناموں سے۔ ہندی میں شمبھو پرساد، اشوک سنگھ، پریم پرکاش کے ناموں سے لکھا ہے۔ میرے کل ناولوں کی تعداد ایک ہزار پینسٹھ ہے۔ جن میں سے کچھ بازار، رات کا دیپ، بھیگی راتیں، کالی چٹانیں، پھول اور انگارہ، مسکراتی کلیاں، نئی دنیا نئے لوگ، کتاب اور پھول، خاندان، مہمان وغیرہ۔ خیر کہاں تک گناؤں۔

جہان افکار (مضامین کا مجموعہ)، صدق عظیم (سرکار دوعالمؐ، حضرت علیؑ، امام حسینؑ پر خطبات کا مجموعہ 'جو حیدرآباد سیمینار کے لیے لکھا گیا')

س ج: حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں خدمات اور شعبے کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں؟

م ح د: جب وہاں اردو شعبہ قائم ہوا تو گیان چند جین پہلے صدر شعبہ ہوئے۔ میں وہاں 1979 سے 1992 تک چودہ سال شعبے سے وابستہ رہ کر سبکدوش ہوا۔ میرے علاوہ وہاں پر پروفیسر ثمینہ شوکت، پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر سیدہ جعفر صاحبہ بھی تھیں۔

س ج: الہ آباد اور حیدرآباد کے ادبی مراکز سے آپ کا تعلق رہا ہے اردو کے سلسلے میں دونوں شہروں میں کیا فرق ہے؟

م ح د: زمین آسمان کا فرق ہے۔ الہ آباد میں ایک مخصوص علاقہ تھا۔ پھر یونیورسٹی شعبہ اردو میں مختلف محلوں کے لوگ تھے وہاں چھوٹی چھوٹی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن حیدرآباد ایک دمدار ماحول تھا۔ وہاں ہر علاقے میں اردو کا بول بالا تھا۔ دارالشفا منڈی میر عالم۔ عنایت جنگ کی دیوڑھی جہاں میر انیس نے مرثیہ پڑھے تھے۔ یہاں خصوصی ادبی نشستیں ہوتی تھیں، اچھا خاصا مجمع ہوتا تھا، وہاں اردو صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔ ویسے تو دوسری سرکاری زبان یہاں بھی اردو ہے مگر اردو کے سلسلے میں وہ سرگرمی نہیں ہے زیادہ تر کام ہندی میں ہی ہوتے ہیں۔

س ج: آپ نے تقریباً نوے سال اردو کے عروج وزوال کے سلسلے میں دیکھا ہے اس پس منظر میں کچھ اظہار خیال فرمائیں؟

م ح د: دیکھیے کوئی بھی زبان جب تک انسان رہے گا تب تک زبان رہے گی اور ترسیل وابلاغ کا عمل جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے سنسکرت کو اعلان کر دیا کہ ختم ہوگئی لیکن دیکھیے وہ پھر سے زندہ ہوگئی۔ کوئی زبان نہیں مرتی۔ ہم آپ سے بات کریں گے۔ لفظ ڈھونڈھیں گے لفظ تراشیں گے تو زبان وجود میں آئے گی۔ اس طرح لسانیات کا سلسلہ جاری رہے گا۔

س ج: کیا شاعری سے بھی آپ کا ربط رہا ہے؟

م ح د: میں نے جو کلام موزوں کیا ہے اس لائق نہیں کہ آپ کو سنایا جاسکے وہ صرف بے تکلف احباب کی محفل کے لیے ہوتا تھا اور فحش ہوتا تھا۔ لیکن اس سے ہٹ کر مجھے شاعری سے جنون کی حد تک دلچسپی رہی ہے۔ اب اس وقت جب کہ میری عمر نوے سال سے متجاوز ہو چکی ہے اس حالت میں بھی بہر حال ہزار شعر یاد ہیں۔ ملک زادہ منظور احمد جو میرے ہم جماعت تھے ایک بار کالج میں نوٹس بورڈ پر شعر لکھ کر چیلنج کیا تھا جس کا جی چاہے مقابلہ کرے تو میں نے اس کا مقابلہ کیا تھا۔ کئی گھنٹے مقابلے کے بعد اساتذہ کی موجودگی میں دونوں برابری پر چھوڑ دیے گئے۔ تو شعر ہم کو بہت یاد ہیں لیکن شاعری نہیں کی صرف ایک شعر کہا ہے۔

پی کر اگر اٹھو گے تو اتنا رہے خیال
بدنام ہو گے تم جو قدم لڑکھڑا گئے

س ج: کیا آپ کو کوئی ادبی اعزاز سے بھی نوازا گیا؟

م ح د: ہاں اتر پردیش اردو اکیڈمی، حیدرآباد اور دیگر مقامات سے اعزاز ملے۔ مگر میری نگاہ میں ایوارڈ کی قیمت نہیں تھی۔ لوگوں کی بے انتہا محبت کی قیمت تھی چنانچہ میں حیدرآباد میں تین، چار سال تک دونوں وقت کا کھانا گھر پر نہیں کھا سکا ایک وقت گھر پر تو دوسرا کہیں دعوت پر۔ اہل حیدرآباد نے جو محبتیں دیں وہ نقش کالحجر ہیں۔ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

س ج: کیا ادب کے حوالے سے بیرون ممالک کا سفر بھی کیا؟

م ح د: میں نہج البلاغہ سیمینار میں مقالہ پڑھنے کی غرض سے ایران گیا۔ اس کے علاوہ سفر زیارات کے سلسلے میں کل ملا کر تین بار ایران گیا۔ اعزا واقارب سے ملنے پاکستان بھی گیا لیکن میں اس کو ادبی سفر شمار نہیں کرتا۔

س ج: کیا جلالپور میں کبھی آپ کی آمد ہوئی؟ یا یہاں سے کوئی ادبی وابستگی؟

م ح د: میری سسرال بڑا گاؤں شاہ گنج جونپور ہے۔ شاہ گنج سے ہی تھوڑے فاصلے پر مالی پور اسٹیشن ہے اور وہاں سے جلالپور قریب ہے۔ جلالپور کے ڈاکٹر عباس رضا نیر صاحب کو میں 29-28 سال کے عرصے سے جب وہ ممبئی آئے تھے تب سے جانتا ہوں۔ دوسرے ممبئی کے خطیب مولانا عباس رضوی صاحب تقریباً پچاس برس قبل جلال پور مجلس پڑھنے آئے تو مجھے لے گئے تھے۔ مرتضیٰ حسین جھومر والے کے یہاں قیام وطعام تھا۔ اور جلال پور کی انجمن بھی مچھلی شہر نوحہ خوانی کے لیے آتی تھی بہت عمدہ نوحہ خوانی ہوتی تھی۔

س ج: اردو دنیا رسالے کے حوالے سے کچھ ارشاد فرمائیں؟

م ح د: اردو دنیا بہت اچھا نکل رہا ہے۔ ماشاء اللہ بہت مقبول ہے اللہ اور ترقی دے جو کام اردو کا ہو رہا ہے بہت اچھا ہو رہا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔

س ج: اپنے قارئین کے نام کوئی پیغام یا نصیحت؟

م ح د: پیغام اور نصیحت ان لوگوں کا کام ہے جو بہت معتبر اور اہم شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں ہم اپنے کو ان میں شمار نہیں کرتے۔ ہاں کسی کو کیا پیغام دیا جاسکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اگر آپ اس معاشرے کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جو مشترکہ تہذیبی معاشرہ ہے تو سرتیج بہادر سپرو کی زبان میں "اس مشترکہ تہذیبی وراثت کو نہ چھوڑیے۔"

■

Azadar Husain (Sajid Jalalpuri)
Mohalla Jafara Bad
Post: Jalalpur
Distt.: Ambedkar Nagar- 224149
Mob.:7571867186

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا

رفیع الدین ناصر

قومی اردو کونسل اردو اصناف کے تمام شعبوں میں معیاری کتب اردو قاری تک کم داموں میں فراہم کر کے اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے اور یہاں سے چھپی کئی کتابوں نے ہمیں متاثر کیا ہے۔ عام طور سے اردو ادب صرف غزل، نظم، افسانہ، ناول، تنقید وغیرہ کو سمجھا جاتا ہے جبکہ دیگر زبانوں میں اس کے علاوہ بھی وہ تمام اصناف شامل ہوتی ہیں جو لکھی جاتی ہیں جس میں بطور خاص سائنس کا شمار ہوتا ہے۔ سائنس کی ادب میں شمولیت کی وجہ سے زبان کا قاری ادب کے ساتھ ساتھ دیگر علوم سے بھی واقفیت حاصل کرتا ہے جو اس کو بہتر زندگی گذارنے کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے سائنس ہی وہ علم ہے جو انسان کو بہتر زندگی گذارنے کے گر بتلاتا ہے۔ اس لیے قاری کو سائنسی علوم سے واقف ہونا ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل اسی نظریے کو مدنظر رکھ کر معیاری کتابیں شائع کر رہی ہے۔ یہ بہت خوش آئند بات ہے کہ حالیہ برسوں میں قومی اردو کونسل نے سائنسی کتابوں کی اشاعت میں کافی اضافہ کیا ہے۔ قومی کونسل سے ملک کے نامور قلمکاروں کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں، جنھوں نے بہت متاثر کیا۔ ان تمام کا احاطہ اس ایک مضمون میں کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے اس وقت ہم ملک کے اُن تین چوٹی کے قلمکار جنھوں نے ہمیں متاثر کیا اُن کی کچھ کتابوں کے تعلق سے خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے سائنسی قلمکار میں کولکاتا کے جناب عبدالودود انصاری ہیں۔ ان کی تحریروں سے ہر ایک اردو قاری متاثر ہوتا ہے۔ ملک و بیرون ملک ان کے سائنسی مضامین بڑے اہتمام سے شائع کیے جاتے ہیں۔ چونکہ وہ ایک بہترین افسانہ نگار، خاکہ نگار، تبصرہ نگار کے ساتھ ساتھ سائنسی قلمکار و مکتوب نگار ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں وہ کشش ہوتی ہے کہ اردو قاری اُسے پڑھے بغیر نہیں رہتا اور پھر بہت متاثر ہوتا ہے۔ ان کی شائع 35 کتابوں میں سے قومی کونسل نے چار کتابیں شائع کیں۔ کتاب 'اوراق سائنس' (2008) یہ سائنسی مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب 'باتوں باتوں میں سائنس' (2017) یہ مکالمہ نگاری پر مشتمل ہے جبکہ 'آؤ سائنسی خط لکھیں' (2017) اور 'آؤ سائنسی خط پڑھیں' (2020) سائنسی مکتوبات پر مشتمل ہے۔

کتاب 'باتوں باتوں میں سائنس' اس لیے متاثر کن کتاب ہے کہ اس میں 13 سائنسی عنوانات کو آپسی گفتگو میں پرو کر 80 صفحات پر بکھیر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی متاثر کن بات یہ ہے کہ اس میں تمام جدید سائنسی مضامین کو مکالموں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ فاضل مصنف نے سائنس کی مشکل کو آسان بنانے کے لیے مکالمہ نگاری کا انتخاب کیا ہے تاکہ اردو قاری چاہے وہ بچہ ہو یا باشعور، باتوں باتوں میں سائنسی معلومات حاصل کر سکیں۔ کتاب میں موجود عناوین جیسے چندا ماما، سورج بادشاہ، شبنم آنٹی، تتلی رانی، سونا راجا، چاندنی بیگم، ریڈیم بابو، چمبک راجا، پارا بابا، کوہِ نور، قوس قزح وغیرہ میں انتہائی معیاری سائنسی معلومات کو آپسی گفت و شنید کے انداز میں پیش کیا۔ یہ ایک موضوع اپنے آپ میں مکالموں کے توسط سے تمام معلومات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لیے اردو کا قاری اس کو پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عبدالودود انصاری نے کتاب 'باتوں باتوں میں سائنس' کو پیش کر کے ادب و سائنس کو یکجا کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے جس اہتمام سے ان کی بقیہ دونوں کتابیں شائع کی وہ بہت قابل تعریف اقدام ہے۔ چونکہ دونوں کتابیں مکتوبات پر مشتمل ہیں اور سائنسی معلومات کا احاطہ کرتی ہیں اس لیے اچھوتی ہے۔ پہلی کتاب 'آؤ سائنسی خط لکھیں' کا جس نے بھی مطالعہ کیا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

اردو قاری جب اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ خط کے ذریعے اس طرح کی بیش قیمتی معلومات بھی فراہم کی جا سکتی ہیں۔ ہر ایک خط ایک انوکھے عنوان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں جیسے قرآن اور سائنس، مردہ سمندر، برف، زلزلہ، ابرق، سانپ، تربوز وغیرہ کل 27 مکتوبات جملہ 106 صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس سے اردو قاری میں سائنسی شعور بیدار ہونے میں کافی مدد ملے گی۔ اس انداز کی ان کی اگلی کتاب 'آؤ سائنسی خط پڑھیں' حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں عبدالودود انصاری نے مکتوب میں نثر کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی شامل کیا اور بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر سائنسی پیچیدگیوں کو آسان نظم میں سمجھایا۔ جیسے نوری ترکیب کے تعلق سے وہ ایک مکتوب میں کہتے ہیں۔

یہ پودے جو سرسبز آتے نظر ہیں
بتاؤ بھلا کس کے زیرِاثر ہیں
کلوروفل اس سبزی کا بس سبب ہے
یہ پودوں میں رہتا نہیں بے سبب ہے

قومی کونسل نے اردو بچوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر سائنسی کتابیں شائع کر کے اردو قاری کو ایک انمول تحفہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں جناب انصار احمد معروفی کی 6 کتابیں منظر عام پر آئیں۔ یہ تمام کتابیں قاری کو بہت متاثر کرتی ہیں کیونکہ تمام کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ اُن کی پہلی کتاب بعنوان 'یہ بدن کے حصے' میں انصار احمد معروفی نے جسم کے تمام حصوں کو الگ الگ عنوان کے تحت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

تھاما ہے دوستی کے لیے ہم نے تیرا ہاتھ
ہم پر کبھی اٹھانا نہ ہرگز تم اپنا ہاتھ
الٹے ہی ہاتھ سے تمھیں ماروں گا اس طرح
حاجت کبھی نہ ہوگی اٹھاوں میں سیدھا ہاتھ

شاعر نے اس طرح جسم کے دیگر اعضا مثلاً پیر، سر، چہرہ، منہ، آنکھ، کان، دل، ناک، گردن، گلا، ناخن، ناف کل 31 عناوین کو پیش کر کے بچوں تک بنیادی سائنسی معلومات فراہم کیں جس کو پڑھنے کے بعد بچے اور بڑے سب متاثر ہوتے ہیں۔

انصار احمد معروفی کی اگلی کتاب 'یہ پیڑ پودے' میں انھوں نے بچوں کی دلچسپیوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ ایک ماہر سائنسداں کی طرح باریک بینی سے شاعر نے پودوں کی تعریف، پودوں کی غذا، پودوں کی نسل، ان کے افعال، پودوں کی اہمیت اور ان کے مختلف اقسام کے بارے میں مفصل منظومہ معلومات اپنے قاری کو پہنچائی۔ جس سے شاعر کی سائنس میں دلچسپی، گہرا مشاہدہ، خدا کی صناعی کا علم وغیرہ کا پتہ چلتا ہے اور شاعر نے ان سب کو یکجا کر کے اس کتاب کو نہایت عرق ریزی سے تیار کیا ہے جس کو پڑھ کر قاری بہت متاثر ہوتا ہے۔ کتاب 'یہ زمین' میں شاعر انصار احمد معروفی نے مختلف عناوین کے تحت زمین کا گہرائی سے مطالعہ پیش کیا ہے۔ زمین کی اہمیت، سطح زمین، چٹانیں، سنگ مرمر وغیرہ پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

یہ زمین چلتے ہیں ہم جس پر چٹانوں سے بنی
یہ چٹانیں مختلف اجزا سے مل کر ڈھلی
سخت پتھر کو کہا جاتا ہے کہ چٹان ہے
ٹھوس اور مضبوط ہونا اس کی اونچی شان ہے

غرض انصار احمد معروفی کی یہ تخلیق قابل ستائش اور باعث افتخار ہے۔ وہ پڑھنے والے پر گہرا اثر چھوڑ دیتی ہے۔

قومی کونسل نے اپنے اردو قاری کو صرف صحت اور زمینی معلومات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اردو زبان میں خلا کا مواد فراہم کر کے اردو دنیا پر احسانِ عظیم کیا۔ چنانچہ اس سلسلے کے تحت جناب انیس الحسن صدیقی کی خلا سے متعلق کتابیں شائع کر کے اردو قاری تک بہت معیاری معلومات پیش کیں۔ انیس الحسن صدیقی کی کتاب 'فلکیاتی نظارے' (2008) کل دس فلکیاتی مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو قاری کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ تمام کتاب رنگین تصاویر پر مشتمل ہے جس کو شائع کرنے کے لیے اردو کونسل نے بہت اہتمام کیا ہے۔ اس اشاعت سے کونسل کی سائنس کے تئیں دلچسپی کا احساس ہوتا ہے اور جب اردو قاری اس کی ورق گردانی کرتا جاتا ہے تو وہ بہت متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اس کتاب میں انیس الحسن صدیقی نے بادل کے بارے میں چاند پر پیش قدمی کے تعلق سے سیارے کے متعلق کئی اہم معلومات رنگین تصاویر کے ذریعے اردو قارئین تک پہنچائی اور کونسل نے میگزین سائز کی اس 75 صفحات پر مشتمل کتاب کو صرف 60 روپے میں اردو قاری تک پہنچایا جو بہت متاثر کن بات ہے۔ اس کے بعد قومی اردو کونسل نے ان کی دوسری اہم کتاب 'خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں' کو اردو قاری کی خدمت میں پیش کیا۔ اس میں فاضل مصنف نے انتہائی عرق ریزی سے ہندوستان کے خلائی پروگرام کی تفصیلات کو یکجا کر کے بتلایا کہ موجودہ ٹی وی، موبائل، ریڈیو وغیرہ کی نشریات کس طرح ہم تک پہنچتی ہے۔ یہ کتاب بھی مکمل طور پر رنگین تصاویر پر مبنی ہے۔ آخر میں فاضل مصنف نے تمام معلومات کا اعادہ بھی کرایا، جس کو پڑھ کر اردو قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مشہور سائنسداں گیلیلو کے بارے میں کتاب مرتب کر کے انیس الحسن صدیقی نے سائنسدانوں کے بارے میں معلومات کا نیا باب کھولا اور قومی کونسل نے اس کو بہت بہترین انداز میں بچوں کے لیے پیش کیا تا کہ طلبا سائنس دانوں کی اندازِ زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اُن جیسا بننے کی کوشش کریں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سائنس کو پاپولر کرنے کے لیے اپنے تئیں بھرپور کوششیں کرتی رہتی ہے اور سائنس کے موضوعات پر نہ صرف سائنسی کتابیں شائع کرتی ہے بلکہ سائنسی کتابوں کی اشاعت کے لیے بھرپور تعاون بھی کرتی رہتی ہے، اسی وجہ سے ملک کے مختلف سائنسی قلمکاروں کی کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں۔ اس میدان میں مہاراشٹر کے قلمکاروں نے اپنا بہت زیادہ تعاون پیش کیا ہے، چناچہ اس سلسلے میں ایک بہت معتبر نام ہے ڈاکٹر محمد رفیق اے ایس کا، جن کا تعلق ناگپور سے ہے، جو سائنس و ادب کے توسط سے اردو کے گیسو سنوارنے میں سرگرداں ہیں۔ تعلیم اور سائنس پر ان کی اب تک 20 سے زائد کتابیں منصۂ شہود پر آ کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں جن میں سے بیشتر کی اشاعت قومی کونسل کے تعاون سے ہوئی ہے۔ ڈاکٹر رفیق کو ماحولیات پر بہت دسترس ہے اس موضوع پر تحریر کردہ ان کی کتاب، ماحولیات ایک مطالعہ 'ہمارے ماحول کے تعلق سے تمام بنیادی معلومات فراہم کرتی ہے اس لیے ہر ایک اردو قاری کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے کیونکہ ماہر مصنف نے اس کتاب میں ماحولیات کا احاطہ کرنے والے مختلف پہلوؤں کو سلجھے ہوئے انداز میں بے حد آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات ماحول کے تعارف پر مشتمل ہیں جس میں ماحول میں موجود ہوا، پانی، مٹی، نباتات، حیوانات وخورد بینی ذی حیات کے وجود اور اہمیت کی وضاحت ہے۔ ماحول سے ہمیں قدرتی طور سے توانائی حاصل ہوتی ہے اگر اس توانائی کا استحصال ہو رہا ہے تو انسانی زندگی خطرے سے دوچار ہو سکتی ہے، ڈاکٹر رفیق نے اس کتاب میں بتلایا کہ ہم آلودگی پر قابو پا کر قدرتی توانائی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ کتاب کی ورق گردانی سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہوا، پانی، مٹی، نباتات، حیوانات وخورد بینی ذی حیات ہمارے لیے بہت ضروری ہیں ان کے تحفظ کے لیے آلودگی پر قابو پانا بہت ضروری ہے۔ جدید ٹکنالوجی دورِ حاضر کا لازمی جز ہے اس کا استعمال اس طرح ہونا چاہیے کہ ماحول کو کوئی نقصان نہ پہنچائے اس سے جو ترقی ہوگی وہ قابل بقا ترقی کہلائے گی۔ کتاب کے آخری ابواب میں فاضل مصنف نے عورتوں اور بچوں کے تعلق سے مفید معلومات پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر محمد رفیق کی کتابوں میں سے ایک اور اہم کتاب 'ہمارا ماحول' ہے۔ یہ کتاب کل نو ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کے توسط سے ڈاکٹر رفیق نے ماحولی نظام کی تنزلی کی وجوہات بتلا کر اس پر قابو پانے کے طریقے بتلائے جو ہر اردو داں کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد کتاب میں قدرتی وسائل کی تنظیم اور اس کے استحصال سے متعلق معلومات ہیں۔ قدرتی وسائل کے خاتمے کی روک تھام کی رہنمائی کر کے فاضل مصنف نے سماج کے تئیں جوابدہی کا احساس دلایا۔ ہمارے گھروں سے بیشمار فاسد اشیا نکلتی ہیں اگر انھیں یوں ہی پھینک دیا جائے تو وہ ماحول کے لیے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ ان فاسد اشیا کو کارآمد بنانے کے طریقے ڈاکٹر رفیق نے بہترین انداز میں سمجھائے۔ کتاب کے آخری حصے میں ماحول کے تعلق سے ہندوستانی قوانین کا احاطہ کرتے ہیں۔ ماحولیاتی تحفظ ایکٹ سے بہت کم لوگ واقف ہیں اس کے بارے میں جاننا ہر ایک کو ضروری ہے، اسی بات کو مدنظر رکھ کر مصنف نے ماحولیاتی قوانین کی معلومات بہت عمدہ انداز میں فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر محمد رفیق اے ایس نے اپنی پی ایچ ڈی اردو میں کی ہے اس لیے انھیں اردو پر بہترین دسترس حاصل ہے اس لیے ان کی سائنسی تحریریں بہت شستہ دلچسپ اور تجسس سے پر ہوتی ہیں۔ سائنسی اصطلاحات آسان اور سادہ ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی کتابیں قاری کو متاثر کرتی ہیں، سائنسی کتابیں زندگی کو بہتر طریقے سے جینے کی راہیں فراہم کرتی ہیں اس لیے ان کتابوں کا مطالعہ ہر کسی کو کرنا چاہیے۔

■

Dr. Rafiuddin Naser
(National Awardee Teacher)Head Dept at Botany, Maulana Azad College of Arts, Science and Commerce,
Dr. Rafiq Zakaria Campus,Rauza Bagh,
Aurangabad-431001 (MS)
Emial : rafiuddinnaser@rediffmail.com
Mob.:9422211634

پروسیس اپروچ اردو زبان میں لکھنے کی صلاحیت میں اضافے کا باعث

جرار احمد

روایتی طرح سے بولنے یا تحریری علامتیں جس کے ذریعے انسان منظم طرح سے ترتیب وار اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اس نظام کو ہم زبان کے نام سے جانتے ہیں۔ تبادلۂ خیال، شخصیت کا اظہار، کھیل کود، فکر وخیال اور تصورات کا اظہار، جذبات کی ترجمانی وغیرہ سب کے سب زبان کے عمل میں شامل ہیں۔ گرچہ بہت سارے حیوانات اپنے اپنے طریقے سے ایک دوسرے سے رابطہ کرتے ہیں تاہم انسان ہی صرف ایسی مخلوق ہے جو زبان کا استعمال کرتی ہے۔ انسان اپنی زبان صرف ایسے ہی استعمال نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے کچھ قاعدے قانون ہوتے ہیں انھیں قواعد وضوابط کے تحت بہت سارے الفاظ کو جوڑ کر بیان (جملے) اور سوالات بنائے جاتے ہیں، کسی نئی چیز کی وضاحت کرنے کے لیے نئے الفاظ کو جوڑ کر زبان کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے جانور پکارنے کے ایک سیٹ کو Inherit کر سکتے ہیں، جو پری سیٹ عمل (Pre-set Process) رکھتے ہیں۔ گفتار یا تحریر یا نشان بنانے کے لیے ہاتھ ہلا کر زبان کو مکمل کیا جاسکتا ہے، اس طرح سے زبان ہی صرف ابلاغ اور تبادلۂ خیال کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔

انفارمیشن کمیونیکیشن ٹکنالوجی (آئی سی ٹی) کی اس صدی میں قلم کی جگہ بچوں کو موبائل فون یا اس طرح کے جدید آلات پکڑا دیے جاتے ہیں جس سے تمام طرح کی لرننگ ہوتی رہتی ہے اور جب کلاس کے قابل ہوتے ہیں تو کلاس روم میں بھی Computer Mediated Communication (CMC) کے ذریعے اکتساب کرتے ہیں اور پھر انٹرنیٹ کے تعامل سے Synchronous & Asynchronous لرننگ کے ذریعے طلبا بذات خود اکتساب کرتے ہیں، یہ اکتساب کا دوسرا اور جدید طریقہ ہے، مگر ان سب جدید آلات کی موجودگی کے باوجود اگر طلبا کے اندر تحریری صلاحیت موجود نہیں ہے تو وہ مکمل طور سے کسی بھی موضوع پر لکھنے سے عاجز رہے گا اور اپنے خیالات کو تحریری شکل دینے سے قاصر رہے گا۔

آج بھی بہت سارے لرنرس ایسے ہیں جن کے اندر بہت ساری صلاحیتیں موجود ہیں مگر تحریری کی صلاحیت سے عاری ہونے کی وجہ سے وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنے خیالات کو قلمبند کرنے سے قاصر رہتے ہیں، کیوں کہ ان کے سامنے زبان کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس کا بین ثبوت سرگیر اور ہندیانی کی تحقیق سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے اپنی تحقیق کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''گریجویٹ کے بعد طلبا کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ گلوبل حالات کا ہوتا ہے جس میں انگریزی کو پہلی زبان کے طور پر منتخب کرنا بھی بڑا مسئلہ ہوتا ہے'' (Siregar, 2013 Handayani &)۔

جب ہم کسی ایسے ادارے، جس کا ذریعۂ تعلیم کوئی ایک خاص زبان ہو، جیسے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) میں اردو ذریعۂ تعلیم ہے اور مہاتما گاندھی انتر راشٹریہ ہندی وشو ودیالیہ، وردھا میں ہندی، تو ایسے اداروں میں بھی طلبا کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس کی زبان کو لے کر ہوگا، جیسا کہ مانو کے اکثر طلبا کے لیے بڑا مسئلہ اردو زبان صرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ یا تو ہندی یا پھر انگریزی ذریعۂ تعلیم سے پڑھ کر آئے ہوتے ہیں۔ کلاس روم اور نوٹس وغیرہ کی حد تک طلبا کو دقت نہیں ہوتی ہے کیوں کہ وہ اسے اپنی معلوم زبان میں تحریر کرتے ہیں۔ اصل مسئلہ ان کو ٹیسٹ اور امتحان گاہ میں شروع ہوتا ہے جہاں ان کو اردو میں ہی اپنے جوابات تحریر کرنے ہوتے ہیں۔ مانو میں سائنس، انجینئرنگ، ایجوکیشن تمام تر تعلیمات کا ذریعۂ تعلیم اردو ہی ہے اور یہاں کے طلبا ICT اور ٹکنالوجی کے استعمال سے بھی بخوبی واقف ہیں، یہاں تک کہ زبان و ادب کے طالب علم بھی ICT کا استعمال کر کے اپنا پریزینٹیشن وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ ان کی ICT سے واقفیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے کورس میں Fundamental Information Technology (FIT) شامل ہے جس کی وجہ سے زبان وادب کے طلبا بھی ان جدید آلات کے استعمال سے واقف ہوجاتے ہیں اور اپنے مافی الضمیر کا اظہار اپنی تحریری صلاحیت کے حساب سے آئی سی ٹی کی مدد سے اردو زبان میں کرتے ہیں، FIT کی طرز پر اگر زبان و ادب کے ساتھ (یہ ضروری نہیں کہ زبان و ادب کا ہر طالب علم تحریری کی صلاحیت {writing competency} سے واقف ہو) تمام لرنرس کے لیے Urdu Language Learning Course کا ایک پرچہ متعارف کرادیا جائے تو وہ بھی اپنے مافی الضمیر کا اظہار بہ آسانی کرسکیں گے اور اس طرح اردو زبان میں لکھنے کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہوجائے گا۔

تحریر اور تحریر کی صلاحیت کے فرق کو مندرجہ ذیل سے سمجھا جاسکتا ہے۔

تحریر/لکھنا

انسان ابتدا کسی نہ کسی طریقے سے اپنے خیالات، کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ اپناتا رہا ہے، مگر ان سب طریقوں میں کوئی ایسی قوت یا ایسا مضبوط طریق نہیں تھا جس سے وہ اپنے تمام خیالات کو محفوظ کرسکے لیکن دھیرے دھیرے انسان ترقی کرتا گیا اور آگے چل کر اس نے تحریر کو پالیا اور پھر اس میں اس قدر ترقی ہوئی کہ جس کی جدید تر شکل آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

تحریر ایک فن ہے جس کے ذریعے انسان اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کرتا ہے لیکن آج کے اس دور میں اس فن کی تکنیک نے اتنی ترقی کرلی کہ آج کے انسان کو قلم کی ضرورت ہی نہیں بلکہ قلم کی بات تو دور کچھ لکھنے کے لیے ہاتھ کو کسی دوسری تکنیک کے ساتھ تعامل

کرنے کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ قلم کے بعد Keyboard اور اب Voice Typing کا تصور عام ہوگیا ہے، وائس ٹائپنگ سے انسانی ذہن ڈکٹیشن کی طرف جاتا ہے کیوں کہ پہلے ڈکٹیشن کا تصور تھا مگر اس میں ایک فرد کے ہاتھ میں قلم یا مشین ہوا کرتی تھی، لیکن آج کا انسان ان تمام لوازمات سے بالاتر ہوکر کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت، کہیں بھی اپنے خیالات کو ایک چھوٹے سے موبائل یا لیپ ٹاپ وغیرہ میں وائس ٹائپنگ کے ذریعہ محفوظ کرسکتا ہے اور وہ دن دور نہیں جب کوئی ایسا آلہ معرض وجود میں آجائے کہ صرف انسان سوچ لے اور اس کے خیالات اسی جیسی کسی جدید تکنیک میں محفوظ ہوجائیں۔

تحریر ی صلاحیت

آج بھی اس جدید دور میں ہم تحریری صلاحیت کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے کیوں کہ تحریری صلاحیت صرف خوش خط لکھ دینے کا یا پھر کسی اور ذریعے سے الفاظ محفوظ کرلینے کا نام نہیں ہے بلکہ جب ہم تحریری صلاحیت کی بات کرتے ہیں تو اس کے ضمن میں یہ بھی آتا ہے کہ ہم کس طرح سے اپنے خیالات کو منظم طریقے سے پیش کرتے ہیں اور ہم کتنے منطقی انداز میں اپنی بات کو قاری کے سامنے رکھتے ہیں، تحریری تکنیک چاہے جتنی بھی ترقی کرلے ہمیں اپنے خیالات کو قلمبند یا محفوظ کرنے کے لیے، اس کی ترتیب کے لیے اپنے ذہن کو ہی بروئے کار لانا ہوگا کیوں کہ جب بھی کوئی خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے تو اس کا ایک خاکہ ہم اپنے ذہن میں بنالیتے ہیں، پھر اسے ڈرافٹ کی شکل میں قلمبند کرتے ہیں اور غور وفکر کے بعد ہم اس کی شین قاف درست کرتے ہیں اور سلیقے سے منظم انداز میں اس کی ترتیب کرتے ہیں کہ کون سی بات پہلے کرنی ہے اور کون سی بات اہم ہے، اس طرح ان تمام چیزوں کے لیے تحریری صلاحیت کا ہونا لازمی ہے، تحریری صلاحیت کے بغیر انسان تحریری طور پر اپنے مافی الضمیر کا کما حقہ اظہار کرنے سے قاصر ہوگا۔

تحریر ی رسائیاں

جب تحریری مہارتوں کی بات کی جاتی ہے اور لکھنا پڑھانے کا ذکر کرتے ہیں تو اس ذیل میں دو(2) اہم رسائیوں کو پاتے ہیں نمبر 1 پیداوار مرکوز نمبر2۔ عمل مرکوز۔ لکھنا پڑھانے (تحریری تدریس) میں پروڈکٹ مرکوز رسائی لکھنے کے میکانیکی رخ پر زیادہ زور دیتی ہے جیسے صرفی، نحوی بناوٹ اور نقل وتقلید کے Models پر زیادہ فوکس کرتی ہے اس کا تعلق بنیادی طور سے درستگی اور پروڈکٹ کی آخری شکل سے ہے علاوہ ازیں یہ رسائی اس بات کی پہچان سے قاصر ہے کہ لوگ ایک مخصوص گروہ کے قاری کے لیے ایک خاص مقصد کے تحت لکھتے ہیں اور وہ زریں خیالات لکھنے کے عمل کے دوران وجود میں آتے ہیں جب کہ پروسیس مرکوز رسائی اس بات پر زور دیتی ہے کہ لکھنا اپنے آپ میں خود ایک ڈیولپمنٹل عمل ہے جو خود کھوج (سیلف ڈسکوری) اور مفہوم کو پیدا کرتا ہے۔ لکھنے کا میکانیکی پہلو جہاں اہم ہے وہیں ان کو کمپوزنگ پروسیز کے ساتھ دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے، کمپوزنگ کے عمل میں سب سے زیادہ ضرورت نظر ثانی اور اسے دوبارہ تحریر کرنے کی ہوتی ہے۔ کمپوزنگ کے عمل کے دوران استاد بیچ بیچ میں مداخلت کے ذریعے طلبا کی رہنمائی کرتا رہتا ہے مگر جان بوجھ کر وہ درستگی اور فائنل پروڈکٹ پر توجہ نہیں دیتا ہے، بناوٹ کے بارے میں فکر مند ہونے کے بجائے طلبا تحریری پیغام کی ترسیل کی جانب اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

جس طرح سے دوسرے لوگوں جیسے کامیاب گریجویٹ وغیرہ کے لیے تحریر بہت اہم ہے، اسی طرح سے ایک کامیاب اور اچھا طالب علم بننے کے لیے تحریر بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے کیوں کہ طالب علم کو اپنے امتحانات کے پرچے، تفویض، ٹیسٹ وغیرہ میں بھی کسی ایک خاص زبان کی ضرورت پڑتی ہے جس میں کامیابی کے لیے ان کے اندر مہارت کے ساتھ ساتھ صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے جس سے وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار واضح اور مؤثر ومطلوب انداز میں کرسکیں۔

اردو زبان میں عمل رسائی کا استعمال

چونکہ تحریر میں پروسیس اپروچ ایک وسیع عمل ہے جس میں ماقبل تحریر، تحریر، نظر ثانی اور ایڈیٹنگ شامل ہے۔ یہ تمام عمل ایک ریکرسیو عمل کے تحت انجام پاتے ہیں، جیسا کہ رائٹرس رائٹنگ پروسیس سے گزرتے ہوئے ریکرسیو مراحل کے ذریعے آگے بڑھتے ہیں، جو سب سے پہلے سامعین کا تعین اور خیالات پیدا کرنے پر زور دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد خاکہ یعنی خیالات کی تنظیم اور نظر ثانی کے لیے تحریری لائحہ عمل پر، پھر درستگی یعنی موزوں قواعد، املا، طرز تحریر کے لیے ایڈیٹنگ۔ پروسیس کا آخری مرحلہ اشاعت اور کسی مکمل مسودہ کا اشتراک ہے، جس کے بعد پروسیس کے کچھ مراحل ایک بار پھر نظر ثانی کیے جاسکتے ہیں۔

اس طرح اردو زبان میں عمل رسائی پر غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر اردو زبان میں بھی عمل رسائی کا استعمال کیا جائے تو ہم طلبا کی اردو زبان کی تحریری صلاحیت میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ اپنا سکتے ہیں، جیسے کسی شاعر کے بارے میں طلبا کو پڑھایا جائے یا پھر ان کو کوئی فلم دکھائی جائے اور طلبا سے کہا جائے کہ آپ اس شاعر یا فلم کے بارے میں لکھیں۔ لکھنے کے دوران استاد یا سہولت کار طلبا کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ لکھنے کے بعد ان سے کہا جائے کہ اب وہ ایک دوسرے کی تحریر کو باریکی سے دیکھیں اور اس میں کچھ ترمیم واضافہ کریں اس کے بعد اخیر میں استاد سب کی تحریر کو چیک کر کے اصلاح کرے اور طلبا سے ایک بار پھر اسی موضوع پر لکھنے کو کہا جائے تو ایسی صورت میں وہ زیادہ بہتر کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ آئی سی ٹی وغیرہ کا استعمال اس طرح سے کرسکتے ہیں کہ کاغذ پنسل کے بجائے طلبا کو کمپیوٹر کے ذریعہ کچھ لکھنے کو کہا جائے۔ یہ کمپیوٹر انٹر نیٹ سے جڑا ہوا بھی ہوسکتا ہے اور بغیر انٹرنیٹ کے بھی، اگر انٹرنیٹ سے جڑا ہوا ہے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کوئی بھی شخص، کہیں بھی، کسی بھی وقت لرننگ کرسکتا ہے۔

اردو زبان میں خاص کر اس اپروچ کے استعمال کا مقصد یہ بھی ہے کہ پہلے کی طرح اب بڑے تخلیق کار وغیرہ کم پیدا ہورہے ہیں، شاید اب زیادہ تر لوگ کٹ، کاپی، پیسٹ سے کام چلالیتے ہیں، اس لیے اس اپروچ کے ذریعے ICT کے استعمال کے ساتھ ہم لرنرس کی خود کی سوچ، خود کا نظریہ پیدا کرنے کی حوصلہ افزائی کے ساتھ تخلیقیت کو فروغ دینے میں ایک اہم کردار ادا کرنے کی کامیاب کوشش کریں گے۔ آج کے اس جدید دور میں جہاں آئی سی ٹی یا دیگر جدید وسائل کا استعمال ناگزیر ہے، وہیں طلبا کو لکھنے کی ذہنی صلاحیت کا مالک ہونا بھی لازمی امر ہے کیونکہ تحریری مہارت میں سب سے زیادہ کام ذہن کو بروئے کار لاکر ہی کیا جاتا ہے اور لکھنے کے لیے غور وفکر ضروری ہے۔ درس وتدریس میں آئی سی ٹی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے بوساری کا درج ذیل قول ملاحظہ ہو:

"یونیورسٹی کا ایک متوسط طالب علم جس کی کمپیوٹر تک رسائی بہت ہی محدود ہو، یقیناً اس کے سیکھنے کی رفتار، وسعت اور تخلیقیت بھی محدود ہوگی۔ تعلیمی ٹکنالوجی کے مراکز کو اپنے کردار کے بارے میں بیداری پیدا کرنا چاہیے اور طلبا کو مواقع فراہم کرنا چاہیے۔ یونیورسٹی کی موجودہ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قدیم اور متروک چیزیں، اور سلائڈ کو طلبا کی تخلیقیت میں اضافہ کرنے کے لیے جدید یانے کی ضرورت ہے۔"

انگریزی گرچہ آج پوری دنیا پر حاوی ہے مگر ماہرین نے سہ لسانی فارمولے کی اہمیت پر زور دیا ہے اور قومی تعلیمی پالیسی 2020 بھی اسی کی وکالت کرتی ہے، مگر زیادہ تر لوگ بنیادی طور سے زبان کی ترسیلی مہارت پر زور دیتے ہیں اور تحریر کو ایک لرننگ طریقہ کار کے طور پر لینے سے نظر انداز کردیتے ہیں۔ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ لکھ کر یاد کرنے سے یا ایک بات کئی بار لکھنے سے خود بخود ذہن نشین ہوجاتی ہے۔ انگریزی میں بات کرنا قابل

فخر سمجھتے ہیں نیز انگریزی بہت سے اداروں کی دفتری زبان بھی ہے اس وجہ سے لوگ اس زبان میں لکھنے کی صلاحیت پر بھی توجہ مرکوز کرتے ہیں اور عبور حاصل کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں جبکہ اردو زبان کچھ علاقوں کو چھوڑ کر کہیں کی دفتری زبان نہیں ہے اسی وجہ سے اس میں لکھنے کی صلاحیت پر لوگ زیادہ توجہ نہیں دیتے حتی کہ جن اسکولوں میں اردو زبان پڑھائی جاتی ہے وہاں پر بھی صرف سالانہ امتحانات وغیرہ ہوتے ہیں جہاں طلبا کی تحریری صلاحیت کا سرسری اندازہ کرلیا جاتا ہے اور اس ضمن میں اردو زبان کی تحریری صلاحیت میں اضافے کے لیے کسی بھی قسم کی کوئی مسلسل جانچ نہیں ہوتی ہے۔

بہت سارے زبان وسماج کے ماہرین نے ہندوستان کی تہذیب وثقافت میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کے کردار کو اجاگر کیا ہے اور بہت ساری کمیٹیوں نے زبانوں اور خاص کر اردو زبان کے تحفظ کی بات کی ہے، اس ضمن میں عملی قدم اس طرح سے اٹھانے کی ضرورت ہے کہ اردو پڑھانے کا اور لکھنا سکھانے کا طریقہ کار بدلنا چاہیے تاکہ ثانوی سطح تک طالب علم اردو پڑھنے کے بعد اس لائق ہوجائے کہ وہ روانی کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کا اظہار بغیر کسی رکاوٹ کے کرسکے۔ چونکہ انسانی کردار کے فروغ میں زبان بہت ہی اہم کردار ادا کرتی ہے اس لیے زبان کی صلاحیت کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

یہ بات سب پر عیاں ہے کہ تحریر ایک دشوار اور پیچیدہ عمل ہے، بالخصوص ہندوستان وغیرہ میں یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کیوں کہ یہاں تحریر کی طرف کم توجہ دی جاتی اور خاص کر اردو تحریر کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ تعلیمی ادارے جیسے اسکول، کالج، یونیورسٹیز وغیرہ اور ایسے ادارے جہاں پر میڈیم آف انسٹرکشن اردو یا پھر ہندی وغیرہ ہے تو وہاں کے ان طلبا کے لیے جو کسی اور ذریعہ تعلیم سے پڑھ کر آئے ہیں اور مشکل ہوتا ہے۔ مضمون سے زیادہ ان کو لکھنے میں محنت کرنی پڑتی ہے اور وہ لکھنے کو لے کر ہمہ وقت حیران وپریشان رہتے ہیں۔

دیگر زبانوں میں تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پروسیس اپروچ سے طلبا کی تحریر میں بہتری لائی جاسکتی ہے اور اس میں استاد کی حیثیت ایک سہولت کار جیسی ہوتی ہے نیز طلبا آسانی کے ساتھ آزادانہ طریقے سے ایک دوسرے سے موضوع سے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں اور پھر اسے ضبط تحریر میں لاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں بہتری ہوتی ہے۔

اس مطالعے میں درج بالا تمام پریشانیوں اور مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے محقق نے ایک تجربہ ڈی ایل ایڈ کے طلبا پر ان کی موجودہ صورت حال، صلاحیت، رویہ اور خدشگی کا اندازہ لگانے کے لیے کیا اور ساتھ ہی ڈی ایل ایڈ طلبا کی اردو زبان میں لکھنے کی صلاحیت کا اندازہ کرنے کے لے ایک ٹیسٹ کا انعقاد عمل میں لایا بعدہ اسی تناظر میں اس مطالعے میں 'اردو زبان میں لکھنے کی صلاحیت پر عملی رسائی کا اثر' کے اثر کا مطالعہ کیا گیا۔

مطالعہ کا طریقۂ کار

یہ ریسرچ ڈیزائن پری ٹیسٹ- پوسٹ ٹیسٹ کنٹرول گروپ کواسی ایکسپیریمنٹل ڈیزائن پر مبنی ہے۔ اس ڈیزائن کو اپنانے کے پیچھے منطق یہ ہے کہ کنٹرول اور ایکسپیریمنٹل گروپ کے شرکا Randomly نہیں چنے گئے۔ اسی تجرباتی خاکہ کے استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تجرباتی اور کنٹرول گروپ میں شامل امیدواروں کو Randomly منتخب کرنے میں دشواریاں تھیں۔ تجرباتی گروپ میں عملی طریقہ کار کا استعمال اکادمک تحریر کے طریقے (Academic Writing)_ کے تمام پہلوؤں پر کیا گیا۔ جب کہ روایتی طریقہ کار کا استعمال کنٹرول گروپ کے لیے کیا گیا۔ محقق نے اس مطالعے میں تمام تجربی طریقہ عمل کو شامل کیا۔

عمل رسائی پر مبنی تحریری پیکیج کی سرگرمیاں

اس مطالعے میں ٹریٹمینٹ کے لیے تحریری پیکیج تیار کیا گیا۔ عمل رسائی پر مبنی کل 13 تحریری پیکیج ماہرین کی مدد سے محقق کے ذریعے تیار کیے گئے۔ تحریری پیکیج کو نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ تیار کیا گیا۔ وقت کے زیاں اور طلبا کو اکتاہٹ سے بچانے کے لیے ہر ایک پیکیج کی ہر ایک سرگرمی کی شیٹ کے اوپر طالب علم کا نام، صنف، رول نمبر، اور اندراج نمبر کو کمپیوٹرائزڈ طریقے سے لکھ کر پرنٹ کردیا گیا اور سرگرمی کے وقت کلاس روم میں ہر ایک طالب علم کو اس کے نام والی تحریری پیکیج سرگرمی کی شیٹ دے دی جاتی جس سے طلبا اکتانے کے بجائے خوش اور متجسس بھی ہوتے تھے۔ اور انھیں شیٹ کو بطور ٹریٹمینٹ کلاس میں استعمال کیا گیا جن کے درج ذیل عناوین تھے۔

تحریری پیکیج درج ذیل عناوین پر مشتمل ہیں:

1 ایڈٹ کریں اور دوبارہ لکھیں (Paragraph Editing)
2 تصویر کی کہانی اپنی زبانی (Picture Composition)
3 شہر لکھنؤ سے متعلق دیے گئے پیراگراف کو پڑھ کر شہر حیدرآباد کے بارے میں لکھیں (Brochure on Hyderabad City A)
4 شہری اور دیہی زندگی(City and Village Life)
5 اللہ کے نام خط(Letter to Allah)
6 تصویر کا تجزیہ(Picture Analysis)
7 ریسائکلنگ(Recycling)
8 محرم(Moharram)
9 معادلت اور مساوات(Equity and Equality)
10 مثالی استاد(Ideal Teacher)
11 کہانی کا خاکہ(Story Map)
12 انسانی زندگی پر مضمون(Essay on Human Life)
13) میری زندگی کا سب سے یادگار لمحہ (The Most Memorable Moment in My Life)

اس طرح سے درج بالا 13 عناوین کے تحت تحریری پیکیج بنا کر ان کا استعمال دونوں گروپ کے طلبا پر ٹریٹمنٹ کے طور پر کیا گیا۔

کچھ سرگرمیوں کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

دوسری سرگرمی کا عنوان تھا 'تصویر کی کہانی اپنی زبانی' اس سرگرمی کے لیے طلبہ وطالبات کو پانچ پانچ اور چھ چھ کا گروپ بنا کر دائرے کی شکل میں بیٹھا دیا گیا اور پھر ان کو سرگرمی شیٹ دی گئی جس میں ایک لڑکی کی تصویر دکھائی گئی تھی۔ اس کے بعد ان کو ہدایت دی گئی کہ اس سرگرمی کے لیے کل ایک گھنٹہ خاص ہے جس میں سے 10 منٹ برین اسٹورمنگ کے لیے، 25 منٹ پہلے مسودہ کے لیے، 10 منٹ پیئر ایڈیٹنگ کے لیے اور 15 منٹ آخری مسودے کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے بعد ہر گروہ سے برین اسٹورمنگ کے لیے کہا گیا کہ وہ 10 منٹ تک اس لڑکی کے بارے میں آپس میں گفتگو اور اظہار خیال کریں اور جو نکات نکل کر سامنے آئیں ان کو لکھنے سے پہلے کے خیالات (پری رائٹنگ آئیڈیاز) والی خالی جگہ میں نوٹ کرتے جائیں۔ 10 منٹ کے بعد ہر گروہ کے طلبا سے کہا گیا کہ وہ ان پری رائٹنگ آئیڈیاز کی روشنی میں اپنا پہلا مسودہ تحریر کریں اور اس دوران کوئی کسی سے بات نہیں کرے گا ہر کوئی اپنا اپنا لکھے گا۔ جس جس کا پہلا مسودہ مکمل ہوتا جاتا وہ آپس میں اپنی شیٹ ایک دوسرے سے بدل کر ایڈیٹنگ کرنے لگتے۔ جب کہ پہلے مسودہ کے لیے 25 منٹ اور ایڈیٹنگ کے لیے 10 منٹ مختص تھے۔ ایڈیٹنگ کے بعد طلبا سے کہا گیا کہ اگر ان کو لگے کہ ان کے ساتھی نے جو ایڈیٹنگ کی ہے اور اچھا مشورہ دیا ہے تو اس کو ملحوظ خاطر رکھ کر اپنی تحریر کو آخری شکل دیں اور اگر لگے کہ وہ ایڈیٹنگ اور مشورہ درست نہیں ہے تو جو بہتر ہو اور جس طرح اپنی تحریر کو بہتر کرسکتے ہوں کرکے آخری مسودہ/حتمی مسودہ 15 منٹ میں تحریر کریں۔

'اللہ کے نام خط' پانچواں پیکیج تھا۔اس سرگرمی میں طلبا نے کافی زیادہ دلچسپی دکھائی اور محقق سے اس سے متعلق کافی سوالات کیے کہ کچھ بھی لکھ سکتے ہیں؟ شکایت لکھیں؟شکریہ ادا کریں؟اس طرح کے اور بھی کئی سوالات کیے۔اس سرگرمی میں شرکت کرنے والوں کو بتا دیا گیا کہ جو چاہیں لکھیں آپ کی رازداری کا خیال رکھتے ہوئے اس سرگرمی میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ایڈیٹنگ والے آپشن میں آپ جس کا نام لکھیں گے صرف وہی اسے ایڈٹ کرے گا ہر کوئی ایڈٹ نہیں کرسکتا ہے اس لیے آپ آزادانہ طور سے خط لکھنا شروع کریں ہاں البتہ خط کی سرگرمی کے تمام مراحل کے ساتھ ساتھ خط کے تمام مراحل کو بھی دھیان میں رکھیں۔اس طرح سے اس سرگرمی کے تمام شرکا نے غوروفکر کے بعد شکریہ اور شکوہ وغیرہ سے متعلق الگ الگ ایک لسٹ بنالی اور اس کو سامنے رکھ کر فرسٹ ڈراف مکمل کیا پھر اپنے قریبی دوست یا جس کو اس کی ایڈیٹنگ کے لیے بہتر سمجھا اس کا نام لکھ دیا اور ایڈیٹنگ کے بعد اپنے مسودے کو آخری شکل دی۔

اس پیکیج کی آخری سرگرمی کا عنوان تھا 'میری زندگی کا سب سے یادگار لمحہ'اس تحقیق میں حصہ لینے والے تمام لوگوں سے کہا گیا کہ اس عنوان کے تحت خوب غوروفکر کرکے اور بات کرکے اپنے ذہن میں تمام نکات محفوظ کرلیں اور پھر لکھنا شروع کریں کیونکہ اس میں ماقبل تحریر کے خیالات، فرسٹ ڈراف اور ایڈیٹنگ وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے جو کچھ لکھیں گے وہی آخری اور فائنل ہوگا اس طرح سے شریک تمام افراد نے غوروفکر کے بعد بحسن و خوبی اس سرگرمی کو بھی مکمل کیا اس طرح سے پروسیس اپروچ مرکوز سرگرمی اپنے اختتام کو پہنچی۔

تحریر ی صلاحیت پر مبنی تحریری سرگرمی کے پیکیج کی تیاری و تعمیر

تحریری پیکیج مرکوز سرگرمی ایک ایسی سرگرمی ہے جس میں افراد یا گروہ کی ایک خاص میدان سے معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔تحریری پیکیج پر مبنی سرگرمی کے استعمال کرنے کے پیچھے یہ خیال کارفرما تھا کہ اس کے ذریعے طلبا کے لکھنے کی صلاحیت میں بہتری کو یقینی بنایا جاسکے اور طلبا کو کلاس کے ماحول میں نئے طریقوں سے اردو میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار تحریری طور سے کرنے کے قابل بنایا جاسکے۔ نیز برسوں سے چل رہے لکھنے کے روایتی طریقے اور ایک ہی طرح سے ایک دوسرے کو پشت دکھا کر بیٹھنے کے طریقے میں تبدیلی لاکر طلبا کو متحرک اور سرگرم ہوکر دلچسپی کے ساتھ سیکھنے کی طرف راغب کرکے ان کی تحریری صلاحیت میں اضافہ کرنا۔ ان تمام نئے طریقوں کے اپنانے کے پیچھے یہ منطق ہے کہ طلبا ایک دوسرے سے تعامل کرکے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ ان کو صفحۂ قرطاس پر اپنی تحریری صلاحیت وقابلیت کی بنا پر رقم بھی کرسکیں۔اس طرح سے ان کو جہاں اپنی معلومات اور علم کا اندازہ ہوگا وہیں دوسری طرف اپنی تحریری صلاحیت سے بھی آگاہی حاصل ہوگی اور وہ اپنی تحریری صلاحیت کا اندازہ بھی کرسکیں گے۔

> **قدرت نے انسان کے اندر زبان کی جو چار مہارتیں ودیعت کی ہیں جیسے سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ان میں سب سے اہم لکھنا ہے۔ اس دور میں تحریر کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے ، کیونکہ کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں پر ہمیں لکھنے کی ضرورت نہ ہو چاہے وہ سوشل لائف ہو، ایجوکیشنل لائف ہو یاپھر پروفیشنل ہر جگہ کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتاہے۔**

اس تحریری پیکیج کی سرگرمی کے ذریعے طلبا کی تحریری صلاحیت کا مختلف معیار و جہات سے اندازۂ قدر کرکے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی کہ کون سا عوامل ان کی تحریری صلاحیت پر زیادہ کارفرما ہے اور شروع سے اخیر تک کس طرح سے ان کی تحریری صلاحیت میں اضافہ ہوا۔

قدرت نے انسان کے اندر زبان کی جو چار مہارتیں ودیعت کی ہیں جیسے سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ان میں سب سے اہم لکھنا ہے۔اس دور میں تحریر کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، کیونکہ کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں پر ہمیں لکھنے کی ضرورت نہ ہو چاہے وہ سوشل لائف ہو، ایجوکیشنل لائف ہو یا پھر پروفیشنل ہر جگہ کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے۔

روبرو ملاقات میں اگر کوئی شخص اپنے مافی الضمیر کا اظہار بخوبی نہیں کرسکتا ہے تو اپنے ہاؤ بھاؤ سے اشارے کنائے میں اپنی بات سامنے والے کو سمجھا کر مطمئن کر سکتا ہے مگر اگر یہی بات چیت تحریری شکل میں ہے تو اس کے لیے تحریری صلاحیت کا ہونا بے حد ضروری ہے کیوں کہ تحریر میں کون سی بات کب اور کس طرح سے کہنی ہے کہ قاری تک اس کی ترسیل کما حقہ ہوسکے اس لیے تحریری صلاحیت کا ہونا ازحد ضروری ہے۔

مطالعہ کے نتائج اور مباحثہ

1 روایتی طریقۂ تدریس سے اردو لکھنا پڑھانے سے طلبا کی لکھنے کی صلاحیت میں کوئی خاطر خواہ بہتری نہیں ہوتی ہے۔

2 اردو زبان میں تحریر کی صلاحیت پر عمل رسائی کے استعمال سے طلبا کے لکھنے کی صلاحیت میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔

3 کنٹرول اور تجرباتی گروپ کی سرگرمیوں کا واوسط فیصد کے موازنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کنٹرول گروپ کے مقابلے میں تجرباتی گروپ کے طلبا کی اردو زبان میں تحریر کی صلاحیت کے اوسط فیصد میں بہت زیادہ بہتری آئی ہے جس کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عمل رسائی کے استعمال سے اردو لکھنے کی صلاحیت میں بہتری ہوتی ہے۔

4 ایکسپریمنٹل گروپ کے پری ٹیسٹ اور پوسٹ ٹیسٹ کے مابین اردو زبان میں لکھنے کی صلاحیت میں معنی خیز فرق سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انٹروینشن یعنی پروسیس اپروچ کے ذریعے کرائی گئی تحریری سرگرمیوں سے طلبا کے لکھنے کی صلاحیت میں بہتری ہوتی ہے۔ اس طرح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان میں لکھنے کی صلاحیت پر پروسیس اپروچ مثبت اثر ڈالتی ہے۔ پروسیس اپروچ کے ذریعے طلبا کی تحریری صلاحیت میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔

5 یہ مطالعہ 'اردو زبان میں لکھنے کی صلاحیت پر عمل رسائی کا اثر' لرنرس کی تحریری صلاحیت میں بہتری لانے کی غرض سے بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔اس مطالعے کے ماحاصلات اور نتائج کلی طور سے اردو لرنرس اور پورے اردوداں طبقے کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ مطالعہ اردو سے محبت کرنے والوں، اردو سیکھنے سکھانے کا جذبہ رکھنے والوں اور ان ممالک اور ریاستوں، اداروں کے لیے بھی مفید اور اہمیت کا حامل ہے جہاں کی زبان اور ذریعہ تعلیم اردو ہے۔

خلاصہ

اس اپروچ کے استعمال سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس سے طلبا کو غوروفکر اور آزادانہ طور سے لکھنے کا موقع ملتا ہے۔ نیز طلبا کو اپنی رائے قائم کرنے کا موقع ملے گا اور اعتماد میں بھی اضافہ ہوگا اور جیسے جیسے یہ صلاحیتیں طلبا کے اندر پروان چڑھیں گی ویسے ویسے کاپی پیسٹ کا کلچر بھی ختم ہوگا علاوہ ازیں طلبا تحریری طور سے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے قابل ہوجائیں گے اور تحریری طور سے اپنی بات بلاتکلف اور بغیر کسی رکاوٹ کے آسانی کے ساتھ پیش کرسکیں گے۔

■

Dr. Jarrar Ahamad
Assistant Professor, Dept of Education & Training, MANUU
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob: 9618783492, Email.: jarrarurb@gmail.com

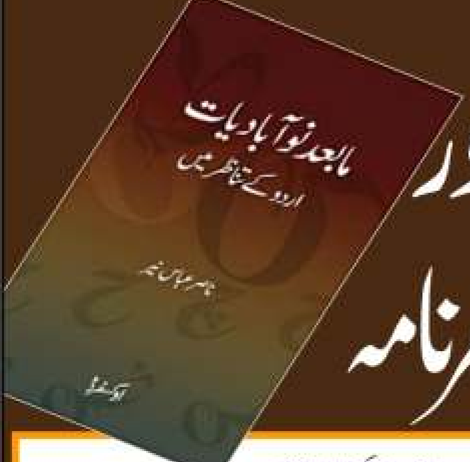

ظہور احمد گنائی

مابعد نوآبادیاتی اجبار اور برصغیر کا ثقافتی منظرنامہ

مابعد نوآبادیات ایک ایسے طرزِ تحقیق اور مطالعے کا نام ہے جس میں نوآبادیاتی عہد کی تاریخ، ثقافت، معاشرت، نفسیات، تہذیب اور زبان و ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نوآبادیاتی عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی عوامل کی تہہ میں جاکر ظلم و بربریت اور طاقت کے غلط استعمال کو منکشف اور طشت از بام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مابعد نوآبادیات اس عہد کا نام ہے جو برِصغیر کی آزادی اور نوآبادیاتی تسلط سے چھٹکارا پانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ نوآبادیاتی تسلط سے آزادی حاصل کرنا یا سیاسی طور پر خودمختار ہونا مکمل آزادی نہیں ہوتی ہے بلکہ آزادی اپنی اصل میں اس سیاسی، سماجی اور ثقافتی نظام کا نام ہے جس میں خوف، ڈر، جبر، سماجی نابرابری، استحصال اور تشدد جیسے عناصر موجود ہی نہ ہو۔ دراصل مابعد نوآبادیات تنقید کا وہ نظریہ ہے جو مابعد جدید تھیوری کے تحت ادبی منظرنامے پر آیا۔ یہ نظریہ نقد نوآبادیاتی ملکوں کے ادب کو ایک نئے زاویے سے سمجھنے کی کوشش کرنے پر اصرار کرتا ہے۔

مابعد نوآبادیات کیا ہے؟ اس کے امکانات اور دائرہ کار کیا ہیں؟ یہ اور ایسے متعدد سوالات ذہن میں اُبھر رہے ہیں جن کا جواب تلاش کرنا ادب کے ہر سنجیدہ طالبِ علم کے لیے لازم ہے۔ ان تمام سوالات کا تسلی بخش جواب حاصل کرنے کے لیے ہمیں نوآبادیات کو تاریخی پسِ منظر میں سمجھنا ضروری ہے کیونکہ نوآبادیات اور مابعد نوآبادیات ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ اس لیے مابعد نوآبادیات کا ذکر نوآبادیات کے بغیر مناسب ہے نہ ہی معقول۔

اردو میں نوآبادیات انگریزی لفظ Colonialism کے ترجمے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک لاطینی زبان کا لفظ ہے جو ''Colonia'' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر نئی آبادی قائم کی جائے، جس میں مقامی آبادی کا ہر سطح پر استحصال کیا جاتا ہے۔ اس سے ایک نئی جگہ پر نئی بستی بسانا بھی مراد لیا جاتا ہے۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات تاریخ کے مطابق 'نوآبادیات' کا لفظ سب سے پہلے روم میں استعمال کیا گیا:

''colonia'' پرانے رومی فوجیوں کی شہری بستی۔ وہ رومی شہری جو قصبے میں رہتے تھے ان کے پاس وسیع زرعی زمین اور کافی حد تک مقامی امور میں ان کو حکومت کی خود اختیاری حاصل ہوتی۔ اس میں ارد گرد کا علاقہ شامل ہوتا۔''

(محمد صدیق قریشی: کشاف اصطلاحاتِ تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1988، ص 71)

قدیم زمانے میں ملکِ روم میں سامراجی نظام کا غلبہ تھا۔ اس سامراجی نظام نے آس پاس کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرکے اپنی سلطنت کا حصہ بنایا۔ ان کے مقبوضہ علاقوں میں افریقہ کے علاقے، مقدونیہ، سپین، شام، مصر اور ان کے گرد و نواح کے علاقے شامل ہیں۔ ان تمام علاقوں میں رومیوں کا قبضہ تھا اس طرح سے روم اپنے عہد کی سب سے بڑی سامراجی طاقت بنی۔ گویا نوآبادیات وہ نظامِ عمل ہے جس میں ایک طاقتور ملک اپنی فوجی طاقت اور مختلف حکمتِ عملیوں کی بنیاد پر دوسرے ممالک (کمزور ممالک) کو ہر سطح سے مغلوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی ایک علاقے کے لوگوں کا دوسرے علاقے میں جاکر غاصبانہ طور پر اپنی آبادیاں قائم کرنا اور وہاں کی زمینوں پر قبضہ کرکے ان کے قدرتی وسائل، تجارت، صنعت و حرفت پر قبضہ کرکے اسے توسیع دینا ہے۔ جس علاقے میں یا جس ملک میں نوآبادیاتی تسلط قائم کیا جاتا ہے وہاں کے اصل باشندوں پر قابض استعمار اپنا حکم چلاتا ہے۔ وہ اپنے قوانین، تہذیب، ثقافت، معاشرت اور حکومت لوگوں پر مسلط کردیتے ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قابض استعمار اور نوآبادی کے اصل باشندوں کے درمیان ظلم و جبر، ناانصافی کا تعلق پیدا ہوتا ہے، جس میں اصل باشندوں کا ہر سطح پر استحصال ہوتا ہے۔ قابض آبادی کا غلبہ مقبوضہ علاقے کے تمام تر وسائل پر ہوتا ہے، جس کی مدد سے وہ اپنی معاشی اور اقتصادی ترقی کو یقینی بناتی ہے۔ نوآبادکار ہر سطح پر مقامی لوگوں سے معاشرتی، معاشی اور سائنسی میدان میں ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ اس لیے ان میں احساسِ برتری غالب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری اقوام پر یہ اپنی بالادستی قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ ان پر ہمیشہ راج کرنا چاہتے ہیں۔

نوآبادیات کی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کے آثار قدیم تہذیبوں سے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان تہذیبوں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ زمانۂ قدیم سے ہی انسان ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ قدیم زمانے کے انسان قبیلوں میں رہتے تھے۔ ان قبیلوں کے مابین یہ رسہ کشی عام دیکھنے کو ملتی تھی کہ طاقتور قبیلہ کمزور قبیلے پر غلبہ پانے کی کوشش کرتا تھا۔ اپنے کمزور حریف کے وسائل پر قبضہ کرتا تھا۔ قبائلی نظام کے بعد جب ملک معرضِ وجود میں آئے تو ان کے مابین بھی کمزوروں کو زیر کرنے اور ان کے وسائل چھیننے کے مختلف طریقے اپنائے گئے۔ اسی غیر محسوس طریقۂ کار کو آزمانے کی غرض سے انگریز بھی ہندوستان میں داخل ہوئے۔ حالانکہ پہلے پہل یہاں اپنی تجارتی سرگرمیوں کو بحال کرتے گئے لیکن رفتہ رفتہ یہاں کی سیاسی اور سماجی کمزوریوں کو دیکھ کر ملک کے ذاتی معاملات میں بھی دخل اندازی کرنا شروع کردیے۔ انھوں نے اپنا اثر و رسوخ اور اپنی بالادستی قائم کی۔ نتیجے کے طور پر ہندوستان کے تمام تر وسائل پر قبضہ جمایا۔ صنعت و حرفت کو ناکارہ بنا دیا اور یہاں کے مقامی باشندوں کو زرخرید غلاموں کی طرح نسلوں نسلوں تک غلام اور محتاج بنا کر چھوڑا۔ یہ اپنے ان مکروہ عزائم کے لیے صرف ہندوستان میں داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ بہت سارے ممالک میں انھوں نے اپنے اس استحصالی رویے کو روا رکھا۔ ایک اندازے کے مطابق 1914 تک دنیا کی 85 فی صد زمین پر ان کا قبضہ تھا۔ نوآبادیات ایک ایسے ہی نظام کا نام ہے جس میں طاقتور گروہ کمزور طبقہ کو یرغمال بناتا ہے، ان کے قدرتی وسائل پر اپنا حق جتاتا ہے، ان کے یہاں سے خام مال حاصل کر کے مختلف ضروری چیزیں بناتا ہے۔ انھی چیزوں کو مارکیٹ میں مہنگے داموں بیچ کر اپنی معیشت کو مضبوط بناتا ہے:

''انگریزوں نے اجتماعی نسل کشی کے بجائے طاقت کے استعمال کی ایک اور صورت دریافت کی۔ یہ صورت انوکھی مگر پوری طرح کارگر تھی۔ 30 کروڑ آبادی کے

ہندوستان پر صرف چند ہزار برطانوی سول ملازمین نے نو آبادی قبضہ کیے رکھا۔"

(ڈاکٹر ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لاہور، 2013، ص 11)

جب پندرہویں صدی میں یورپ میں دورِ جدید کا آغاز ہوا، یورپ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا، نئی نئی ایجادات ہونے لگیں تب زیادہ سے زیادہ پیداوار کی طرف دھیان دیا گیا۔ بنائی ہوئی اشیا کو دور دراز منڈیوں میں بیچنے اور وہاں سے خام مال کی تلاش کی جانے لگی۔ نئے نئے راستوں کی تلاش شروع ہوگئی۔ کرسٹوفر کولمبس پہلے وہ شخص تھے جو اس مقصد سے یورپ سے نکلے اور 1491 کو امریکہ دریافت کیا۔ اس کے بعد پرتگالی جہاز ران واسکوڈی گاما نئے راستوں کی تلاش کرتے کرتے 1498 میں جنوبی ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پہنچ جاتا ہے۔ یوں ہندوستان سے پرتگالی روابط شروع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے یورپیوں نے امریکہ کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں اپنی آبادیاں قائم کرنا شروع کردی۔ پرتگالی، اسپینش، ڈچ، برٹش، اور فرانسیسی اپنا ملک چھوڑ کر امریکہ، افریقہ اور ایشیا جیسے برِ اعظموں میں آباد ہونے لگے۔ برِصغیر ہند و پاک میں نوآبادیاتی عہد سکندرِ اعظم سے لے کر پرتگالی، یورپی، ولندیزی، فرانسیسیوں سے ہوتا ہوا برطانوی عہد تک آتا ہے۔

1600 میں ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کی غرض سے قائم کی گئی۔ اس وقت انگلستان میں ملکہ الزبتھ کی حکومت تھی تو یہاں مغل بادشاہ اکبر کا بول بالا تھا۔ 1608 میں ہاکنس نے مغل بادشاہ جہانگیر سے ایک تجارتی کوٹھی بنانے کا اجازت نامہ حاصل کیا۔ پہلے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کافی عرصے تک پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور ان سے قبل مقامی عہدے داروں کے ساتھ لڑائیوں میں اُلجھی رہی جس میں برطانوی ان پر غالب آگئے مگر اس سب کے باوجود بھی کمپنی نے دولت جمع کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ اس کمپنی نے برصغیر کے تمام تر وسائل اور ذرائع کو لوٹنے میں اپنی پوری طاقت صرف کی۔ ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت جمع کرکے یہاں سے برطانیہ منتقل کیا۔ تجارت کا صرف بہانہ تھا اصل میں ان کو یہاں کے وسائل لوٹنا مقصود تھا۔ تجارت کے پس پردہ وہ اپنے تمام منصوبوں میں کامیاب ہوئے اور دولت کے ساتھ ساتھ خام مال بھی برطانیہ منتقل کیا اور ترقی کی منزلیں طے کیں۔ دھیرے دھیرے انگریزوں نے یہاں اپنے قدم جمانے شروع کیے۔ 1707 میں جب اورنگ زیب کی وفات ہوئی تو مغلیہ سلطنت کافی کمزور اور زوال کا شکار ہوگئی۔ اسی موقعے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے انگریزوں نے اپنی پالیسی کو جاری رکھتے ہوئے ہندوستان کے متعدد علاقوں کو اپنے قبضے میں لینا شروع کردیا۔ پلاسی کی جنگ اس کی ایک واضح مثال ہے جو 1757 میں لڑی گئی۔ اس جنگ سے نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کمپنی کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے بعد بکسر کی جنگ 1764 میں لڑی گئی مگر یہاں بھی کمپنی نے اپنا لوہا منوایا اور حریف فوجوں کو شکست سے دوچار کیا۔ اس طرح سے ان جنگوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا سیاسی اقتدار قائم کیا اور پورے جنوبی ہندوستان پر اپنا قبضہ جمایا۔ اپنی سیاسی اور انتظامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اور ہر سطح پر ہندوستان پر تسلط قائم و دائم رکھنے کے لیے مشرقی طرز پر مدرسے اور ادارے قائم کیے گئے۔ ان اداروں کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان آنے والے نو وارد انگریزوں کو یہاں کی زبان سکھائی جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہاں کی تہذیب و ثقافت سے بھی روشناس کرایا جائے۔ فورٹ ولیم کالج ان ہی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے کلکتہ میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کی بدولت انگریزوں نے علم اور ادب کا سہارا لے کر اپنے مقاصد کو انجام تک پہنچانے کے لیے اسے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی جگہوں پر متعدد اورینٹل کالجوں کا اہتمام کیا گیا۔

ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

"مغربی استعماریت کو حتمی اور کلی حیثیت یوں تو 1857 میں حاصل ہوئی۔ مگر اس سے پہلے کی لسانی خدمات اور تعلیمی پالیسی نے مغربی تہذیب کی برتری کا اعتبار قائم کرنا شروع کردیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، اورینٹل سمیزی، دہلی کالج، کلکتہ مدرسہ اور آگرہ کے کالجوں کی ظاہری مشرقیت پسندی اور تعلیمی خدمات نے ایک ایسی فضا قائم کردی تھی کہ ایک بڑے علمی حلقے کو اس نوع کا کوئی برطانوی اقدام نہ صرف یہ کہ شک و شبے سے بالاتر نظر آنے لگا تھا بلکہ اس نوع کے اقدامات میں ہی اسے ہندوستانی عوام کی تعلیمی اور تہذیبی فلاح و بہبود کا رستہ دکھائی دینے لگا تھا۔"

(ابوالکلام قاسمی، معاصر تنقیدی رویے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2012، ص 59)

مابعد نوآبادیاتی ڈسکورس کے نامور محقق ایڈورڈ سعید نے اس عمل کا نام شرق شناسی دیا ہے یعنی جو بھی مغربی، مشرق کے بارے میں لکھتا، پڑھتا اور تحقیق کرتا ہے، شرق شناسی ہے۔ ایڈورڈ سعید کے مطابق شرق شناسی مشرق پر مغرب کا تسلط برقرار رکھنے کے لیے تشکیل دی جاتی ہے۔ مابعد نوآبادیات کو بطور ڈسکورس متعارف کرنے میں ایڈورڈ سعید کا نام سب سے اہم ہے۔ ان کی کتاب 'شرق شناسی' (Orientalism) 1978 میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کا موضوع نوآبادیاتی نظام اور مابعد نوآبادیاتی نظام ہے۔ مابعد نوآبادیاتی مطالعات کے حوالے سے اسی کتاب کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ایڈورڈ سعید نے تقریباً بیس کتابیں لکھی ہیں مگر دنیا میں سب سے زیادہ پذیرائی 'شرق شناسی' کو حاصل ہوئی۔ ان کی اس کتاب کو بیسویں صدی کی سب سے طاقتور ترین کتاب تسلیم کیا جاتا ہے کیونکہ اس کتاب کی وجہ سے پوری دنیا کی سوچ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ایڈورڈ سعید وہ پہلے مفکر نہیں تھے جنھوں نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا، یا ان کی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی پہلی کتاب نہیں تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ ایڈورڈ سعید نے بے باک انداز میں مغرب کے چہرے سے اس طرح نقاب سرکایا جس سے بہت سے دھندلے مناظر واضح ہوگئے۔

نوآبادکاروں نے جس جس علاقے میں بھی قدم رکھا تجارت کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت مضبوط کرنے کا منصوبہ بھی جاری رکھا۔ اپنی فوجوں کو مستحکم بنایا اور اپنی سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے ان علاقوں پر بھی قابض ہوئے جن پر قبضہ کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا تھا۔ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان براہ راست برطانیہ کے زیرِ نگیں ہوگیا۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جو نہ صرف سیاسی نوعیت کی تھی بلکہ یہ دو تہذیبوں کے درمیان ایک تصادم تھا۔ جس میں مقامی اور غیر مقامی ثقافتوں کا تصادم دیکھا گیا۔ نتیجے کے طور پر حاکم محکوم پر فتح یاب ثابت ہوا۔ یہیں سے انگریزوں نے ہندوستان کے ہر شعبے میں مداخلت کرنا شروع کردی۔ اس سے ہوا یوں کہ ہندوستان کی حیثیت ایک 'کالونی' کی ہوگئی۔ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ جو لوگ نوآبادکار مخالف جذبات بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر رکھتے تھے ان کو سرِ عام پھانسیاں دی گئیں۔ دہشت پھیلائی گئی۔ دردناک سزائیں دی گئیں۔ یہ سب کرنے میں نوآبادکاروں کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ ان کے خلاف مزاحمت کے تمام عناصر کو جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا جائے۔ خوف اور دہشت کے ذریعے کافی حد تک مقامی لوگوں کو دبایا گیا۔ اس کے برعکس ان لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازا گیا جو انگریزوں کے خاکوں میں رنگ بھرتے تھے اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے:

"نوآبادیاتی صورتِ حال، فطری اور منطقی صورتِ حال نہیں ہے۔ یہ از خود کسی قابلِ فہم فطری قانون کے تحت رونما نہیں ہوتی...... اسے 'پیدا' کیا جاتا اور تشکیل دیا جاتا ہے۔ چونکہ 'پیدا' کیا جاتا ہے، اس لیے مخصوص مقاصد کے

حصول کو سامنے رکھا جاتا ہے۔''

(ڈاکٹر ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 2015، ص 31)

1857 کی ناکام بغاوت صرف سیاسی شکست و ریخت نہ تھی بلکہ نوآبادکاروں کی مکاری سے یہاں کے مقامی لوگوں کو مذہبی خطوط پر تقسیم در تقسیم کرکے صدیوں تک مشغول رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ذہنی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی سطحوں پر لوگ بحران کا شکار ہوئے۔ مقامی لوگ مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کو آسانی سے قبول کرنے لگے۔ نوآبادکار یہاں کے مقامی لوگوں کو علمی، ادبی، ثقافتی اور فنی ترقی دکھا کر ان کا دل جیتنا چاہتے تھے مگر اس میں ہندوستانیوں کا فائدہ کم اور استعمار کا ذاتی فائدہ زیادہ شامل ہوتا تھا۔ ایک ملک کا دوسرے ملک پر قابض ہونے کے پیچھے بہت سے مقاصد پوشیدہ ہوتے ہیں انگریز نوآبادکار بھی یہاں ان ہی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے آئے تھے۔ گویا استعمار یہاں مقامی لوگوں کو سیاسی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ثقافتی طور پر بھی زیر کرنا چاہتے تھے۔

برطانوی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے بعد 1947 میں مابعد نوآبادیاتی صورت حال پیدا ہوتی ہے جسے عرف عام میں مابعد نوآبادیات کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے Postcolonialism کہا جاتا ہے۔ مابعد نوآبادیات دراصل مابعد جدید تھیوری کے تحت بحث و مباحثے کا حصہ ہے۔ واضح رہے کہ مابعد جدیدیت کے زیر اثر ادب شناسی کے مختلف تنقیدی نظریات سامنے آئے جس میں ادب کی تفہیم و تعبیر مختلف زاویوں سے کی گئی۔ اس عہد میں ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے جو اہم تنقیدی نظریات سامنے آئے ان میں پس ساختیاتی تنقید، نئی تاریخیت، قاری اساس تنقید، بین المتونیت، امتزاجی تنقید، اکتشافی تنقید، تانیثی تنقید، نو مارکسی تنقید اور مابعد نوآبادیاتی تنقید۔ مابعد نوآبادیات کا تنقیدی نظریہ ایک ایسا تنقیدی نظریہ ہے جو نوآبادیاتی دور میں لکھے گئے ادب کا از سر نو جائزہ لیتا ہے اسے مابعد نوآبادیاتی تنقید کی کسوٹی پر پرکھتا ہے فن پارے کی تہہ میں جاکر ان تمام حکمتِ عملیوں، سازشوں اور تدبیروں سے پردہ اُٹھاتا ہے جن سے نوآبادیاتی نظام رائج کیا گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مابعد نوآبادیات مختلف سوالات قائم کرتا ہے اور ان کا جواب بھی ڈھونڈ نکالتا ہے، کہ ہم کس طرح سے غلام بنائے گئے؟ نوآبادکاروں نے کن حکمتِ عملیوں کے تحت ہمیں ذہنی، جسمانی، ثقافتی اور معاشی طور پر مغلوب کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ہمیں اس بات کی طرف مائل کر دیتا ہے کہ ہمیں اپنی ثقافت کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے تاکہ ہمیں اپنی شناخت مل سکے۔

کافی عرصے تک استعمار نے برصغیر کو اپنی نوآبادی بنا کر رکھا اور انھوں نے اپنے معاشی مقاصد کے لیے ایک خاص قسم کا لائحہ عمل اختیار کیا۔ نام نہاد آزادی حاصل کرنے کے بعد ایسے نقوش چھوڑ گئے جن سے نکلنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ مجموعی سطح پر اگر دیکھا جائے تو ہمارے ذہن آج بھی colonised ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی نظام نے مختلف شکلیں اختیار کیں مگر کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ہے۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو ہمارے ذہن میں کچھ سوالات اس طرح سے اُبھر رہے ہیں: کیا نوآبادیاتی دور کا اختتام ہو چکا ہے؟ کیا ہم واقعی مغرب کے تسلط سے آزاد ہو چکے ہیں؟ کیا ہماری تہذیب و ثقافت مغربی نہیں ہے؟ کیا آج بھی ہم ثقافتی اور ذہنی طور پر غلام نہیں ہیں؟ ایسے اور بھی کئی سوالات ہیں جن کی بنیاد پر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ نوآبادیاتی دور کے اختتام کے بعد بھی اس کے اثرات اس قدر فطری دکھائی دیتے ہیں کہ اس کے دام سے نکلنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ایک ملک یا قوم کو اسی وقت زیر کیا جا سکتا ہے جب وہ سیاسی، معاشی اور ثقافتی طور پر زوال پذیری کا شکار ہو۔ اس میں ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ جب کسی ملک میں کوئی مرکزی اور باصلاحیت حکمران موجود نہ ہو گویا یہ بھی ایک قوم کی غلامی کا باعث بن جاتا ہے۔ برصغیر کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا جب انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کیا تو یہاں انتشار کی کیفیت تھی۔ اسی لیے انھوں نے اتنے وسیع و عریض ملک میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے۔ اس انتشار کو انگریزوں نے بھانپ لیا اور 'نفاق ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی کو اپنایا:

''کولونیل ازم ایک نیا ڈرامہ تھا، جس کا اسکرپٹ یورپ نے لکھا اور جسے کھیلنے کے لیے ایشیا و افریقا کی سر زمین کو منتخب کیا۔ ڈرامے کے مرکزی کردار یورپی تھے، تاہم کچھ معاون اور ضمنی کردار ایشیائی و افریقی تھے، مابعد نوآبادیاتی مطالعہ اس ڈرامے اور اس کے کرداروں کے باہمی رشتوں، واقعات، پلاٹ وغیرہ کا تفصیلی تجزیہ کرتا ہے۔''

(ڈاکٹر ناصر عباس نیر، مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لاہور، 2013، ص 6)

مابعد نوآبادیات جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے یہ وہ دور ہے جو نوآبادیات کے بعد شروع ہوا، اس کا تعلق تہذیب و ثقافت سے ہوتا ہے، جس میں استعمار کار ایک علاقہ یا ملک چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور وہاں کے اصل باشندے وہاں کا نظام سنبھالتے ہیں مگر یہ حکمرانی کرنے والا اور نظام کو سنبھالنے والا طبقہ دراصل ان ہی کے مہرے ہوتے ہیں اور لوگ اس کو آزادی کا نام دیتے ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے کافی دیرپا اثرات ہوتے ہیں، اس ضمن میں انگریزوں نے یہاں کے لوگوں کی ذہن سازی کا ایک باضابطہ ڈسکورس قائم کیا جس میں مقامی آبادی کو یہ احساس دلایا گیا کہ ان کی تہذیب و ثقافت ادنیٰ درجے کی ہے اور انگریزوں کی اعلیٰ ہے۔ ان سارے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے وہ مختلف حکمت عملیوں، تدبیروں اور سازشوں کو اپناتے ہیں۔ مابعد نوآبادیاتی مطالعہ تمام سازشوں اور حکمتِ عملیوں سے پردہ اُٹھاتا ہے جن سے نوآبادکار اپنے منصوبوں کو تشکیل دیتا ہے۔ نوآبادکار سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ ثقافتی لحاظ سے بھی مقامی آبادی کو مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انگریز نوآبادکار نے ہر لحاظ سے اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے یہاں کے اصل باشندوں کو اپنی اور مائل کرنے کے لیے مختلف حربے اپنائے اور اس پر خاص توجہ دی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ مقامی باشندوں کو یہ باور کرایا گیا کہ مغربی ثقافت کی تقلید کرو کیونکہ تمہاری اپنی ثقافت قابل عمل نہیں ہے۔ اس طرح سے لوگ ان کی طرف مائل ہوئے اور اس بات کے قائل ہو گئے۔ 1600 کے بعد انگریز یہاں تقریباً دو صدیوں یہاں مقیم رہے ان کا یہ قیام برصغیر میں نوآبادیاتی عہد کہلاتا ہے:

''فی الوقت ہماری بہترین کوششیں ایک ایسا طبقہ معرض وجود میں لانے کے لیے وقف ہونی چاہئیں جو ہم اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین، جن پر ہم حکومت کر رہے ہیں، ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے۔ یہ طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو، لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم و فراست کے اعتبار سے انگریز۔'' (ایضاً، ص 12)

نوآبادیاتی طاقت آج بھی مختلف انداز میں دوسرے ممالک کو زیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جو معیشتوں کے درمیان لڑی جا رہی ہے۔ اس کی تشہیر میں میڈیا کا سب سے اہم کردار ہے جو چیزیں آج میڈیا ہمارے سامنے لاتی ہے ہم وہی سچ مان لیتے ہیں۔ مابعد جدیدیت نے اسے hyper reality کا نام دیا ہے۔ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے دکھایا کچھ اور جاتا ہے۔ اس جنگ میں دوسرے ممالک کو اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے جدید اسلحے کا استعمال نہیں کرنا پڑتا ہے۔

■

Zahoor Ahmad Ganaie
Research Scholar, Dept. of Urdu
University of Kashmir
Srinagar 190006 (J&K)
Mob.: 7006013329
Email: mrjaan26@gmail.com

شاہد علی

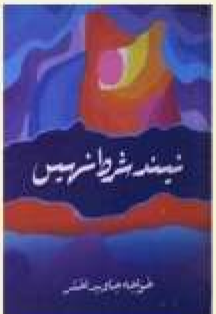

خواجہ جاوید اختر کا شعری و ادبی تخیل

شعرا و ادبا کے ہجوم میں پہچان رکھنے والوں میں ایک نمایاں نام خواجہ جاوید اختر کا ہے جو محض ایک شاعر کا حساس دل ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ شیشے کی مانند چکنا بھی جانتے تھے۔

اس بھیڑ میں پہچان مری سب سے جدا ہے
شیشہ ہوں مگر آئینہ خانے کا نہیں میں

خواجہ جاوید اختر خوبصورت آواز کے مالک تھے جنھیں آج بھی مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ انھیں صاحب اسلوب غزل گو شاعر کی شناخت حاصل رہی ہے۔ 2010 میں ان کا شعری مجموعہ "نیند شرط نہیں" شائع ہو کر برصغیر کے ادبی حلقوں میں داد و تحسین وصول کر چکا ہے۔ 'نیند شرط نہیں' پر خواجہ جاوید کو صوبہ بہار، اتر پردیش اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں نے انعامات و اعزازات سے بھی نوازا تھا۔

ذہین شاعر و ادیب خواجہ جاوید اختر اپنی کتاب کے 'عرض حال' میں لکھتے ہیں کہ ان کے استاذ محترم پروفیسر ابوالکلام قاسمی (اے ایم یو) صاحب نے 'شب خون' میں اپنے شاگرد کی غزل دیکھ کر کہا تھا "اب تمہاری غزل کو Recognition ملا ہے۔" (نیند شرط نہیں، ص:26)

بعد ازاں وہ تواتر سے شب خون میں محض چھپتے ہی نہیں رہے بلکہ شب خون کے 40 سالہ انتخاب میں بھی ان کی غزل کو شامل کیا گیا۔ عالمی شہرت یافتہ ناقد و ادیب پدم شری شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنی کتاب 'معرفتِ شعرِ نو' میں ایک مضمون بعنوان 'خواجہ جاوید اختر: الہ باد کا نیا غزل گو' بھی شامل کتاب کیا۔ متذکرہ باتیں کسی بھی نوعمر اور نو وارد شعر و ادب کے لیے اعزاز کی حامل ہو سکتی ہیں تو خواجہ بھائی کے لیے باعثِ اعزاز و ناز کیونکر نہ ہو؟

سہل ممتنع کو شاعری کا جھومر کہا گیا ہے اور اسے شاعر کی قادر الکلامی کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

سہل ممتنع میں بلیغ باتیں کہنا بہت مشکل کام ہے لیکن خواجہ جاوید کو اس میں دسترس حاصل تھی۔ اس معاملے میں میر تقی میر کو سب سے بالا مقام دیا جاتا ہے۔ جن شاعروں کے یہاں سہل ممتنع کا عنصر کافی ملتا ہے، ان میں ایک قابلِ ذکر نام خواجہ جاوید اختر کا بھی ہے۔ دلیل کے طور پر اردو کے عظیم نقاد، ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر، مترجم اور ماہر لسانیات شمس الرحمٰن فاروقی (مرحوم) خواجہ جاوید کی کتاب 'نیند شرط نہیں' کی تقریظ میں رقمطراز ہیں "خواجہ جاوید اختر کی شاعری کا انداز سہل ممتنع اور عام بول چال کا سا ہے۔ اس انداز کو مزید تقویت اس بات سے ہوتی ہے کہ انھوں نے زیادہ تر شعر چھوٹی بحروں میں کہے ہیں۔" (نیند شرط نہیں، خواجہ جاوید اختر کی غزل، ص:17) مثال کے طور پر سہل ممتنع اور چھوٹی بحروں میں خواجہ جاوید اختر کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

بے پردہ ہیں لیلائیں　　اور مجنوں محمل میں ہیں
مٹھی میں الفاظ کرو　　پھر لکھنا آغاز کرو
صدیوں کا آثار گرایا　　کس نے یہ مینار گرایا
جنھیں بدنام کرنا چاہتے ہو　　وہی مشہور ہوتے جا رہے ہیں
بڑھی ہے روشنی تہذیبِ نو کی　　مکاں بے نور ہوتے جا رہے ہیں

مختصر الفاظ میں گہری اور بھرپور بات کہنا بہت مشکل امر ہے اور یہ کٹھن کاز ماہرینِ فن ہی کر سکتے ہیں۔ موصوف اس فن سے خوب آشنا تھے۔ خواجہ جاوید کی شاعری میں سادگی اور سلاست بھی بلا کی ہے۔ سادہ اور چھوٹی بحر کے شعر میں بلیغ باتیں وہ آسانی سے یوں کہہ جاتے تھے۔

تارکی سے خوف نہ کھاؤ　　رات ڈھلے گی دن نکلے گا
پہلے سوتی تھی چین سے دنیا　　اب کوئی بے خبر نہیں سوتا
روشنی بانٹنے کی چاہت میں　　اک دیا رات بھر نہیں سوتا

تنگ پڑتی ہے زمیں لاکھ تو پڑنے دیجیے
آسماں دیکھیے تا حدِ نظر میرا ہے
وہ دیکھنے میں بظاہر تو پھول ایسا ہے
چبھے گا چھو کے تو دیکھو ببول ایسا ہے

خواجہ جاوید اختر باظرف ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شرافت، خوش مزاجی اور خوش گفتاری کا زمانہ قائل رہا ہے۔ موصوف ایک زندہ دل شخص، زندہ دل دوست اور زندہ دل شاعر تھے جن کے پاس اپنے محبوب کے لیے دھڑکتا ہوا ایک حساس دل کا نرم گوشہ بھی تھا۔ لہٰذا ان کی شاعری میں عشقیہ رنگ کی موجودگی کم ہی سہی لیکن کم زور یا عنقا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر زیرِ نظر اشعار دیکھیں۔

وہ چلمن سے اپنی تو کم دیکھتے ہیں
وہی جن کو حسرت سے ہم دیکھتے ہیں
لگاتے ہیں چکر ہم ان کی گلی کا
کبھی شام ڈھلتے کبھی خوب تڑکے

جان نہ دیتا تو کیا کرتا　　اور نہیں تھا چارہ کچھ
لمحوں میں کر سکتا تھا　　میرا ایک اشارہ کچھ
کچھ تو ہے بے قراری مجھ کو　　اور اس کو بھی بے کلی کچھ ہے
ایک دل کو سکوں نہیں ملتا　　ورنہ کہنے کو یوں بھی کچھ ہے

خواجہ جاوید اختر جہاں دوستوں کے دوست تھے وہیں محفلوں کی جان بھی تھے۔ اکثر و بیشتر بزم کو زعفران زار کر گزرنے میں اہم جزو ثابت ہوتے۔ انھیں تعلقات کو بنانے اور نبھانے کے ہنر میں ید طولیٰ مہارت حاصل تھی۔ اپنی خوش اخلاقی، دوست نوازی اور جذبۂ ایثار کی بنا پر وہ متضاد ادبی خیموں میں یکساں معتبر و مقبول تھے۔ وہ بڑوں کو Respect اور چھوٹوں کو Accept کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ متذکرہ رنگ اور آہنگ میں بھی ان کے اشعار جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حسب ذیل اشعار سے محظوظ ہوں۔

زمانہ تھا کہ ہم اک دوسرے پر جان دیتے تھے
کہاں کوئی کسی پر آج کل قربان ہوتا ہے
نبھانا کس قدر مشکل ہے اب رسمِ محبت بھی
زباں سے یوں تو کہہ دینا بہت آسان ہوتا ہے
ہمیں دیکھتی ہے حقارت سے دنیا
محبت سے دنیا کو ہم دیکھتے ہیں
جو مختلف تھے ساتھ ہیں میرے
کچھ کشش ہے میری زبان میں کیا

خواجہ جاوید اختر کے اسلوب کا کیا کہنا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں لاجواب صنعتیں استعمال کیں اور تکرار لفظی سے قابلِ رشک کام لیا۔ ان کی شاعری میں فکری عنصر بھی بہتر و بیشتر ملتا ہے۔ ان کے بعض اشعار اس کی تمثیل ہیں۔ ملاحظہ کریں۔

تجھے چھونا کسی صورت مرے بس میں نہیں
تری صورت تصور کو ترے چھوکر بناؤں گا
سلیقے سے ہم بات کرتے ہیں ان سے
جنھیں گفتگو کا سلیقہ نہیں ہے

نازک خیالی، ندرت اظہار اور معنی آفرینی کی خصوصیت جو ان کی شاعری میں ہے اس عمر میں دوسروں کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ بعض شعرا کا ایک شعر یا ایک ہی مصرع اسے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں خواجہ جاوید اختر کا زیر نظر شعر دیکھیں۔

بھروسا بہت ہے مجھے زندگی پر
مگر زندگی کا بھروسا نہیں ہے

لفظوں کو سلیقے سے برتنا ایک فن ہے۔ اس فن میں مہارت مسلسل ریاضت سے ہی ممکن ہے۔ خواجہ جاوید کی شاعری میں یہ فن بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ عظیم ناقد، محقق، شاعر اور ادیب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے خواجہ جاوید اختر کی کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے" وہ باتوں باتوں میں چبھتی ہوئی بات کہہ جاتے ہیں جو عقل مندی سے بھرپور ہوتی ہے، کم عمری کے باوجود ان کے انداز گفتگو میں تجربہ کار بوڑھوں جیسی کیفیت ہے۔" (نیند شرط نہیں، خواجہ جاوید اختر کی غزل ص:14) مثال کے طور پر زیر نظر شعر ملاحظہ فرمائیں:

آبرو سلامت ہے جھک کے چلنے والوں کی
آسماں نظر اپنی ٹوپیاں سنبھالے ہیں
سر اٹھائے ہوئے جو شجر ہے میاں
اس پہ آندھی کی گہری نظر ہے میاں
اتنا اکڑ کے چلتے ہو پھر کیوں زمین پر
تم سیدھے آسماں سے اتارے نہیں گئے
ہم بھی کسی کی زلف گرہ گیر کی طرح
الجھے ہیں اس قدر کہ سنوارے نہیں گئے

خواجہ جاوید اختر کلکتہ کے مضافاتی علاقہ کانکی نارہ (مغربی بنگال) میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ کی گداز علمی وادبی فضا میں ہائر ایجوکیشن کی حصولیابی کے بعد الہ آباد کے ہوکر رہ گئے۔ یہاں انھیں قدآور ادیب وشاعر اور محقق شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی صحبت نصیب ہوئی، اس سے جاوید بھائی کی ادبی فہم وفراست کو کافی تقویت اور جلا ملی۔ موصوف اپنی متحرک وفعال ہستی و طرز زندگانی کی ترجمانی ذیل کے شعر میں کچھ یوں کرتے ہیں۔

ٹوٹنا اور بکھرنا الگ بات ہے
کچھ ستارے مسلسل سفر میں رہے
ہمارے ساتھ اٹھنا بیٹھنا یوں ہی رہا تو پھر
تمھیں ہم آدمی سے ایک دن انسان کردیں گے
تعلق ہے ہمارا مغربی بنگال سے جاوید
مگر ہم اک مدت سے الہ آباد رہتے ہیں

اس شعر کے خالق خواجہ جاوید اختر اب اس دارفانی میں نہیں ہیں لیکن آج بھی ارباب سخن کے دلوں میں زندہ و جاوید ہیں۔ خواجہ جاوید اختر ماہ صیام کے عین تیسرے روز بتاریخ 13 جولائی 2013 کی شام پانچ بجے روزے کی حالت میں دفعتاً اپنے چاہنے والوں کو داغ مفارقت دے گئے۔ مگر وہ اخلاق، ادبی اور اسپورٹس کی سرگرمیوں کے باعث مانند تثلیث بیک وقت الہ آباد، کانکی نارہ اور علی گڑھ؛ میں مقبول تھے۔ نتیجتاً ان کی یادیں لوگوں کے دلوں میں ہنوز تازہ ہیں۔ خواجہ جاوید کہتے ہیں۔

رہتی ہے خبر سارے زمانے کی ہمیں بھی
پھیلا ہے بہت دور تک جال ہمارا
ممکن ہے کہ بن جائیں شہنشاہ غزل ہم
ویسے تو ارادہ نہیں فی الحال ہمارا

خواجہ جاوید کی تخلیقات برصغیر کے چھوٹے بڑے معیاری رسائل میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں وہ نیشنل اور انٹرنیشنل مشاعروں میں شرکت بھی کرتے تھے۔ ان کا پہلا مشاعرہ 1986 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یوم جمہوریہ کا مشاعرہ تھا۔ قابل ذکر بات ہے کہ 2010 میں غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام دہلی میں منعقد عالمی مشاعرے میں بحیثیت شاعر خواجہ جاوید کی بھی شرکت ہوئی تھی۔

ان کی شاعری بیک وقت ادب اور مشاعرہ دونوں جگہ مشترکہ تھی مگر انھوں نے معیار شاعری سے کبھی سودا یا کھلواڑ نہیں کیا۔ مشاعروں میں بھی ادب پیش کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اپنی مترنم آواز میں غزل و گیت پڑھ کر ایک مدہوشی کا سماں باندھ دیتے تھے۔ ان کا ایک گیت جو بہت مقبول ہوا تھا، اس کے بول یہ ہیں۔

میری گوری تو ذرا سا میرا کہنا تو مان
کئی برسوں کے بعد تیرا آیا مہمان

ان کا آخری مشاعرہ کلکتہ (بیلگھریا) کا آل انڈیا مشاعرہ تھا جو 'روح ادب' کے مدیر اعلیٰ عبداللہ سنجر کی صدارت اور جاوید بھائی (مرحوم) کے اعزاز میں تھا۔ اس مشاعرے میں ان کے ساتھ بحیثیت شاعر ان کے برادر کبیر خواجہ احمد حسین، احمد منیر اور پروفیسر معید رشیدی بھی مدعو تھے۔ بقول خواجہ جاوید:

ہم اپنے وقت کے بالا بلند سورج تھے
غروب ہوگئے کس طرح درمیان سے ہم
سمجھ سکا نہ آج تک کہ کیا ہوں میں
ہوا کے دوش پہ جلتا ہوا دیا ہوں میں
کبھی جب ہاتھ میں ہم میر کا دیوان لیتے ہیں
تو پھر اوقات اپنی خود بخود پہچان لیتے ہیں

یہ غزل کے وہ اشعار ہیں جس سے خواجہ جاوید اختر کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی زبان و بیان میں سادگی و سلاست ہے۔ موضوع زبان وبیان، ایجاز واختصار، کثرت وعلامات، تشبیہات واستعارات کے ذریعے خواجہ جاوید اختر نے اپنی شاعری کو خوب نکھارا ہے۔ کل 113 غزلوں پہ مشتمل ان کی اکلوتی تصنیف 'نیند شرط نہیں' پڑھنے کے بعد میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اچھی شاعری کے ان میں کافی روشن امکانات تھے لیکن وقت نے انھیں ہم سے چھین لیا۔

خواجہ جاوید اختر کو شعر وادب کے کسی مخصوص خانے میں مقید کرنا مناسب نہیں۔ لیکن ذیل کے اس شعر کے حوالے سے موصوف خود ہی اپنی شناخت جدید شعرا کی فہرست میں کروانے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ ان مصرعوں میں ذرا سا تعلّی کا رنگ بھی ابھر کر سامنے آرہا ہے۔

فاروقی کو دیکھو تو علم کا ایک سمندر ہے
عادل اور علوی کے بعد خواجہ جاوید اختر ہے
چل کے ذرا دیکھیں تو کیا ہے آخر اس منظر کے پیچھے
نئی نسل کے سارے شاعر ہیں جاوید اختر کے پیچھے

خواجہ جاوید کی کم عمری میں اچانک رحلت سے ادبی دنیا نڈھال ہوئی۔ مرحوم کی شعری وادبی خدمات نیز فن و شخصیت کے مدنظر ڈاکٹر نعیم انیس (صدر شعبہ اردو، کلکتہ مسلم گرلز کالج) نے ان کے فن و شخصیت پر ایک ضخیم کتاب 'خواجہ جاوید اختر: خواب اور خواب گر' مرتب کی ہے نیز اپنی ادارت میں دی مسلم انسٹیٹیوٹ کا ترجمان جریدہ 'پرواز' کے 12 ویں شمارے کو خصوصی طور پر خواجہ جاوید اختر سے منسوب کیا۔ مزید ڈاکٹر خورشید اقبال نے اولین آن لائن اردو میگزین 'کائنات' میں خواجہ جاوید اختر پر ایک ڈیجیٹل گوشہ شامل شمارہ کیا تھا۔ الہ آباد کے صحافی و شاعر بشارت خان عاقل نے اپنے ہندی ماہنامہ رسالہ 'پروانچل چھنک' کے اگست 2013 کے خصوصی شمارے کو مرحوم خواجہ جاوید کے نام "آہ! میرا بھائی: خواجہ جاوید اختر" کے عنوان سے منسوب کیا۔ خواجہ جاوید کہتے ہیں۔

جانے کب آکے وہ دروازے پہ دستک دے دے
زندگی موت کی آہٹ سے ڈری رہتی ہے
جو فرصت ہو تو ہم سے بھی ملا کر دیکھ لے نظریں
تری آنکھیں چرالیں گے تجھے حیران کردیں گے

امید قوی ہے کہ خواجہ جاوید اختر کا انتخاب لفظیات، فکریات اور ادبی وشعری تخیل ناقدان ادب کو ضرور متوجہ کریں گے نیز موصوف کی تخلیقات اور ان کے فن پارے کو اہل نظر، اہل سخن اور اہل علم وادب اپنی تنقید وتحقیق کا موضوع بنائیں گے۔

■

Shahid Ali
H.No.: 387/1/203, West Purwasa, Sthirpara Road
Near Poorbasha Masjid E Bilal
Po.: Kankinara
Distt.: North 24, Parganas- 743126 (W.B)
Mob.:8820239345

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

آؤ سائنسی خط پڑھیں!

مصنف: عبدالودود انصاری

صفحات: 101، قیمت: 75 روپے، سنہ اشاعت:

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: سمیہ محمدی، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

قومی اردو کونسل سے شائع شدہ کتاب 'آؤ سائنسی خط پڑھیں!' اس لحاظ سے اہم اور نئی ہے کہ اس میں خط کو ایک نئے زاویے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گویا خطوط کا یہ مجموعہ روایتی خطوط سے مختلف اور الگ ہے۔ یہ ادب اطفال میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کتاب کے مصنف عبدالودود انصاری ہیں۔ عبدالودود انصاری کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں بچوں کے حوالے سے کئی اہم کتابیں شامل ہیں۔ آپ گورنمنٹ پرائمری ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (بنگال) کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ آپ کو بچوں کی نفسیات پر کافی گرفت ہے، اور یہ چیز ان کی کتابوں میں بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔

عبدالودود انصاری نے 'آؤ سائنسی خط پڑھیں!' کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں 12 خطوط شامل ہیں۔ پہلا خط 'مسلمان بادشاہوں کی سائنسی خدمات' کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔ یہ خط کے اسلوب میں لکھا گیا ایک ایسا مضمون ہے جس میں مسلم بادشاہوں کی سائنسی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔ خلیفہ مامون رشید کے متعلق ایک نہایت مختصر سا اقتباس دیکھیے:

''خلیفہ مامون رشید نے 833ء میں بیت الحکمت Science Academy/ Institute of science نامی ایک بہت بڑی سائنسی تجربہ گاہ قائم کی تھی، جس کے اندر سائنسی تجربات کیے جاتے تھے۔'' (ص2)

عبدالودود انصاری نے گفتگو کے انداز میں مسلم بادشاہوں اور خلفا کی خدمات کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ انھوں نے مغل بادشاہوں کی ذہانت اور دانشوری کے ساتھ سائنسی میدان میں ان کی خدمات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ مغل عہد کے ایک اہم بادشاہ جہانگیر کے عہد میں بھی سائنسی کارنامے ہوئے۔ خود جہانگیر اچھی تعلیم اور عمدہ فوجی تربیت کے ساتھ ماہر طیور یعنی پرندوں کے حوالے سے کافی علم رکھتے تھے۔ عبدالودود انصاری نے لکھا ہے کہ جہانگیر پہلے سائنس داں ہیں جنھوں نے ہاتھی کی مدت حمل کے بارے میں درست جانکاری فراہم کرتے ہوئے بتایا کہ ہاتھی کی مدت حمل 18 سے 19 مہینے ہوتی ہے۔ یہی نہیں جہانگیر نے فلوریکن، ڈیپر، پول کارٹ اور بندر وغیرہ کے بارے میں کئی نئی اور اہم باتیں بتائیں۔ اس کے علاوہ جہانگیر علم نباتات سے بھی واقف تھے۔ عبدالودود انصاری نے جہانگیر کے بارے میں کئی نئے انکشافات کیے ہیں۔

عبدالودود انصاری نے نوبل انعام یافتہ مسلم سائنس دانوں کے حوالے سے ایک خط شامل کتاب کیا ہے۔ کتاب میں شامل ایک خط 'ریاضی کے اقوال' ہے۔ اس خط میں علم ریاضی کے حوالے سے دنیا کے اہم ترین لوگوں کے اقوال درج ہیں۔ ان اقوال کی روشنی میں ہم علم ریاضی کی تعریف اور اس کے دائرہ کار کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں، یہی نہیں چونکہ یہ کتاب بچوں کی ذہنی ساخت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تیار کی گئی ہے لہٰذا ان اقوال سے وہ ریاضی کی طرف راغب بھی ہوں گے۔ اس کے علاوہ سائنس کلب، سائنسی میلہ، کنوئیں کے پانی کا ٹھنڈا اور گرم رہنا، بلند ترین آواز کا کیڑا، وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت خطوط شامل کیے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں بچوں کے اندر سائنسی دلچسپی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی شعور پیدا کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر 'بادل اور بارش' میں جہاں بادل کیسے بنتے ہیں اور بارش کیسے ہوتی ہے کو نثری انداز میں پیش کرنے کے ساتھ انھوں نے راشد انور راشد کی نظم بھی پیش کی ہے جس میں بارش کے مختلف نام اور بارش ہونے کے اسباب کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح روٹی کیسے پکتی ہے، چاند کا گھٹنا بڑھنا اور خون کیا ہے اس کے گروپ کے اور کام کیا ہوتے ہیں اس تعلق سے کافی اہم جانکاری فراہم کی ہے ساتھ ہی نظموں کے ٹکڑے بھی پیش کیے ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب کے دوسرے حصے کو پڑھتے ہوئے قاری کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ ادبی شعور بھی پختہ ہوگا۔

ہم اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ بچوں کے لیے کتاب لکھنا مشکل کام ہے اور پھر کتاب سائنس سے متعلق ہو تو یہ اور بھی دشوار ہو جاتی ہے کیونکہ مصنف کو اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے کہ کتاب میں جانکاری کے ساتھ ساتھ ایسا اسلوب اور طریقہ کار اختیار کیا جائے کہ چھوٹی عمر کے طلبا اس میں دلچسپی بھی لیں اور کتاب میں فراہم کردہ مواد سے استفادہ بھی کرسکیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عبدالودود انصاری کی یہ کتاب 'آؤ سائنسی خط پڑھیں!' ادب اطفال میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ عبدالودود انصاری نے بچوں کے جذبات، احساسات اور ان کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے، زبان اور اسلوب میں سادگی ہے۔ مکتوب نگاری کے ساتھ ساتھ انھوں نے سائنسی نظموں کا انتخاب بھی کتاب میں شامل کیا ہے، چونکہ یہ تمام مضامین خطوط کی شکل میں ہیں اس لیے پڑھتے ہوئے کسی بوریت یا الجھاؤ کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ قاری ان کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی کتاب کے مصنف عبدالودود انصاری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تحقیق و تنقید

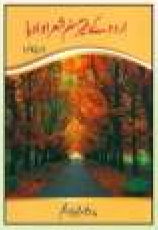

اردو کے غیر مسلم شعرا و ادبا

مصنف و ناشر: پروفیسر شہزاد انجم
صفحات: 456، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2021
مطبع: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: زاہد ندیم احسن، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو بہت سے مذاہب کی آماجگاہ ہے۔ یہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں ہندی اور اردو دو جدید اور اہم زبانیں ہیں۔ ہندی زبان کے ممتاز شاعر رام دھاری سنگھ دِنکر نے اپنی کتاب 'سنسکرت کے چار ادھیائے' میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلمان صدیوں سے ساتھ ساتھ رہتے آ رہے ہیں مگر ایک دوسرے کے بارے میں انھیں صحیح علم نہیں کے برابر ہے۔ تنگ نظری کے شکار لوگوں نے زبان کو بھی مذہب اور ملک سے جوڑ کر دیکھا ہے اور اس بنیاد پر تفریق کی کوشش بھی کی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بہت سے ادیبوں اور شعرا نے اس سوچ سے اوپر اٹھ کر اپنے خیالات و جذبات کی ترجمانی کے لیے اپنی من پسند زبان کا انتخاب کیا۔ ہندی زبان و ادب کے مشہور اور ممتاز ادیب ڈاکٹر رنجن زیدی نے اپنی ادارت میں ایک کتاب 'ہندی ادب میں مسلم ادیبوں کا کردار' شائع کی اور کتاب میں ایک مقدمہ 'صیاد مجھ سے مت چھین میری زبان' لکھ کر تنگ نظر قسم کے لوگوں کو جواب دیا ہے جو زبان کو بنیاد بنا کر لوگوں کو بانٹنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

مسلم خاندان میں پیدا ہوئے صوفیوں سے لیکر ملک محمد جائسی اور بلگرام کے مسلم ادیبوں میں شیخ شاہ محمد فارملی، میر جلیل سید مبارک، سید نظام الدین مگھنا تک، سید برکت اللہ پریمی، میر غلام نبی رسلین اور سید محمد عارف جان بلگرامی وغیرہ ہندی زبان کے مشہور شعرا تھے جنھوں نے ہندی ادب کی مسلسل خدمت کی۔ عبدالرحمن اور بابا فرید، امیر خسرو، عبدالرحیم خان خاناں، رَس کھان، سوزن، اور تاج جیسے سیکڑوں نام ہیں جن کی تخلیقات کو اگر ہندی ادب سے نکال دیا جائے تو ہندی ادب کی گویا روح ختم ہو جائے گی۔

اردو زبان سے متعلق اسی سلسلے کی ایک کڑی پروفیسر شہزاد انجم صاحب کی کتاب 'اردو کے غیر مسلم شعرا و ادبا' ہے۔ یہ کتاب غیر مسلم ادبا اور شعرا پر لکھے ہوئے اُن کے ادبی کالموں کا مجموعہ ہے جو اُردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے مالی تعاون سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔ اردو روزنامہ 'انقلاب' میں انھوں نے کالم کے طور پر 'پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے' کے عنوان سے تحریر کیا تھا۔

مذکورہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں غیر مسلم شعرا پر لکھے ہوئے مضامین کو رکھا گیا ہے جن میں، منشی ہر گوپال تفتہ، پنڈت دیا شنکر نسیم، منشی دوارکا پرساد افق لکھنوی، منشی نوبت رائے نظر لکھنوی، درگا سہائے سرور جہان آبادی، پنڈت برج نارائن چکبست، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، تلوک چند محروم، جگت موہن لال رواں، شام موہن لال جگر بریلوی، فراق گورکھپوری، بشیشور پرساد منور لکھنوی، گوپی ناتھ امن، پنڈت ہری چند اختر، پنڈت بال مکند عرش ملسیانی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر اوم پرکاش اگروال زار علامی، بھگوان چندر سحر عشق آبادی، گوپال داس نیرج، پنڈ آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، نریش کمار شاد، بلراج کومل، راج نرائن راز، ستیہ پال آنند، پی پی سری واستو رند، کرشن کمار طور، سمپورن سنگھ کالرا گلزار، کمار پاشی، اشوک ساحل ساحل، جمنا پرساد راہی، چندر بھان خیال، ش۔ ک۔ نظام، پرتپال سنگھ بیتاب، گور بخش سنگھ مخمور جالندھری، ڈاکٹر پریمی رومانی، عزیز پریہار، ونود کمار ترپاٹھی، آلوک یادو، وشال کھلر کے نام شامل ہیں۔

یہ تمام مضامین قابل قدر اور بصیرت افروز ہیں جن میں معروف غیر مسلم شعرا و ادبا پر بہت جامع اور مبسوط گفتگو کی گئی ہے۔ یہ تحریریں انتہائی سلیس اور رواں زبان میں لکھی گئی ہیں جس سے نہ صرف ہمارے علم و آگہی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اُن تمام شعرا و ادبا کی خصوصیات بھی واضح ہوتی ہیں جو اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں نثر نگاروں پر لکھے گئے مضامین شامل ہیں، جن میں ماسٹر رام چندر، منشی نول کشور، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، پریم چند، دیا نارائن نگم، مولوی مہیش پرشاد، پنڈت سدرشن، گوپال متل، مالک رام، دیوندر ناتھ ستیارتھی، پریم ناتھ پردیسی، کنہیا لال کپور، اپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، جمنا داس اختر، راج بہادر گوڑ، رام نارائن فکر تونسوی، بلونت سنگھ، رام لعل، کلدیپ نیر، پروفیسر گیان چند جین، کالی داس گپتا رضا، جگندر پال، ہرچرن چاولا، شام لال کالرا، عابد پیشاوری، رام پرکاش کپور، رتن سنگھ، دیویندر اسر، نند کشور وکرم، اوم پرکاش سونی، ڈاکٹر حکم چند نیر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، بلراج مین را، ڈاکٹر برج پریمی، کرشن لال نارنگ ساقی، ڈاکٹر کیول دھیر، بلراج بخشی، راجیو پرکاش ساحر، ڈاکٹر اجے مالوی اور ڈاکٹر نجے کمار جیسی معروف اور مشہور شخصیات پر جامع تحریریں موجود ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ زبان ہمیشہ اپنے تمام لوازمات میں اپنی روایت، تہذیب اور ثقافت سے ناگزیر طور پر جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں ان مضامین کی یہ خوبی ہے کہ ان کو مضمون نگار نے اس طرح سے اپنے مزاج کے مخصوص قالب میں تشکیل دے کر پیش کیا ہے کہ وہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ اس گوشے کے تمام مضامین خوبصورت پیرائے میں لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ممتاز ادیب پروفیسر عتیق اللہ صاحب کی ایک تقریظ ''اختصار پسندی اور اس کا لائحۂ عمل'' کے عنوان سے ہے جس میں انھوں نے کتاب کی اہمیت و افادیت اور صاحب کتاب کی خوبیوں پر جامع اور مبسوط انداز میں گفتگو کی ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''شہزاد انجم نے بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ اگر شوق، لگن، جنون نہ ہو تو تنقید ہو کہ تحقیق کسی شعبۂ کار سے ذہنی مواقفت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ لطف حاصل ہو سکتا ہے اور نہ اگلے اقدامات کے لیے جستجوؤں کو تحریک ملتی ہے۔ شہزاد انجم کی جستجوؤں کو برقرار رکھنے میں ان کی دیوانگی نے مہمیز کا کام کیا۔ ویسے بھی شہزاد انجم کے مزاج میں ٹھہراؤ اور استقلال ہے۔ انھیں جذبات کے وفور کو قابو میں رکھنے کا ہنر آتا ہے۔ بات سے بات نکالتے ہیں نہ تکرار انھیں خوش آتی ہے۔ مختصر کاری میں ان چیزوں کی خاص اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے کالم کا جو فریم بنایا ہے وہ بے حد چست اور جامع ہے۔ ہر کالم سوانح، تصانیف اور محاکے پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر چیز اپنے مقام پر نظر آتی ہے۔''

مذکورہ تقریظ کے علاوہ 'اردو زبان و ادب کے محسن اور شیدائی' کے عنوان سے عہد حاضر میں اردو زبان کی بے لوث خدمت کر رہی دو اہم شخصیات محترمہ کامنا پرساد اور جناب سنجیو صراف کے نام سپاس نامہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ آخر میں ضمیمے کے طور پروفیسر عبدالمنان طرزی کا منظوم تعارف: شہزاد انجم، روزنامہ انقلاب میں شائع شدہ کالم کی تفصیلات اور پروفیسر شہزاد انجم صاحب پر ڈاکٹر انوار الحق صاحب کا انگریزی میں لکھا ہوا ایک کالم شامل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب شہزاد انجم صاحب کے بھرپور مقدمے کے مطالعے سے قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ انھیں گنگا جمنی تہذیبی روایت کا بڑا پاس ہے اور وہ اس کا بہت

احترام کرتے ہیں۔ ساتھ ہی عہد حاضر کے تقاضوں اور مسائل کو بھی وہ نظر انداز نہیں کرتے، بلکہ بہت باریک بینی سے ان پر نظر رکھتے ہوئے اُن کا اظہار کرتے ہیں۔ عام قارئین کے ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے کا ذوق رکھنے والوں نیز تحقیق کے طالب علموں کے لیے بھی یہ کتاب بطور خاص کارآمد ہے۔ اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے یہ بے حد اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ اس میں اردو ادب کے تمام بڑے اور معروف شعرا و ادبا کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے ساتھ تہذیبی اور ثقافتی برتاؤ کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب محبان اردو اور باذوق لوگوں کے لیے مواد کے اعتبار سے نہایت مفید اور نفع بخش ہے نیز اس کی زمانی و مکانی دونوں حیثیتیں بھی مسلم ہیں۔

فکشن سے پرے

مصنف و ناشر :ڈاکٹر ہمایوں اشرف
صفحات: 451، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2021
مطبع : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی6
مبصر: ڈاکٹر سرور حسین، 307، شاہد ادریس انکلیو
مدرسہ روڈ، بھن پورا، پٹنہ۔ 800014 (بہار)

ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا زیرِ نظر مجموعہ مضامین فکشن سے پرے، غیر افسانوی نثر مثلاً مضمون نگاری، خطوط نویسی، خود نوشت سوانح نگاری، خاکہ نگاری، سفر نامہ نگاری، انشائیہ نگاری، طنز و مزاح نگاری اور تنقید نگاری جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اگرچہ طنز و مزاح نگاری اور تنقید نگاری کو ہم افسانوی یا غیر افسانوی نثر کے زمرے میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ طنز و مزاح نگاری محض وہ اسلوب ہے جس سے افسانوی، غیر افسانوی اور شاعری ہر طرح کی اصناف میں کام لیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے تو اسے افسانوی، غیر افسانوی یا شاعری کی حدود سے باہر رکھنا ہی مناسب ہے کیونکہ کوئی بھی تخلیق خواہ وہ افسانوی ہو یا غیر افسانوی یا شعری، تنقیدی شعور و بصیرت کے بغیر نہ تو مستند سمجھی جا سکتی ہے اور نہ معیاری۔ یعنی تنقید وہ پیمانہ ہے جس سے کسی بھی صنف کے فن پاروں کی اہمیت و معنویت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ تنقید کی کسوٹی پر محض افسانوی ہی نہیں، شاعری اور غیر افسانوی نثر کو بھی پرکھا جاتا ہے۔ یعنی تنقید تخلیق کا وہ عنصر ہے جو ہر تخلیقی عمل کے لیے جزوِ خاص کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں اس کتاب کے مصنف کو اس مسئلے پر غور کرنے کا شاید زیادہ موقعہ نہ رہا ہو۔ تاہم زیرِ نظر مجموعہ کے خالق ڈاکٹر ہمایوں اشرف ان تمام نثری اصناف یا موضوعات کو دائرۂ ادب سے نہ تو باہر رکھنے سے اتفاق رکھتے ہیں اور نہ ہی اسے کمتر درجہ کی چیز سمجھے جانے کے حامی ہیں۔ اس سلسلے میں کتاب کی ابتدا میں 'پیش رس' کے عنوان سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ:

''ہم سب شاعری کی بات کرتے ہیں تو غزل پر رک جاتے ہیں اور اسی طرح نثر پر بات کرتے ہیں تو فکشن پر ہماری نظریں جم جاتی ہیں۔ جب کہ ہمارے یہاں غیر افسانوی نثر میں بھی علم کا ذخیرہ وقیع اور تشفی بخش ہے۔ اس خام خیالی کو فراموش کرنے کی ضرورت ہے کہ مضمون، سفر نامہ، دیباچہ، سوانح، آپ بیتی یا خود نوشت سوانح، انشائیہ، خاکہ، مقالہ، روزنامچہ اور رپورتاژ جیسی اصناف کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ان میں بھی تخلیقیت کی بھرپور توانائیاں ملتی ہیں اور یہ اپنے عہد کی تہذیب و ثقافت کی عکاس ہیں۔''

کل پچیس مضامین پر مشتمل اس مجموعہ میں مذکورہ بالا موضوعات کے حوالے سے کئی مضامین موجود ہیں۔ ان میں خطوط نگاری کی اہمیت و معنویت اور اس کے ارتقائی سفر کے حوالے سے بھی روشنی ڈالی گئی ہے تو سفر نامے کی ادبی اور تاریخی اہمیت کے حوالے سے مصنف نے انیسویں صدی میں لکھے گئے سفر ناموں کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ یہ سفر نامے اُس عہد کے ہندوستان اور بیرونی دنیا کی تہذیب و ثقافت سے ہماری واقفیت کا مستند وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔ اردو میں مردوں کے علاوہ خواتین بھی اپنے سفر کے احوال و واقعات تحریر کرتی رہی ہیں۔ اس موضوع پر ڈاکٹر ہمایوں اشرف 'اردو کی خواتین سفر نامہ نگار: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' کے عنوان سے اپنے مضمون میں اردو کی اہم خواتین سفر نامہ نگاروں کے تحریر کردہ سفر ناموں کے اختصاص کا جائزہ لیتے ہوئے جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یقیناً اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں موصوف رقمطراز ہیں کہ:

''اردو میں خواتین سفر نامہ نگاری کی مذکورہ روایت سے یہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ مردوں کی طرح خواتین کے یہاں بھی زندگی کی جلوہ سامانیوں کی بوقلمونی اور نیرنگی کا احساس اپنی تمام تر شدت اور بے باکی کے ساتھ جہاں نمایاں نظر آتا ہے وہاں جنسی تفریق اور نابرابری کا احساس بھی لہریں لیتا نظر آتا ہے۔ ان خواتین سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں میں ان کی فطری نسائیت کی جلوہ سامانی ملتی ہے۔ ان کی پسند اور ناپسند اسی نسوانیت کے تابع ہے۔'' (فکشن سے پرے، ص 64-65)

فاضل مصنف کا خیال ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر میں الیاس احمد گدی نے اپنا سابق مشرقی پاکستان کا جو سفر نامہ 'لکشمن ریکھا کے پار' کے عنوان سے قلمبند کیا ہے وہ اردو سفر ناموں کے سرمائے میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمایوں اشرف 'لکشمن ریکھا کے پار' کو محض سفر نامہ نہیں، ایک تہذیب کا کرب، ایک عہد کا المیہ، اور ایک تاریخ کی کشمکش کی داستان بھی قرار دیتے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعے میں شامل مضامین کے مطالعے سے ہم سرسید احمد خاں اور مولانا ابوالکلام جیسی شخصیتوں کی فکر و نظر ہی نہیں ان کی تاریخی اہمیت سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ 'سرسید احمد خاں کا فکری محور' اور 'قومی یکجہتی اور مولانا ابوالکلام آزاد' میں ہمایوں اشرف سرسید کو ملک کی ترقی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کا سب سے بڑا پیروکار بتاتے ہیں تو قومی یکجہتی کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کے دینی، سیاسی و سماجی افکار کے مطالعے اور تفہیم کی ضرورت پر بھی اصرار کرتے ہیں۔ اسی طرح منٹو کی خاکہ نگاری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے وہ منٹو کو ایک سچا، ایماندار اور بے درد واقعہ نگار اور حقیقت پسند خاکہ نگار ہی نہیں بلکہ انسانی اعمال کا ایک بڑا نباض بھی بتاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کوشش میں اس کے خاکے کے پس منظر سے ابھرتے ہوئے رنگوں میں خود اس کی اپنی شخصیت کا رنگ بھی جلوہ گر نظر آتا ہے۔ بلکہ ان کا خیال ہے کہ خاکہ نگاری کے علاوہ منٹو اپنے مضامین میں بھی اپنے افسانوں کی طرح ہی بے باک اور جرأت مند دکھائی دیتا ہے۔

اردو میں انشائیہ نگاری کی تفہیم عام طور پر ایک پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ بعض قارئین طنز و مزاح کو بھی نادانستگی میں انشائیہ کے زمرے میں شامل کر لینے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ اگرچہ اس موضوع پر اپنے ایک مضمون میں ہمایوں اشرف نے بہار میں انشائیہ نگاری کی روایت اور سمت و رفتار کے تعلق سے کارآمد اور معلوماتی گفتگو پیش کی ہے لیکن ان سے انشائیہ اور طنز و مزاح کے فنی اختصاص پر کوئی واضح روشنی نہیں پڑتی۔ جب کہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ہمایوں اشرف کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی شخصیتوں کے فن پاروں پر قلم اٹھانا ضروری سمجھتے ہیں جنھیں دوسروں نے قصداً یا غیر دانستہ طور پر نظر انداز کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معروف انشائیہ نگاروں کے علاوہ انھوں نے خورشید جہاں اور متین عمادی جیسے انشائیہ نگاروں کی خدمات پر بھی قلم اُٹھایا

ہے جن پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے۔

بہار میں اردو خودنوشت نگاری کی روایت اور ارتقا کا مطالعہ بھی طلبا اور خصوصاً تحقیقی کاموں میں سرگرم اسکالرز کے لیے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ غالباً اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے موصوف نے اس موضوع پر بھی سنجیدہ نظر ڈالی ہے۔ان کا خیال ہے کہ بہار میں اردو خودنوشت نگاری کا باقاعدہ آغاز 1887 میں ہوا اور آج تک جاری ہے۔اس دوران بہار میں بہت سی اچھی اور اہم خودنوشتیں لکھی گئیں اور مقبول بھی ہوئیں۔ موصوف کئی خودنوشتوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں شوق نیموی کی 'یادگار وطن'، ش۔مظفر پوری کی 'رقص بسمل'، کلیم عاجز کی 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'، اویس احمد دوراں کی 'میری کہانی'، قمر اعظم ہاشمی کی 'سرسری اس جہاں سے گزرے'، کلیم احمد کی 'اپنی تلاش میں'، شاہ عمیر کی 'تلاش منزل'، اقبال حسین کی 'داستان میری' اور شکیل الرحمٰن کی لکھی ہوئی خودنوشت سوانح 'آشرم' کو انھوں نے قابل ذکر خودنوشتوں میں شمار کیا ہے۔ وہ بہار کے علاوہ ملک میں لکھی گئی دیگر آپ بیتیوں کو بھی نظر میں رکھتے ہوئے اخترالایمان کی خودنوشت 'اس آباد خرابے میں' کو ان کی نثر کا عمدہ نمونہ بتاتے ہیں۔

نثری اصناف میں طنز و مزاح مقبول اسلوب ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔طنز و مزاح کے حوالے سے اس مجموعہ میں دو مضامین شامل ہیں۔ 'پطرس بخاری کی مزاح نگاری' اور 'آسمان ظرافت کا درخشندہ ستارہ: انجم مانپوری'۔ ان مضامین میں مصنف کا مطالعہ سنجیدگی کا حامل ہے۔ان کا خیال ہے کہ پطرس نے بہت کم لکھ کر جو شہرت حاصل کی وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔فن طنز و مزاح میں انجم مانپوری کے فن کے حوالے سے زیر نظر مضمون کا مصنف جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ غور طلب بھی ہے اور نکتہ رس بھی۔ لکھتے ہیں:

''انجم مانپوری اگرچہ دنیائے ادب میں اتنی شہرت حاصل نہ کر سکے جتنی شہرت کے وہ مستحق تھے مگر اس کے باوجود ان کی فنکارانہ عظمت اور پُرشکوہ انفرادیت ناقابل فراموش ہے۔وہ ایک ایسے طنز و مزاح نگار ہیں جو اردو طنزیہ و مزاحیہ ادب کی پہلی صف کے فنکاروں میں شامل کیے جانے کا پورا حق رکھتے ہیں۔'' (ایضاً،ص 168)

نثری اصناف کے مطالعے کے دوران ہمایوں اشرف جب اس دشت ذخار سے گزرتے ہیں تو یہاں ان کی نظر کئی ایسی شخصیتوں پر پڑتی ہے جن سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ان ہی میں کلیم عاجز اور ڈاکٹر سیّد احمد کی ذات گرامی بھی ہے جن کی تخلیق کردہ نثر کے ان نمونوں سے بھی وہ آگاہ ہوتے ہیں جن میں انھیں فکر کی رعنائیاں بھی بکھری پڑی ملتی ہیں اور سیاسی شعور اور ادبی بصیرت کے چراغ بھی ضوفشاں نظر آتے ہیں۔

تنقید نگاری ہمایوں اشرف کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔اس صنف کے حوالے سے انھوں نے سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، ظہیر غازی پوری اور گوپی چند نارنگ کی تنقید نگاری کو موضوع سخن بنایا ہے۔ سجاد ظہیر کی تنقیدی نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے موصوف انھیں ترقی پسند تحریک کے اوّلین معماروں میں شمار کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ سجاد ظہیر اگرچہ مارکسی اور اشتراکی اصول کے علمبردار تھے لیکن انھوں نے اردو میں ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تحریک سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا اور اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ادب و تنقید کی بہتر صورت کی نشاندہی کی۔ ہمایوں اشرف مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری کو بھی ترقی پسند ادب اور مارکسی تنقید کا ایک بہتر اور متوازن نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ظہیر غازیپوری کے تنقیدی روّیے کے حوالے سے ہمایوں اشرف کا نظریہ اعتدال پسندی پر دال ہے۔ان کا خیال ہے کہ ظہیر کے بعض امور سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے تنقیدی شعور اور آگہی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم 'حالی کے بعد تھیوری کا ایک نیا موڑ: گوپی چند نارنگ' کے عنوان سے اپنے مضمون میں وہ نارنگ کی کھل کر تعریف کرتے ہیں۔ وہ انھیں اردو کا مقبول ترین ناقد اور دانشور کے علاوہ تحقیق و تنقید، لسانیات، درس و تدریس، نظری مباحث اور نظریہ سازی میں امتیاز کا حامل بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف نارنگ کی کتاب 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' کو اس کے مواد کے اعتبار سے خاصی اہم سمجھتے ہیں۔

بہر کیف زیرِ نظر مجموعہ میں شامل تمام مضامین اپنے موضوع و مواد کے اعتبار سے قابل قدر اور اہم ہیں جن سے نہ صرف غیر افسانوی نثر کی اہمیت روشن ہوتی ہے بلکہ یہ نئے امکانات کے در بھی کھولتے ہیں۔بعض مضامین کے حوالے سے اگر موصوف نے تنقیدی تقاضوں کا خیال رکھا ہوتا تو یہ مجموعہ خاصا وقیع ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اپنے موضوعات اور اپنی معلوماتی نوعیت کے اعتبار سے یہ کتاب اردو کے طلبا کے علاوہ عام قاری کے لیے بھی نہایت مفید مطلب ثابت ہوگی۔

اردو میں دلت افسانہ 1980 کے بعد

مصنف: احمد صغیر

صفحات: 632، قیمت: 700 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ابوحذیفہ، شعبۂ اردو، مرزا غالب کالج، گیا، بہار

دور حاضر میں دلت ادب کو اکٹھا کرنے، اس کو پروان چڑھانے اور اسے تحریک کی شکل دینے کا رجحان بھی تیزی سے زور پکڑتا جا رہا ہے۔دلت ادب سے متعلق قدیم و جدید فن پارے اکٹھا کیے جا رہے ہیں، کتابیں ترتیب دی جا رہی ہیں۔ تبصرہ، تجزیہ اور تنقید کا کام شروع ہو چکا ہے۔احمد صغیر کی کتاب 'اردو میں دلت افسانہ 1980 کے بعد' اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ مقدمہ میں مسلم و غیر مسلم ادیب کے ذریعہ لکھے گئے دلت افسانوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔جس میں پریم چند سے راجی سیٹھ اور اعظم کریوی سے احمد صغیر تک کے فن پاروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔مزید یہ کہ مسلم پسماندہ طبقوں پر لکھے گئے افسانے اسی فہرست میں شامل کیے گئے ہیں جس میں حیات اللہ انصاری کا 'ڈھائی سیر آٹا' سے شوبی زہرا نقوی کا افسانہ 'طشتری' شامل ہے۔ یہ کتاب 1980 کے بعد کے چندہ 42/افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا پہلا افسانہ اقبال مجید کا 'آگ کے پاس بیٹھی عورت' اور آخری افسانہ شوبی زہرہ نقوی کا 'طشتری' بھی ہے۔اس کے بعد تقریباً 113/ صفحات میں ان تمام افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اخیر میں 160/افسانوں پر مشتمل دلت افسانوں کی ایک لمبی فہرست پیش کی ہے جس میں پریم چند کے 'کفن' سے احمد صغیر کا افسانہ 'برہنہ وجود' شامل ہے۔ 632 صفحات پر مشتمل اس قبیل کی یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔ اردو ادب میں دلت افسانہ نگاری کے میدان میں احمد صغیر کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔

اردو ادب میں دلت ادب سے متعلق منظر عام پر آئی متعدد کتابوں میں یہ کتاب اس لیے نمایاں ہے کہ اس میں 1980 کے بعد سے عصر حاضر تک کے نمائندہ افسانوں کو مع تجزیہ ایک جگہ یکجا کر دیا گیا ہے۔اردو میں دلت افسانوں کے انتخاب و ترتیب میں اب تک جو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں ان میں 'منتخب دلت کہانیاں' انتخاب و ترتیب رمنیکا گپتا، مترجم ف۔س۔اعجاز، یہ انتخاب مختلف زبانوں میں لکھی گئی کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں کل 48/کہانیاں ہیں۔ حیرت ہے کہ اس انتخاب میں اردو زبان میں دلت موضوع پر لکھے کسی افسانہ کو شامل نہیں کیا گیا ہے جبکہ 'منتخب دلت افسانے' جسے متھن کمار نے ترتیب دیا ہے یہ خالص اردو میں لکھی 38/دلت کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس قبیل کی

تیسری کتاب 'دلت ڈسکورس اور احمد صغیر کے دلت افسانے' جسے 'اماچی' نے ترتیب دیا، اس میں احمد صغیر کے 15/افسانے مع تجزیہ پیش کیے گئے ہیں۔ چوتھی کتاب 'دلت ادب: نظریہ و رجحان' انتخاب و ترتیب ڈاکٹر اعظم انصاری۔ پانچویں ڈاکٹر نزہت پروین کی 'اردو افسانے میں دلت مسائل' جس میں 45/قدیم و جدید افسانے مع تجزیہ شامل ہیں۔

یہ موضوع اردو کے لیے نیا نہیں ہے بلکہ اردو ادب میں افسانے کی ابتدا سے ہی دلت افسانے وجود میں آ چکے تھے۔ ترقی پسند ادیبوں نے اس موضوع پر خوب لکھا اور سماجی نابرابری کے خلاف صف بستہ ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے 'بلکو، مادھو، گھیسو، کالو بھنگی' جیسے کئی کردار سامنے آ گئے۔ یہ معاملہ صرف افسانوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ناول میں بھی یہ کردار اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ یہ بات برحق ہے کہ عہد قدیم میں ان کا شمار غریب، مزدور اور ستائے ہوئے کرداروں کی فہرست میں ہوتا تھا مگر عصر حاضر میں ان کا شمار ایک خاص قسم کے ادب میں بھی کیا جانے لگا ہے۔ رفتہ رفتہ ادب کی پرتیں کھولی جا رہی ہیں اور فکشن کے ساتھ کرداروں کا بھی ادبی بٹوارہ کیا جا رہا ہے۔ اب باقاعدہ ایک نظام کے تحت افسانے کو اس کے کردار کی نسبت سے دلت وغیر دلت افسانہ میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ فکشن کی دنیا میں اس ادب سے متعلق مختلف نظریے پیش کیے جا رہے ہیں۔ مشہور دلت ادیب کنول بھارتی کا ماننا ہے کہ ایک دلت ہی دلت فکشن کی صحیح روپ ریکھا تیار کر سکتا ہے۔ بعض کا ماننا ہے کہ 'دلت ادب' کا کوئی تصور ہی نہیں بس ادب کو ذاتوں میں بانٹنے کی ایک گھٹیا کوشش ہے۔ اس ضمن میں ایم، این، وانکھیڑے کا 'دلت ادب، شعور، سمت اور اثرات: ایک مباحثہ' اور ابرار مجیب کا 'دلت اور مسلم ڈسکورس' اہم مضامین ہیں۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔ سب کی اپنی اپنی رائے ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

احمد صغیر نے اس کتاب کے ذریعہ یہ پیغام دینا چاہا ہے کہ آنے والے دنوں میں 'دلت ادب' کا مستقبل روشن ہے۔ اس کی جڑیں اسی منبع سے ملتی ہیں جہاں سے اردو فکشن کی ابتدا ہوتی ہے۔ اگر پریم چند اردو فکشن کے بابا ہیں تو دلت فکشن بھی انھیں کا وردان ہے۔ احمد صغیر اس بات کو بھلی بھانتی جانتے ہیں کہ عصر حاضر میں اس ادب کا مستقبل پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہے کیونکہ جو حالات اس طبقہ کے پریم چند کے دور میں تھے۔ آج بھی کم و بیش ویسے ہی ہیں۔ آج بھی اس طبقہ کی بڑی آبادی اسی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہے۔ احمد صغیر کی یہ کاوش آنے والے دنوں میں اردو میں دلت ادب کیلیے راہنمائی کا کام کرے گی۔ مستقبل میں دلت فکشن، دلت ادب کے کئی در وا ہونے کی امید ہے۔ غضنفر کا 'دویہ بانی' اور صغیر رحمانی کا ناول 'تخم خوں' بھی اردو میں دلت ادب کے اسی روشن مستقبل کا غماز ہے۔

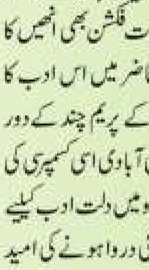

جہان ادب کے سیاح: ڈاکٹر امام اعظم

مصنف: پروفیسر (ڈاکٹر) خالد حسین خان

صفحات: 112، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2021

مبصر: حلیم صابر، 2، چھرو سنگھ لین، کولکاتا - 700011

ایسے شعرا و ادبا کی تعداد ہر عہد میں قابل لحاظ رہی ہے جو شعری اور نثری ادب تخلیق کرنے کے فرائض ادا کرتے ہیں اور ان کی تصنیفات منصۂ شہود پر آکر مقبولیت سے سرفراز ہوتی ہیں انھیں میں ایک نام مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ریجنل ڈائرکٹر، کولکاتا ڈاکٹر امام اعظم کا بھی ہے جن کی علمی، ادبی تصنیفات و تالیفات شعری و نثری کثیر تعداد میں شائع ہو کر ادبی خزانے میں اضافہ کر چکی ہیں۔ ان کی ادبی کاوشوں کو اجاگر کرنے اور ان کی تصنیفی اور تالیفی خدمات کی پذیرائی کی غرض سے بطور اعتراف زیر نظر کتاب 'جہانِ ادب کے سیاح: ڈاکٹر امام اعظم' پروفیسر (ڈاکٹر) خالد حسین خان نے تصنیف کی ہے۔ اس سے قبل بھی خالد حسین صاحب کی ڈیڑھ درجن سے زائد تصنیفات و تالیفات قدر شناسی کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی امام اعظم صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے زیر نظر کتاب قارئین ادب کے مطالعے سے گزر کر امام اعظم کی کارگزاریوں کو درجۂ اعتبار عطا کرتی ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر خالد حسین خاں نے امام اعظم کی ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہوئے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ ان کی کارکردگی کی پذیرائی میں نہ تو حد سے تجاوز کیا اور نہ ہی قناعت کی روش اختیار کی ہے۔ جس موضوع کے تعلق سے خالد حسین صاحب نے ڈاکٹر امام اعظم کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور متاثر ہوئے اسی نہج پر اپنی آرا کا اظہار تحقیقی و تنقیدی طور پر پیش کیا ہے جس کا اظہار ''پیش لفظ'' میں ڈاکٹر خالد حسین نے یوں کیا ہے:

''متاع قرطاس وقلم، ماہر نثر و نظم، ڈاکٹر امام اعظم کی سیرت، شخصیت، ذکر، فکر، فن اور کارناموں سے متعلق یہ تخلیق، صلہ و ستائش اور حسن طلب سے بے نیاز ہو کر سپرد قلم کی گئی ہے۔ اس کا مقصد و مدعا، ادبی ذوق کی تسکین، حق بہ حقدار کی تحسین اور اس کی آبیاری ہے۔'' (ص 5)

مشمولات میں جن عنوانات کے تحت اپنی آرا کا اظہار خالد حسین نے کیا ہے ان میں اول امام اعظم کو 'جہانِ ادب کا سیاح' قرار دیا ہے، جہانِ ادب کی رہ گزر بڑی سنگلاخ ہے جس پر پوری دل جمعی کے ساتھ امام اعظم ثابت قدم رہے جس کے سبب ان کی ثابت قدمی کے نقوش تحریری شکل میں منظر عام پر آ کر انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں خالد حسین خاں نے مغربی ادب و فلسفہ جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات اور رد ساختیات وغیرہ سے اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے امام اعظم کے جملہ اصناف ادب کی تائید کی ہے نیز ان کی گراں قدر ادبی خدمات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ مزید برآں نئی نسل کو بھی اردو ادب کی آبیاری کے لیے آمادہ کرنے کی ترغیب پر زور دیا ہے۔

'تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش' (مرتب: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی) کے حوالے سے ڈاکٹر خالد حسین خاں نے امام اعظم کی صحافتی خدمات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے جس جانفشانی سے بذریعہ تحریر اس کی تزئین کا فریضہ ادا کیا اور 'تمثیل نو' کو علاقائی سطح سے اوپر اردو کی عالمی بستیوں تک پہنچایا یہ واقعی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کی مرتبہ کتاب 'سہرے کی ادبی معنویت' پر ڈاکٹر خالد حسین خاں نے 25 صفحات پر نمونۂ کلام، مشاہیر ادب کی آرا کے ساتھ امام اعظم کو کامیاب قرار دیا ہے کہ سہرے کی ادبی معنویت کا تعین کرنے کا سہرا امام اعظم کے سر جاتا ہے۔ 'ڈاکٹر امام اعظم بحیثیت شاعر' پر بھی خالد حسین نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے شعری مجموعوں 'قربتوں کی دھوپ' اور 'نیلم کی آواز' نے قارئین ادب کو مطالعے کی چھاؤں عطا کی ہے اس پر بصیرت افروز تنقید اشعار کے حوالے سے پیش کر کے امام اعظم کو شاعری میں تغزل بداماں شعری روایت کا امین قرار دیا ہے۔

نوجوان ادیب و شاعر شاہد اقبال کی مرتبہ کتاب 'چٹھی آئی ہے' میں ڈاکٹر امام اعظم کے نام مشاہیر ادب مثلاً قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، مظہر امام، علقمہ شبلی، شارب ردولوی، ظہیر غازی پوری، طلحہ رضوی برق، منظر شہاب، حفیظ اللہ نیولپوری، کرامت علی کرامت، رؤف خیر، رفیق شاہین، مناظر عاشق ہرگانوی، نجم عثمانی، ف س اعجاز، منور رانا، جمال اویسی، دبیر احمد، عاصم شہنواز شبلی وغیرہ کے خطوط پر بھی ڈاکٹر خالد حسین خان نے 38 صفحات پر سیر حاصل رائے حوالہ کے ساتھ پیش کی ہے۔ اخیر میں ڈاکٹر خالد حسین خان نے 'دربھنگہ کا ادبی منظر نامہ: ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی و صحافتی

خدمات' (مصنف: ڈاکٹر سرور کریم) اور 'ڈاکٹر امام اعظم: اجمالی جائزہ' (مصنف: ڈاکٹر ایم صلاح الدین) پر مختصر مگر جامع اور معلومات افزا علمی و ادبی منظر نامہ از ماضی تا حال پیش کر کے زیر نظر کتاب 'جہانِ ادب کے سیاح: ڈاکٹر امام اعظم' کو اس لائق بنا دیا ہے جس کی حیثیت دستاویزی ہو گئی ہے۔

کتاب صوری اور معنوی اعتبار سے جاذبِ نظر ہے۔ کاغذ اور طباعت معیاری ہے۔ امید ہے کہ قارئینِ ادب کتاب سے لطف اندوز ہوں گے۔

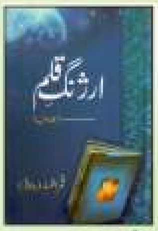

ارژنگ قلم (جلد اول و دوم)

مصنف: ریشا قمر

صفحات: 360 (جلد اوّل) 327 (جلد دوم)

قیمت: 500 روپے (جلد اوّل) 450 (جلد دوم)

ناشر: شعبہ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگی

مبصر: حافظ کرناٹکی، دارالحافظ، جے نگر 1 کراس، شکاری پور، شموگہ (کرناٹک)

گلبرگہ اردو کے ابتدائی گہواروں میں سے ایک ہے۔ اس گہوارے میں اتنی بڑی بڑی اور اہم شخصیتوں نے آنکھیں کھولیں اور ذہنی و فکری پرورش کے مرحلے طے کیے کہ محض ان کے نام شمار کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا۔ اسی گہوارے میں روشن فکر، ادیبہ ریشا قمر نے شعور کی آنکھیں کھولیں۔ جو لوگ ان کی ابتدائی تحریروں سے واقف ہیں وہ ضرور اس بات پر حیرت کریں گے کہ انھوں نے اتنی جلدی کس طرح اپنے قلم کی روانی کو تیز رفتار اور تحریر کی رنگینی و رعنائی کو طرح دار کر لیا۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے اپنی زبان پر بہت حد تک قدرت حاصل کر لی ہے اور طرزِ بیان میں ایک طرح کی خود اعتمادی اور پختہ کاری کا رمز پیدا کر لیا ہے۔ ان کی محنت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کی تیاری کے دوران ہی 'ارژنگ قلم' جیسی تاریخ ساز کتاب کی اشاعت کا اہتمام کر لیا۔ 'ارژنگ قلم' دیکھ کر لگتا ہے کہ ریشا قمر کے بھی ایک دماغ میں اللہ نے دس دماغ رکھ دیے ہیں۔ اس لیے اس نے تحقیق کی پر خار وادی میں بھی اپنی انفرادیت کا ثبوت ابھی سے پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔

'ارژنگ قلم' کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ریشا قمر نہ صرف یہ کہ اردو کے قدیم و جدید ادب سے واقف ہیں بلکہ وہ جدیدیت، مابعد جدیدیت، اور تانیثیت کے فلسفے کو بھی سمجھتی ہیں۔ شعور کی اسی بالغ نظری نے انھیں حیدرآباد کرناٹک کی خواتین لکھاریوں کے فن کو اور ان کی تحریر کے رمز کو سمجھنے میں، انھیں روشنی فراہم کی ہے اور انھوں نے اختصار کے ساتھ جو کچھ بھی لکھا ہے اس نے ان فنکاروں اور خواتین قلمکاروں کی کد و کاوش کو آئینہ کر دیا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

''علاقہ حیدرآباد کرناٹک کی خواتین قلم کاروں میں ایک ایسی فن کارہ بھی شامل ہیں جن کو اگر اس علاقے کے نسائی ادب کی 'ملکہ عالیہ' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، کیونکہ یہ شاہانہ جاہ و جلال اور شان و شوکت ان کے نام اور کام دونوں میں ہی شامل تھا وہ ادب کی ایک ایسی ملکہ رہی ہیں جو اپنے فن کے ذریعے اس خطے کی ادبی دنیا میں آن بان اور شان کے ساتھ گزشتہ چار دہائیوں سے لے کر ابھی عرصہ پہلے تک حکومت کرتی رہی۔ انھوں نے اپنے حسن سلوک و شائستہ مزاجی، خوش روئی و نرم گفتاری، شفقت و محبت اور ہمدردانہ سلوک سے ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ سرخ و سفید رنگت، پروقار چہرہ، مزاج میں بلا کی سادگی، خلوص و محبت کا پیکر اور ہمدردی و شفقت کا سمندر تھیں۔ اس علاقے میں اردو کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتیں۔ اسی لیے بنا کسی تعارف کے سمجھا جاتا ہے کہ اردو کی فلاح کا دوسرا نام تھیں پروفیسر لئیق اصلاح۔'' (ارژنگ قلم، ص 153)

''اردو زبان کی شیدائی، کرناٹک اردو اکادمی کی فعال چیئر پرسن، درس و تدریس کے پیشے کو حرزِ جان سمجھنے والی قابل استانی، خاکہ نگاری میں طنز و مزاح کی چاشنی، ہر دلعزیز و خوش مزاج شخصیت کی حامل کسی چہرے کی شبیہ بنائی جائے تو جو نام ذہن کے پردے میں ابھرتا ہے وہ صرف فوزیہ چودھری کا نام ہے۔ فوزیہ چودھری کی زندگی کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے جس چیز کو ہاتھ لگایا اسے درجہ کمال تک پہنچا دیا۔'' (ارژنگ قلم، ص 305)

آپ نے غور فرمایا کہ ریشا قمر نے کس خوب صورتی سے ان فن کاروں کی نگارشات کی نبض پکڑ لی ہے۔ ان کے اسلوب، موضوعات، طرزِ اظہار، فکر و نظر کو اپنے جادوئی قلم سے مصور کر دیا۔ وہ بھی اتنی رواں دواں اور ہموار و فصیح نثر میں کہ قرأت کا ذائقہ دوبالا ہو گیا اور ان کی تنقیدی بصیرت کے احساس کا قاری کے دلوں میں اجالا سا ہو گیا۔ ریشا قمر کا قلم ایسا ارژنگ ہے کہ وہ لفظوں میں فنکاروں اور ان کے فن کی خوبیوں کی تصویریں بناتا چلا جاتا ہے اور قاری اکتائے اور گھبرائے بغیر ان کی تحریروں کی چاشنی کے گھونٹ بھرتا ان کے ہمراہ ہو جاتا ہے۔

آج کا جو ادبی منظر نامہ ہے، بالخصوص کرناٹک کا ادبی منظر نامہ اس کی تابنا کی میں شائستہ یوسف، حلیمہ فردوس، فوزیہ چودھری وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ فوزیہ چودھری کو زیادہ مہلت نہیں ملی اس کے باوجود انھوں نے جو شہرت اور ناموری حاصل کی وہ لائق قدر ہے۔ شائستہ یوسف کی نظموں نے جس طرح نسائی حسیت کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے، اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ حلیمہ فردوس ایک ہمہ جہت قلم کار اور فنکار ہیں ان کی ناقدانہ حیثیت مسلم ہے تو بچوں کے ادب میں بھی ان کا مقام محفوظ ہے جبکہ وہ ریاست کی سب سے شگفتہ کار مزاح نگار بھی مانی جاتی ہیں۔ کوثر پروین اور بی بی رضا خاتون بھی اپنی شناخت کا احساس دلا چکی ہیں۔ ان لوگوں کے حوالے سے ریشا قمر نے جو رائیں پیش کی ہیں وہ بہت متوازن اور ان قابل قدر خاتون لکھاریوں کے شایانِ شان ہیں۔

'ارژنگ قلم' کی اہمیت محض اس لیے نہیں ہے کہ اس کتاب میں ریشا قمر نے حیدرآباد کرناٹک کی قابل ذکر اور مشہور خاتون قلمکاروں کی خدمات سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ بلکہ اس کتاب کی اہمیت کا راز دراصل اس بات میں مضمر ہے کہ ریشا قمر نے ان خاتون قلمکاروں کی ادبی خدمات سے بھی ہمیں واقف کرایا ہے جو کسی بھی وجہ سے شہرت حاصل نہیں کر سکیں۔ اگر وہ 'ارژنگ قلم' جیسی اہم کتاب پیش نہیں کرتیں تو ہمیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے آس پاس کتنی باصلاحیت اور گوہر بار قلمکار خاتون اپنی صلاحیتوں اور تخلیقی انفرادیتوں اور علمی قابلیتوں کے ساتھ گھریلو نظام کی سختیوں اور مرد اساس سماجی اور معاشرتی نظام کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔

ریشا قمر نے سچ مچ ایک اہم ذمہ داری ادا کی ہے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہم سبھی لوگوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

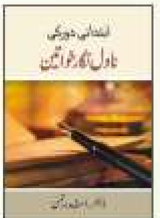

ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر راشدہ رحمٰن

صفحات: 334، قیمت: 202

مطبع: روشان پرنٹرس، دہلی 6

مبصر: ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، گیسٹ فیکلٹی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 25

زیر تبصرہ کتاب 'ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین' اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار

سے کافی دلچسپ اور تحقیقی نوعیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر راشدہ رحمٰن کی گرچہ یہ پہلی ادبی کاوش ہے لیکن اس سے پہلے ان کے کئی مضامین مختلف رسائل وجرائد کی زینت بن چکے ہیں۔ مصنفہ کی زبان کافی صاف، سلیس اور رواں ہے۔ پوری کتاب میں کہیں بھی پیچیدہ یا گنجلک جملے دکھائی نہیں دیتے۔

زیر تبصرہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جو بالترتیب (1) اردو ناول کی ابتدا (2) خواتین میں ناول نگاری کا رجحان (3) ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین کے سوانحی کوائف (4) ابتدائی دور کی خواتین کے ناولوں کا مطالعہ (5) ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین کے اثرات بعد کی ناول نگار خواتین پر ہیں۔ پہلے باب میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مختصر اور جامع انداز میں ناول کی ابتدا اور اس کے تاریخی، تہذیبی وادبی پس منظر سے بحث کی گئی ہے۔ بعدازیں ابتدائی دور کے مشہور ومقبول ناول نگاروں کے ناولوں پر اختصار کے ساتھ اظہار خیال بھی کیا گیا ہے۔ دوسرے باب کے تحت ہندوستان میں تعلیم نسواں کی صورت حال اور ناول نگار خواتین کا ادبی منظر نامے پر ظہور کیوں کر ممکن ہوا اس پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، ساتھ ہی ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری نے ابتدائی دور کی خواتین ناول نگاروں پر کیا اثرات مرتب کیے اس کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسرا باب اس اعتبار سے کافی اہم ہے کہ اس میں ابتدائی دور کی خواتین ناول نگاروں کے سوانحی کوائف کو کافی تلاش وجستجو کے بعد پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں جن خواتین ناول نگاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں رشیدۃ النساء، صغرا ہمایوں مرزا، جہاں آرا شاہنواز بیگم، عباسی بیگم، طیبہ بیگم، نذر سجاد حیدر شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنفہ نے مختلف کتب ورسائل کا سہارا لے کر ان کے سوانحی کوائف مرتب کیے ہیں، لیکن باوجود اس کے تشنگی کا احساس برقرار رہتا ہے۔ چوتھا باب کتاب کا نہایت اہم حصہ ہے۔ اس باب کے ذیل میں ابتدائی دور کی خواتین ناول نگاروں کے سترہ ناولوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جن میں اصلاح النسا، افسانۂ نادر جہاں، گوڈر کا لال، شریف بیٹی، مشیر نسواں، سرگزشت ہاجرہ، موہنی، حسن آرا بیگم، زہرہ بیگم، انوری بیگم، اختر النسا بیگم، حرماں نصیب، جاں باز، آہ مظلوماں، ثریا، نجمہ اور مذہب اور عشق شامل ہیں۔

کتاب کے آخری باب میں بعد کی ناول نگار خواتین کو ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین نے کس درجہ متاثر کیا اس کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں جن خواتین ناول نگاروں کو شامل کیا گیا ہے ان میں حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین اور قرۃ العین حیدر ہیں۔ ان خواتین ناول نگاروں پر ابتدائی دور کی خواتین ناول نگاروں کے اثرات تو ضرور مرتب ہوئے لیکن اس کے باوجود اپنے لیے انھوں نے نئی نئی راہیں تلاش کیں اور نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنے ناولوں پر اس کا اطلاق کیا۔ یہاں مزید گفتگو کرنے کے بجائے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ کے نوک قلم سے نکلی چند سطور درج کردی جائیں۔ مذکورہ خواتین ناول نگاروں کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر راشدہ رحمٰن مقدمہ میں لکھتی ہیں:

''... حجاب امتیاز علی نے خالص رومانی اسلوب اختیار کیا۔ عصمت چغتائی نے مغربی اتر پردیش کے متوسط گھرانے کے لڑکے اور لڑکیوں کے جنسی اور نفسیاتی مسائل کو پیش کرنے کے لیے فوٹوگرافی کی تکنیک اپنائی۔ صالحہ عابد حسین نے مشرق ومغرب کی مثبت قدروں کے حسین امتزاج پر معاشرے کا خواب دیکھا... قرۃ العین حیدر نے اردو فکشن کو ایک نہایت ہی وسیع وعریض دنیا کی سیر کرائی۔ موضوعاتی تنوع اور کثرت، تہذیبوں کا تصادم، فلسفۂ وقت، قوموں کا اجتماعی حافظہ، ماضی کی انسانی تہذیب، شعور کی رو، آزاد تلازمۂ خیال، فلیش بیک، ناسٹلجیا اور خود کلامی وغیرہ کتنے ہی نت نئے موضوعات واسالیب سے اردو فکشن کو ثروت مند کرنے میں قرۃ العین حیدر کو امتیازی مقام حاصل ہے۔'' (مقدمہ، ص 22-21)

زیر تبصرہ کتاب 'ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین' کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر راشدہ رحمٰن کی یہ کاوش تحقیقی وتنقیدی اعتبار سے لائق ستائش ہے۔ مشمولات کے پیش نظر اس کی بھی قوی امید ہے کہ ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے مذکورہ کتاب حوالہ جاتی حیثیت اختیار کرے گی۔

شاعری

اداس نظمیں

شاعر: پرویز مظفر

صفحات: 128، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: اکتوبر 2021

ناشر: مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، مظفر حنفی لین، بٹلہ ہاؤس، دہلی 25

مبصر: فصیح اللہ نقیب، نورنگر، اکوٹ فیل، اکولہ (مہاراشٹر)

پرویز مظفر کو شاعری وراثت میں ملی ہے۔ یوں کہیے کہ ان کے خون میں شامل ہے۔ عام طور پر برگد کے سایے میں پودے پنپ نہیں پاتے کہ انھیں زمانے کے سرد وگرم جھیلنے کا موقع نہیں ملتا۔ پرویز مظفر نے شروع میں تو اپنے جذبۂ سخن گوئی پر اُسی بڑے برگد کے سایے محسوس کیے جن کا اظہار حنفی صاحب نے بھی 'تھوڑی سی روشنی' میں کیا اور جواز بھی پیش کیا کہ کہاوت ہے نا 'باپ پر پوت، پتے پر گھوڑا' لیکن اُن کے سانحہ ارتحال کے کرب کے ساتھ ساتھ ان کی عدم موجودگی کے زخم کی ٹیس کو 'اداس نظمیں' کے عنوان سے پرویز مظفر نے آزاد نظم اور نثری نظموں کے پیکر میں سلیقہ مندی کے ساتھ رکھ دیا اور ان نظموں میں انھوں نے یکسر اپنے آپ کو بھرپور اعتماد کے ساتھ اُس چھتنار برگد کے سائے سے علاحدہ ایستادہ کیا ہے۔

انتساب ہی میں اظہار کردیا گیا کہ یہ نظمیں انھوں نے 'اپنے پیارے پاپا کی یاد میں' کہی ہیں۔ تقریباً سوا سو چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ ہر نظم کا مرکزی خیال پاپا کا وصال مگر حیرت انگیز خوش گواری ہے کہ موضوع ایک ہونے کے باوجود ہر نظم کا انداز اپنا الگ رنگ لیے ہوئے ہے۔ ہر نظم ارتحال پدر کے مرکزی خیال کے گرداگرد طواف کرتی ہے۔ ایک ذکی الحس، ذہین وفطین، فرمانبردار فرزند کی شاعرانہ فکر وصال پدر پر کرب کا اظہار تو کرتی ہے لیکن کسی بھی موقع پر قنوطیت غالب نہیں ہونے پاتی بلکہ والد محترم کے موقر افکار اور ضابطۂ حیات سے مملو اشعار انھیں حوصلہ فراہم کرتے ہیں اور وہ زندگی کے تئیں رجائیت سے بھرپور لہجہ میں نئے حوصلوں کے ساتھ اگلے مراحل زندگی سے گذرتے ہوئے کامیابی وکامرانی کی منزل کی طرف رواں دواں ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔

مظفر حنفی صاحب نے ادب اطفال میں سارے انسانی کردار اپنے گھرانے سے لیے۔ نصف بہتر بھی ہیں۔ بیٹے، بیٹی، بہوئیں بھی ہیں، ناتی پوتی بھی۔ کہیں ضمائر کے استعمال کے ساتھ کہیں ان کی عرفیتوں کی استعمال کرکے لیکن فنکاری یہ ہے کہ وہ تمام تخلیقات اردو دنیا کے تمام گھرانوں کا تصاویر بن گئیں اور ان کے کردار تمام گھرانوں کے کردار۔ یہ تبھی ممکن ہے جب شاعر قادر الکلام ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے افرادِ خانہ کے درمیان بھرپور زندگی جیا ہو۔ ہر رشتے کی نزاکت، تقدیس، محبت اور کشش کے تمام جذبات کو صد فیصد محسوس کرتے ہوئے اور اپنی شفقت اور سرپرستی کا پورا پورا حق ادا کرتے ہوئے۔

حنفی صاحب نے اپنی غزل میں قصداً ایسے اشعار شامل کیے جن میں تخاطب اپنے فرزندگان سے ہے۔ کچھ اشعار میں اُن کے (بیٹوں کے) جذبات کی عکاسی بھی کرتے

ہیں۔ کہیں گھر کے ذمہ دار سرپرست کے رویہ کو علامتی طور پر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

اگل دیتے ہیں جو کچھ پیٹ میں ہے گھر میں آتے ہی
پرندے اپنے بچوں سے اداکاری نہیں کرتے

کہیں پورے مشرقی تمدن کی نمائندگی کرتے ہوئے گھر کے بزرگوں کے کرب کو غزل کے ایک شعر میں نمٹ دیتے ہیں۔

میں بھی شامل ہوں خاندان میں کیا   پوچھنا چاہتا ہوں بیٹوں سے

اس قسم کے تمام اشعار جن میں خطاب افراد خانہ (خصوصا بیٹوں) سے ہے یہ وہی انداز بیاں ہے، وہی وراثت ہے جو علامہ اقبال کے یہاں 'جاوید نامہ' یا 'جاوید کے نام' کے ذریعہ قوم کی تمام نئی نسل کے لیے پس انداز کی گئی ہے۔

ایک شاعر، ایک ادیب ورثہ کے طور پر جو اصل اثاثہ چھوڑ جاتا ہے وہ اس کے افکار ہوتے ہیں جن میں شعر وسخن کے پردے میں ایک نصاب زندگی مرتب کر جاتا ہے۔

ہمارے گھر سے دفینہ نہیں نکلنے کا   بیاضیں اور کتابیں ہیں کام آئیں تو

یہاں دو شعر ایسے نقل کرنا چاہتا ہوں جن میں تخاطب یقینی طور پر صرف پرویز مظفر سے ہے۔

میری سنتے، اپنے کہتے، میرے دیدہ و دل میں رہتے
لیکن تم نے اپنا مسکن سات سمندر پار بنایا

اس 'سات سمندر پار' بیٹے کے کرب کو بھی اس طرح بیان کیا کہ دونوں طرف کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔

سمندر پار میرا حال کیا ہے، کس نے دیکھا ہے   کہا پھر فون پر ماں سے کہ راوی عیش لکھتا ہے

پرویز مظفر نے اکثر نظموں میں حنفی صاحب کے اشعار و افکار کی طرف اشاراتی حوالے دے کر ایسا پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے کہ 'اداس نظمیں' حنفی صاحب کی چلت پھرت، ان کے انداز نظم، ان کے مربیانہ رویہ کا مرقع نظر آتی ہیں اور وہ ان نظموں میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے بلکہ نسل نو کو حوصلہ دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان نظموں کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے۔

'اداس نظمیں' کی اندرونی بائیں جانب کے فلیپ پر انجینئر فیروز مظفر نے لکھا ہے ''... ان نظموں کو ندا فاضلی کی نظم 'میں تمھاری قبر پر فاتحہ پڑھنے...' سے آگے کی کڑی میں جوڑ کر پڑھا جائے تو یہ بہت اہم نظمیں کہلائی جائیں گی....'' میں اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بے شک ندا فاضلی کی نظم معرکۃ الآرا ہے اور اس کا تھیم بھی وہی ہے جو ان نظموں کا ہے مگر ساتھ ہی عرض کروں کہ ندا نے ایک نظم کہی۔ پرویز مظفر نے سو سو نظموں کا پورا شعری مجموعہ والد محترم کے سانحۂ ارتحال کی نذر کر کے شعری ادب میں ایک مثال قائم کر دی کہ تمام نظموں کا مرکزی خیال ایک ہونے کے باوجود ہر نظم منفرد ہے۔

یہ نظمیں حنفی صاحب کے اشعار و افکار نیز پرویز مظفر کے لہو رنگ اشکوں اور قلب کے گداز سے گوندھی گئی ہیں لہٰذا ہر نظم تاثیر لیے ہوئے ہے کہ نیک اولادیں کس طرح اپنے اسلاف کو یاد کرتی ہیں، یاد رکھتی ہیں اور ان کے افکار و کردار سے حوصلہ پا کر امید افزا مستقبل کے لیے اقدام کے جذبے سے سرشار ہوتی ہیں۔ پرویز مظفر کی صحت مندہ سوچ اور زندگی کے تئیں مثبت رویے نے ان نظموں کو مراثی نہیں بننے دیا۔ ان نظموں میں جہاں پرویز مظفر کے دل گداختہ کا کرب جھلکتا ہے وہیں حنفی صاحب کے افکار و اشعار کے حوالے تسلی اور حوصلہ دیتے ہوئے بھی محسوس ہوتے ہیں اور دل بے اختیار کہ اٹھتا ہے، زندہ باد۔ پرویز مظفر، آفریں صد آفریں، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

کتاب کے ٹائٹل کے سلسلے میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ شکیل اعجاز رنگوں کے بوجھل پن یا بوجھل رنگوں کے امتزاج سے نظموں کی 'اداسی' اجاگر کرنے میں کامیاب ہیں۔

افق کے پار

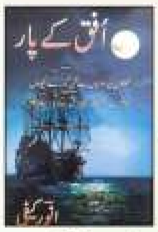

شاعر: انور کیفی

صفحات: 136، قیمت: 350 روپے

ناشر: اسلامک وینڈرس بیورو، 2660، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: یوسف رضا، B-276، اسٹریٹ نمبر 6،
سبھاش وہار، نورتھ گھونڈہ، دہلی 53

اچھی شاعری کے لیے مواد اور ہیئت کا ہم آہنگ ہونا اشد ضروری ہے، کیونکہ جب شاعر اپنے کسی خیال کو شاعری بناتا ہے تو وہ ایک نازک عمل سے گزرتا ہے اس عمل میں اگر کسی سے ذرا سی بھی کوتاہی ہوئی تو پھر شاعری کا لطف جاتا رہے گا۔ اپنے احساسات کو شعر کا پیکر عطا کرنے کے لیے وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جن سے اس کی بات میں حسن پیدا ہو اور وہ قاری کے دل میں اتر جائے۔ دراصل شاعری احساسات کو سجانے سنوارنے کا عمل ہے۔ انور کیفی کا دوسرا شعری مجموعہ 'افق کے پار' ہے جس میں ان کے فن سے متعلق تین مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون س ش عالم کا ہے۔ دوسرا ڈاکٹر مینا نقوی اور تیسرا ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کا ہے۔ ان مضامین میں انور کیفی کی شاعری پر مختصر طور پر گفتگو کی گئی ہے، حمد و نعت کے بعد غزلیں ہیں۔

انور کیفی کی غزلوں پر تفہیمی تناظر سے غور کریں تو بہت سی خوبیاں نظر آئیں گی۔ احساس اور اظہار کی سطحوں پر ان کے یہاں جدت ہے۔ اشعار میں سادگی، سلاست، نفاست کارفرما ہے۔ ان کے موضوعات میں وطن پرستی، عشق اور انسانیت نوازی کا گہرا عکس ہے۔ ان کی شاعری میں فکر انگیزی ہے، شعر کی مقبولیت کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ انور کیفی کی شاعری کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ قاری کو سوچنے پر آمادہ کرتی ہے۔ ان کے اشعار کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا بلکہ اس کے لیے ذہن کی تہوں کو کھولنا پڑتا ہے تب جا کر ان کے پیغام تک رسائی ہو پاتی ہے۔ جب اس پیغام کی رسائی قاری تک ہو جاتی ہے تو قاری کو جو لطف ملتا ہے اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ ان کی غزلوں میں فلسفیانہ مضامین اگرچہ نہیں لیکن انھوں نے جس طرح سے فطری جذبات کو نشاطیہ انداز میں پیش کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

گھر بنانے کے لیے گھر سے نکلنا ہی پڑا   جس طرف سب جا رہے تھے مجھ کو چلنا ہی پڑا
ہونٹوں سے لے گیا کوئی احساس چھین کر   تحلیل ہو گیا مری آواز کا فسوں

انور کیفی نے بھی اپنی غزلوں میں حسن و عشق کے جذبات پیش کیے ہیں لیکن ان میں انسانیت کے درد کو بھی شامل کر لیا ہے۔ جس سے ان کے اشعار کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ کہیں کہیں ان کی شاعری میں احتجاجی آہنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کی غزلوں میں سوز و گداز کی دنیا آباد نہیں ہے اور حسن و عشق کی محفل نہیں سجائی گئی بلکہ یہ دنیا ایسی ہے اس طرح آباد ہوئی اور یہ محفل اس طرح سجائی گئی ہے کہ اس میں انسانیت کے درد کو شامل کیا گیا ہے جس سے اس کی معنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ دراصل جذبات کے اظہار کے لیے الفاظ کا استعمال، مصرعوں کا دروبست اور ان کی نشست و برخاست کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ماضی کے عکس کے طور پر غمناکی اور دردمندی کے ساتھ ساتھ مفکرانہ پہلو بھی نظر آتا ہے۔

انور کیفی اردو شاعری کے اُفق پر کسی تعارف کے محتاج نہیں اُن کی پہچان ایک غزل گو کی حیثیت سے مستحکم ہے۔ اس تبصرے میں جو بھی نکات پیش کیے گئے اُن کے علاوہ بھی اور بہت سے نکات اُن کی شاعری میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ انور کیفی اس دور میں اپنے خیالات کو شاعری کا جامہ پہنانے کے لیے الفاظ یا تراکیب کی تلاش نہیں کرتے

بلکہ جو الفاظ ان کے سامنے ہیں انھیں ویسے ہی شعر میں ڈھال دیا ہے۔ تخیل کو شاعری کی اساس کہا جاتا ہے۔ بغیر تخیل کے اعلیٰ و ارفع شاعری کا وجود ہی نہیں، بقول انور کیفی۔

میں بنا تا ہوں تخیل کے قلم سے پیکر　　　میری تحریر مرے درد کی تصویر میں آ

محبوب کے بارے میں انور کیفی کا خیال کتنا نازک ہے ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

کیا ضروری ہے کہ محبوب کو چھو کر دیکھیں　　　اُس کو محسوس کیا جاتا ہے خوشبو کی طرح

آج کے دور میں جبکہ چاروں طرف لوٹ مار، بے دردی، ظلم و جبر کا بول بالا ہے۔ ایسے میں انسانیت تلاش کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ کوئی کسی کا درد سمجھنے والا نہیں ہے۔ سب اپنی کائنات میں گم ہیں، انسان اور انسانیت کے اس رویے سے متعلق یہ شعر دیکھیے۔

اس چودھویں صدی میں کسے ڈھونڈتے ہو تم　　　حشرات الارض رہ گئے انسان تو گیا

ندا فاضلی کا ایک شعر ہے۔

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی　　　جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

اب ایک شعر انور کیفی کا ملاحظہ کیجیے۔

بڑے خلوص سے ملتا ہے سب سے شہر میں وہ　　　ہر اک کے واسطے رکھتا ہے اک نقاب الگ

دونوں اشعار میں ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک ہی 'آدمی' سے متعلق بات کہی جا رہی ہو۔ فرق اتنا ہے کہ ندا فاضلی کے شعر میں 'جس کو بھی' اس سے ایک 'آدمی' کو نکالا گیا ہے۔ انور کیفی کے شعر میں وہی آدمی 'وہ' کی شکل میں صاف طور پر عیاں ہے۔

عشق و محبت کی وہ ساعتیں جن کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے، وہ مختلف نوعیت کی ہو سکتی ہیں۔ انور کیفی نے اُن ہی ساعتوں کو مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے۔

دوڑ کر آنا لپٹ جانا بہت اچھا لگا　　　پھر تمھارا سر میرا شانہ بہت اچھا لگا

وہ میرے دل میں سمایا ہوا ہے اس حد تک　　　کہ سچ کہتے ہیں جس شے کو اس کی چاہت ہے

اس شعری مجموعے کے مطالعے کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ مجموعہ اہم مقام حاصل کرے گا اور نئے شعرا کی آبیاری میں معاون ثابت ہوگا۔

رسائل و جرائد

اردو جرنل 21

نام مجلّہ: اردو جرنل

مدیر: ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

صفحات: 353، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

مبصر: شاہد وصی، معرفت بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

آج کے کتب بیزار معاشرے اور ان لوگوں کے درمیان جن کی انگلیاں صفحۂ قرطاس کے بجائے موبائل کی اسکرینوں پر زیادہ دوڑتی ہیں، کسی رسالے کا تسلسل کے ساتھ شائع ہونا اور ساتھ ہی ساتھ ادبی معیار اور مندرجاتی انفرادیت کو بھی برقرار رکھنا کار فرہاد سے کم نہیں۔ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے سالانہ اکیڈمک ریسرچ جرنل 'اردو جرنل' کا شمار بھی انھی رسائل میں ہوتا ہے۔ 2010 سے پابندی کے ساتھ یہ رسالہ شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے کی انفرادیت یوں بھی ہے کہ اس کا ہر شمارہ کسی نہ کسی خاص موضوع یا شخصیت پر مشتمل رہا ہے۔ ماضی میں تحقیق و تنقید، ہم عصر اردو افسانہ، ہم عصر اردو ناول، ہم عصر اردو شاعری اور 'اردو زبان و ادب کے فروغ میں پٹنہ یونیورسٹی کی خدمات' پر نمبر بھی شائع ہو چکا ہے۔ اسی کے ساتھ بعض دیگر شماروں میں فیض احمد فیض، سہیل عظیم آبادی، اسرار الحق مجاز، سعادت حسن منٹو وغیرہ پر خصوصی گوشے بھی شامل رہے ہیں۔ مدیر مجلّہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کے بقول 2021 چونکہ اکبر الہ آبادی کی وفات صدی اور ساحر لدھیانوی کی پیدائش صدی ہے، اس لیے انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے حالیہ بارہواں شمارہ بھی حسب روایت اردو کے دو بڑے شعرا اکبر الہ آبادی اور ساحر لدھیانوی کے گوشوں پر محیط ہے۔

زیر تبصرہ بارہویں شمارے کا پہلا حصہ اکبر الہ آبادی کے فکر و فن پر مشتمل ہے۔ اس میں بوستان اکبر کے تحت فاضل مدیر نے پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر ابوبکر عباد، ڈاکٹر آفتاب احمد منیری، مولانا سید شاہ محمد ریان، ڈاکٹر شیخ فاروق باشا، ڈاکٹر محمد شارب وغیرہ مشاہیر ادب کی تحریروں کو جگہ دی گئی ہے۔ وہیں گلہائے نو کے ذیلی عنوان کے ساتھ نو واردان بساط ادب کی تحریریں شامل ہیں۔ پروفیسر قدوس جاوید نے اپنے مضمون 'افکار اکبر الہ آبادی کی عصری معنویت' میں عصری پس منظر میں کلام اکبر کی نئی تفہیم و تعبیر کی ہے۔ اس مضمون میں ماضی پرستی اور مغرب بیزاری کے تعلق سے اکبر اور اقبال کے خیالات کو تقابلی انداز میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اکبر الہ آبادی کے تعلق سے عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا اور طنز و ظرافت کے ہم دوش ان کی شہرت پروان چڑھی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف ان ہی عناصر کی وجہ سے کلام اکبر اور افکار اکبر حیات و بقا کی ایک ڈیڑھ صدی گزار چکا ہے؟ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون 'اکبر الہ آبادی کی شعری روایت اور اکبر کی غزلیہ شاعری کے چند پہلو' میں اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے آفاقیت و حیات کی نئی کڑی تلاش کی ہے اور اکبر کی غزلیہ اور صوفیانہ شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مضمون کے آخر میں وہ لکھتے ہیں: ''یہ الگ بات ہے کہ ان کی طنزیہ و مزاحیہ نظم نگاری کا جادو اردو شاعری پر کل بھی چڑھا ہوا تھا اور آج بھی۔ اردو دنیا کے اس سرمایۂ غزل کی طرف توجہ نہیں گئی یا کم گئی ورنہ اکبر کی اس رنگ کی شاعری بلاشبہ اردو کی اس صوفیانہ شاعری سے آنکھیں تو ملاتی ہی ہے جہاں درد، میر، غالب اور آتش جیسے جید شعرا نظر آتے ہیں''۔ (ص 93) پروفیسر ابوبکر عباد کا مضمون 'اکبر الہ آبادی کی قرأت نو' فکری لحاظ سے اکبر کے تصورات کو سمجھنے اور فنی اعتبار سے ان کی شاعری کے پوشیدہ گوشوں کو دریافت کرنے کی ایک کوشش ہے۔ بشمول مذکورہ مضامین اس حصے میں کل اٹھارہ مضامین شامل ہیں جن میں اکبر الہ آبادی کے فکر و فن کو نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجلّے کا دوسرا حصہ جوان دلوں کے شاعر اور رومان و انقلاب کے ترجمان ساحر لدھیانوی کے نام ہے جس میں کل سولہ مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ گلشن ساحر کے تحت جہاں پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر عبد الحنان سبحانی، ڈاکٹر رشید جہاں انور، ڈاکٹر سورج دیو سنگھ جیسے معتبر و سینئر ناقدین ادب کی تحریریں شامل ہیں وہیں چمن تازہ کے عنوان سے ڈاکٹر شیخ عمران، ڈاکٹر عبد الباسط حمیدی، ڈاکٹر محمد سہیل انور اور ڈاکٹر نور نبی انصاری جیسے نئے لکھاریوں کے مضامین کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ ساحر لدھیانوی کا تعلق ترقی پسند تحریک سے بھی رہا ہے اور ترقی پسند شاعری کے بارے میں عمومی تصور یہ ہے کہ یہ صرف نعرہ بازی کی شاعری ہے، اس میں خطابت اور مقصدیت کا غلبہ ہوتا ہے۔ ساحر کے تعلق سے بھی یہ غلط فہمی عام ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون 'امید و نشاط کا شاعر: ساحر لدھیانوی' میں اسی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہیں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے ساحر کی دو نظموں 'اے شریف انسانو!' اور 'مگر ظلم کے خلاف' کا جائزہ لیا ہے اور عصری پس منظر میں ان کی تفہیم نو کی ہے۔ ڈاکٹر شہناز بانو نے اپنے طویل مضمون 'ساحر: فلمی نغموں کا سوداگر' میں ساحر کے اکثر و بیشتر فلمی نغموں کی روداد قلمبند

کردی ہے۔ مجموعی اعتبار سے مجلّہ کا یہ حصہ بھی ساحر کے فکروفن اوران کی شاعری کے مختلف جہات کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ مدیر کا حسن انتخاب ہی ہے کہ اکبروساحر کے یہ دونوں گوشہ ظاہری اعتبار سے گوشے ضرور نظر آتے ہیں لیکن معنوی اعتبار سے کسی معتبر نمبر سے کم نہیں ہیں۔

مجلّے کے تیسرے حصے میں گلستان نقد ونظر کے تحت مختلف موضوعات پر تحقیقی وتنقیدی مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ اس حصے میں کل تیرہ مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر شہاب الدین ثاقب کا مضمون 'بہار میں اردو تحقیق: آغاز تا امروز' نہایت وقیع اور محققانہ مضمون ہے۔ اس مضمون میں بہار میں اردو تحقیق کی مکمل روایت کا قدرے اجمالا قدرے تفصیلا تذکرہ موجود ہے۔ وہیں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا مضمون 'نظیر اکبرآبادی اور ڈاکٹر فیلن' بھی ایک تحقیقی مضمون ہے۔ جس میں مضمون نگار نے ایس ڈبلیو فیلن کی تالیف کردہ تین لغات کا جائزہ لیا ہے جن کے اندر ڈاکٹر فیلن نے تقریباً دو ہزار الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، مرکبات اور اصطلاحات پیشہ وراں کو نظیر کی سند کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا ہے۔ وہیں محمد عارف حسین کا مضمون 'دبیر کا غیر منقوط کلام' اپنی نوعیت کا نیا اور منفرد مضمون ہے۔

یہ رسالہ اپنے اندر افادی پہلو کو سمیٹے ہوئے ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور طباعت عمدہ ہے۔

تذکرہ و تاریخ

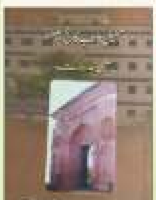

تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی علمی خدمات

مؤلف/ ناشر: حکیم وسیم احمد اعظمی

صفحات: 288، قیمت 400 روپے

ملنے کا پتا: دانش محل، امین آباد لکھنؤ 226018

مبصر: منظور پروانہ، دانش محل، امین آباد لکھنؤ 226018

حکیم وسیم احمد اعظمی نے 'تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی علمی خدمات' کی تاریخ مرتب کرنے اور اسے منظر عام پر لانے کی جو سعی کی ہے وہ ہر طرح سے لائق تحسین کارنامہ ہے کیونکہ یہ صرف ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک تحریک ہے جس کے سلسلے میں عام لوگوں کو بہت کم معلومات ہیں۔ اس سلسلے میں حکیم وسیم احمد اعظمی کتاب میں شامل 'پیش نامہ' میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''تکمیل الطب لکھنؤ ایک ادارہ نہیں ایک تحریک کا نام ہے۔ ایک ایسی تحریک جو یونانی طب کی حقیقی امین، انسان کی صحت اور اس کی فلاح وبہبود کا منبع اور مرجع ہے۔ جہاں درسیات کے ساتھ ہی ذہن سازی اور صالح فکر کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔ یہ تحریک یعقوبی فکر کا پرتو ہے۔''

ایسے اہم ادارے کی علمی خدمات کی تاریخ مرتب کرنا اپنے آپ میں ایک سعی مشکور ہے جسے حکیم وسیم احمد اعظمی نے بخوبی انجام دیا ہے۔ اس جگہ یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا اس سے قبل کسی طبی ادارے کی مکمل علمی خدمات پر کوئی کتاب منظر عام پر آئی ہے؟ اس سلسلے میں حکیم وسیم احمد اعظمی اپنے 'پیش نامہ' میں تحریر کرتے ہیں کہ ''برصغیر میں طبی درس گاہوں کی تعداد 80 سے متجاوز ہے۔ ان میں سے کسی بھی درسگاہ پر مستقل کتاب میرے علم میں نہیں ہے۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ اس کی اولیت کی سعادت راقم السطور کا مقدر بنی۔ وما توفیقی الا باللہ۔''

حکیم وسیم احمد اعظمی نے تکمیل الطب کالج کے سلسلے میں اپنے پیش نامے میں ایک اور امتیاز وافتخار کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ ''تکمیل الطب لکھنؤ کا یہ مالا امتیاز وافتخار ہے کہ طبی دانشوروں کے ساتھ ہی بزرگان دین، اسلامی ادب کے ماہرین اور معتبر مورخین کا فیضان بھی اسے حاصل رہا ہے۔ یہ ادارہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (وفات 1895) کی بشارت کا رہین منت ہے۔ اور اسے مولانا عبدالحق خیرآبادی (وفات 1899) مولانا محمد فاروق چریاکوٹی (وفات 1909) علامہ شبلی نعمانی (وفات 1914)، مولانا لطف اللہ علی گڑھی (وفات 1916) اور مولانا عبدالحلیم شرر (وفات 1976) کی تائید اور فکری حمایت حاصل رہی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی تو اس کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔''

'پیش نامہ' کے مندرجہ بالا اقتباسات سے قارئین کو لکھنؤ کے اس طبی ادارے کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ پیش نامہ کے علاوہ یہ کتاب نو ابواب میں منقسم ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

باب اوّل کا عنوان ہے 'مدرسہ تکمیل الطب'۔ اس باب میں اس ادارے کے قیام کے سلسلے کا تفصیل سے ذکر ہے۔ باب دوم کا عنوان ہے 'لکھنؤ اور دہلی طبی اسکول کے علمی معرکے' اس باب میں اس علمی معرکے کا ذکر کرتے ہوئے ایک اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ ''لکھنؤ اور دہلی طبی اسکول کے علمی معرکے نے طب کے مناظراتی ادب میں اہم اضافات کیے۔'' باب سوم کا عنوان ہے 'آل انڈیا آیوروید ک اینڈ یونانی کانفرنس دہلی اور انجمن طبیہ لکھنؤ' اس باب میں اس کانفرنس کی روداد اور اس کے اثرات کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ باب چہارم کا عنوان ہے 'حکیم محمد یعقوب اور تلامذۂ خاندان یعقوبی کے احوال اور علمی آثار: قیام مدرسہ تکمیل الطب سے قبل'۔ اس باب میں 31 حکیموں کے احوال اور علمی آثار کو بیان کیا گیا ہے۔ باب پنجم کا عنوان ہے 'فرزندان تکمیل الطب کے احوال اور علمی آثار' اس باب میں 61 حکیموں کی تفصیلات تحریر کی گئی ہیں۔ باب ششم کا عنوان ہے 'اردو طبی صحافت اور ماہنامہ تکمیل الطب' اس باب میں طبی صحافت اور طبی رسائل کے سلسلے میں تفصیل سے ذکر ہے۔ خاص طور پر لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'تکمیل الطب' کے سلسلے میں اہم معلومات ہیں۔ باب ہشتم کا عنوان ہے ''حکیم محمد یعقوب اور تلامذۂ خاندان یعقوبی کے علمی آثار۔ قیام تکمیل الطب سے قبل کا تذکرہ۔'' باب ہشتم کا عنوان ہے 'فرزندان تکمیل الطب کے علمی آثار' باب نہم کا عنوان ہے۔ 'اعتراف وانحراف'

مندرجہ بالا تفصیلات سے قارئین کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس کتاب کی اہمیت کیا ہے۔ پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اس بات کے کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ حکیم وسیم احمد اعظمی کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اس کتاب میں شامل مصادر کی فہرست میں درج کتب اور رسائل کی تعداد اس کی گواہی کے لیے کافی ہے۔ ان کا مطالعہ نہ صرف وسیع ہے بلکہ عمیق بھی ہے۔ حکیم وسیم احمد اعظمی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف شواہدات اور روایات کو جمع کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کی ہر طرح جانچ پرکھ کرتے ہیں اور اس سے برآمد نتائج سے مطمئن ہونے پر ہی اس کو پیش کرتے ہیں۔ یعنی وہ عمیق مطالعے اور غواصی کے بعد ہی قلم اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے تحقیقی کام میں مروتوں کے پیکر کا کردار نہیں ادا کرتے بلکہ بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی تحقیق کا معیار اعلیٰ ہے۔

تحقیق کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ کسی بھی تحقیق کو آخری نہیں مانا جاسکتا کیونکہ یہ ایک مسلسل عمل ہے اور نئی معلومات اور واقعات سے اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے مگر مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکیم وسیم احمد اعظمی کی کتاب 'تکمیل الطب کالج لکھنؤ کی علمی خدمات' دراصل وہ بنیاد کا پتھر ہے جو آنے والے مؤرخین اور محققین کے لیے گائڈ بک کا کام دے گی۔ یہی حکیم وسیم احمد اعظمی کے تحقیقی کام کی کامیابی ہے۔ یہ کتاب قارئین کے لیے بھی سودمند ثابت ہوگی اور وہ اس سے فیض حاصل کرسکیں گے۔ ■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

73ویں یومِ جمہوریہ کی مناسبت سے قومی اردو کونسل میں پرچم کشائی کی تقریب

نئی دھلی: 73ویں یومِ جمہوریہ کی مناسبت سے آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں پرچم کشائی کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے ہندوستانی جمہوریت کے امتیازات اور خوبیوں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے۔ شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ اس سال خاص بات یہ رہی کہ آزاد ہند فوج کے راہنما اور عظیم مجاہد آزادی سبھاش چندر بوس کا یومِ پیدائش نہایت تزک و احتشام سے منایا گیا اور وزیر اعظم عزت مآب نریندر مودی نے سبھاش چندر بوس کے ہولوگرام مجسمے کی نقاب کشائی کی اور ملک کے تئیں ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے احسانات اور عظیم کردار کو یاد کیا۔ شیخ عقیل نے کہا کہ سبھاش چندر بوس ہماری تاریخ آزادی کا ایک نمایاں نام ہیں، جن کی خدمات کا حکومتِ ہند ان کے شایانِ شان اعتراف کر رہی ہے۔ شیخ عقیل نے اس موقعے پر ملک کے تحفظ میں ہندوستانی افواج کی شجاعت، بہادری اور ایثار و قربانی کا خصوصی طور پر ذکر کیا اور کہا کہ انھی کی قربانیوں کی وجہ سے ہمارا ملک محفوظ ہے اور جب بھی ضرورت پڑی ہے انھوں نے اس ملک کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مودی حکومت نے ہمارے ان جوانوں کی بے مثال قربانیوں کا بھی بخوبی اعتراف کیا ہے، جنھوں نے آزادی کے بعد مختلف جنگوں میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور ملک کو عزت و فتح مندی سے ہمکنار کیا، انھی کی یادگار میں انڈیا گیٹ پر نیشنل وار میموریل بنایا گیا ہے جہاں 1947 سے لے کر اب تک شہید ہونے والے ہزاروں فوجیوں کے نام کندہ ہیں اور پرم ویر چکر ایوارڈ یافتہ جوانوں کے مجسمے بھی بنائے گئے ہیں۔ حکومت نے ایک اہم قدم اٹھاتے ہوئے امر جوان جیوتی کی مشعل کو وار میموریل مشعل میں ملا کر تمام مجاہدین اور فوجیوں کی قربانیوں کو بہترین خراج پیش کیا ہے اور اس طرح ملک کی حفاظت میں غیر معمولی کردار ادا کرنے والے تمام جوانوں کے نام کی یہ مشعل ایک ہی جگہ جلتی رہے گی اور ان کی یاد دلاتی رہے گی۔

شیخ عقیل نے کہا کہ دستورِ ہند ملک کی فلاح و ترقی کے لیے مل جل کر جد و جہد کرنے اور اپنے حقوق کے ساتھ اپنی ذمے داریاں انجام دینے کی تلقین کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دستورِ ہند میں تمام ہندوستانی زبانوں کے تحفظ و فروغ کی ضمانت دی گئی ہے اور مودی حکومت نے اسی پر عمل کرتے ہوئے نئی قومی تعلیمی پالیسی میں تمام مادری زبانوں کی تعلیم و تحفظ پر زور دیا ہے۔ اس پالیسی میں دیگر زبانوں کے ساتھ اردو زبان کے فروغ پر بھی خاص طور پر توجہ دی گئی ہے اور اس کی تعلیم و تحفظ کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ شیخ عقیل نے تمام اردو والوں سے اپیل کی کہ اردو کے فروغ کے تئیں سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومت کی طرف سے فراہم کیے گئے مواقع سے فائدہ اٹھائیں۔ پرچم کشائی کی اس تقریب میں کونسل کے تمام اسٹاف موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 جنوری 2022

لتا منگیشکر نے اپنے دلکش ترنم کے ذریعے اردو الفاظ کو عالمگیریت عطا کی: پروفیسر عقیل احمد

قومی اردو کونسل میں عظیم گلوکارہ کی رحلت پر تعزیتی نشست

نئی دہلی: سروں کی ملکہ اور موسیقی میں اپنی بے مثال مہارت، فنی کمال اور اعلیٰ ہنرمندی کے باعث بلبلِ ہند کہی جانے والی اور بھارت رتن و دیگر درجنوں قومی و بین الاقوامی اعزازات سے نوازی گئیں گلوکارہ لتا منگیشکر کے انتقال نے ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا کو مغموم کردیا ہے اور آج ہر وہ شخص رنجیدہ ہے جسے موسیقی کی ذرا بھی شدبد ہے اور جس نے عمر کے کسی بھی مرحلے میں لتا منگیشکر کو سنا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر عقیل احمد نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں منعقدہ تعزیتی اجلاس

میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ لتا جی ہندوستان کی آن بان اور شان تھیں، وہ ایسی منفرد اور عظیم شخصیت تھیں کہ ایسی شخصیتیں ہزاروں سال بعد پیدا ہوتی ہیں۔ پروفیسر عقیل نے فلمی نغموں اور اردو کے اٹوٹ رشتے پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ جس طرح فلمی گانوں نے اردو کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے، اسی طرح اردو سے فلمی دنیا کو بھی بے پناہ فائدہ ہوا ہے۔ لتا جی نے ساحر، مجروح، شکیل بدایونی وغیرہ کے لکھے نغمے اور اردو کے معتبر شعرا کی غزلیں بھی گائیں، لتا منگیشکر نے اپنی سریلی آواز سے نہ صرف ان کے کلام کو وسعت بخشی بلکہ اپنے دلکش ترنم سے اردو الفاظ کی خوبصورتی میں بھی چار چاند لگادیے۔ انھوں نے کہا کہ لتا منگیشکر کو اردو سے خصوصی لگاؤ تھا اور انھوں نے ابتدائی دور میں اپنے تلفظ کو درست کرنے کے لیے ایک مولوی صاحب سے باقاعدہ اردو زبان لکھنا پڑھنا سیکھا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ گانوں میں الفاظ کو بہت اچھی طرح ادا کرنے پر قدرت رکھتی تھیں اور ان کے گانے جہاں ان کی آواز کی شیرینی کی وجہ سے لوگوں میں مقبول ہوتے تھے وہیں ان کا حسنِ ادائیگی بھی شائقین کے دل کو بھاتا تھا۔ وہ نئے گلوکاروں کو خاص طور پر اردو سیکھنے کی تلقین کرتی تھیں، کیوں کہ اس کے بغیر کوئی بھی نغمہ صحیح طریقے سے نہیں گایا جاسکتا۔ شیخ عقیل نے کہا کہ لتا جی نے 36 زبانوں میں تیس ہزار سے زائد نغموں کو آواز عطا کی۔ اس اعتبار سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ نغمے گانے والی گلوکارہ ہیں، ان کا نام گنیز ورلڈ بک آف ریکارڈ میں بھی درج ہے۔ انھوں نے بہت سی ایسی زبانوں میں بھی گایا، جنھیں ہم نہیں سمجھتے، مگر لتا جی کی آواز کی دلکشی، پاکیزگی اور روحانیت ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور ہم اس میں کھو جاتے ہیں۔

پروفیسر عقیل احمد نے ان کی رحلت سے ہونے والے ذاتی دکھ کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جوں ہی ان کے انتقال کی خبر سنی مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا انتقال ایک فرد کا انتقال نہیں؛ بلکہ گائیکی کے ایک سنہرے عہد کا خاتمہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ لتا جی کی آواز ہماری زندگی کو روشنی بخشتی ہے، جب ہم غمگین ہوتے ہیں تو ہمیں ان کی آواز سن کر سکون ملتا ہے اور جب ہم کمزور ہوتے ہیں تو انھیں سن کر ہمیں طاقت ملتی ہے۔ ان کے علاوہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایڈمن) کمل سنگھ، اسسٹنٹ ڈائریکٹر (اکیڈمک) شمع کوثر یزدانی اور آبگینہ عارف نے بھی عظیم گلوکارہ کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ ان کے گائے ہوئے نغمے جہاں شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں، وہیں اردو زبان کے فروغ میں بھی ان کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ اس موقعے پر ان کی روح کی شانتی کے لیے دومنٹ کی خاموشی بھی اختیار کی گئی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 7 فروری 2022

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

اودھ کی خاتون افسانہ نگار

لکھنؤ: اردو زبان وادب کے لیے خواتین کی خدمات سے چشم پوشی ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ خواتین افسانہ نگاروں نے عورت کے جذبات، احساسات اور جذبہ ایثار کو ہمیشہ بڑی چابکدستی اور فنکاری سے پیش کیا ہے۔ ان کا مقصد محض اپنی نمائندگی نہیں بلکہ عصری

تقاضوں کے تحت سماج کو سجانے، سنوارنے اور نابرابری کے خاتمے کا جذبہ بھی کارفرما رہا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار اطہر نبی نے گلورکس فاؤنڈیشن ٹرسٹ کے زیراہتمام وقومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی اشتراک سے چوک لکھنؤ میں 23 جنوری کو منعقد یک روزہ سمینار 'اودھ کی خاتون افسانہ نگار' کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ افسانہ کے موضوع اور اسلوب میں ایک انوکھا پن پایا جاتا ہے۔ اچھا افسانہ نگار ایک سیاح کے مانند ہوتا ہے، جس کو کسی نئے ملک کی بہت سی انوکھی باتوں کا علم ہوجاتا ہے۔ جو اہل ملک کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں۔ ٹرسٹ کی صدر اور کنوینر سمینار نزہت شہاب چشتی نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ گزرتے وقت کے ساتھ خواتین افسانہ نگاروں کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی بھی پیدا ہورہی ہے۔ ابتدا میں خواتین، اکثر خواتین ہی کے موضوعات تک محدود رہتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان کے موضوعات میں وسعت اور تنوع پیدا ہونے لگا۔ آج کا مصنف آزاد ہے وہ کسی بھی نظریے، تحریک میں قید نہیں ہے۔ اسے فکری آزادی حاصل ہے۔ مہمان خصوصی حافظ مجیب اللہ ندوی نے کہا کہ ابتدائی دور کی خواتین تحریروں میں اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھیں اور وہ اپنے نام کی جگہ کوئی فرضی یا بنت فلاں لگاتی تھیں لیکن جب خاتون قلم کار بے باک ہوئیں تو اس درجہ کہ رشید جہاں اور چغتائی کی صورتوں میں ہمارے سامنے آئیں، جن کے افسانوں کو پڑھنا کبھی معیوب، کبھی اخلاق کے خلاف سمجھا گیا اور کبھی کفر کا فتویٰ صادر کردیا گیا۔ آج کی خاتون افسانہ نگار لکھتی ہیں اور اب ان کا لکھنا باعث عزت سمجھا جاتا ہے۔ یہ سماجی اعتبار سے ایک بڑی تبدیلی ہے۔ سمینار کی نظامت ضیاء اللہ صدیقی ندوی نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 جنوری 2022

ساحر لدھیانوی: فن اور شخصیت

لکھنؤ: ساحر لدھیانوی ترقی پسند شاعروں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت و مقبولیت آج بھی پوری آب وتاب سے قائم ہے۔ ان کی نظمیں اثر انگیز اور دلوں میں اتر

جانے والی ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام 'تلخیاں' نوجوان نسل کو متاثر کرنے والی شعری کتابوں کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہے گا۔ ہندوستان کی فلمی شاعری کے معیار کو بلند کرنے اور فلمی نغموں میں ادبی حسن پیدا کرنے کے حوالے سے بھی ان کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے زیراہتمام وقومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقد سمینار 'ساحر لدھیانوی فن اور شخصیت' کی صدارت کرتے ہوئے معروف ادیب و شاعر حسن کمال نے کیا۔ سمینار ہوٹل میزبان بمقام گوتم بدھ مارگ پر کیا گیا تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ساحر کی شاعری کا فلک اتنا بلند ہے کہ اس کا نشان پالینا آسان نہیں۔ کمیٹی کے جنرل سکریٹری اور کنوینر پروگرام اطہر نبی نے مہمانان اور حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے سمینار کی افادیت پر روشنی ڈالی اور استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ساحر جتنے بڑے شاعر، ادیب اور مشہور گیت کار تھے، اتنے ہی عظیم انسان بھی تھے۔ اس موقعے پر معروف ادیب سلیم خان ممبئی کی کتاب کا اجرا بھی کیا گیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ساحر کی شاعری میں مزدوروں، کسانوں اور معاشرے کے کچلے ہوئے طبقوں سے ہمدردی کے جذبات ملتے ہیں۔ ان کی شاعری اپنے عشقیہ مزاج کے باوجود ایک گہرے سیاسی شعور کی آئینہ دار ہے۔ ان کی عوامی شہرت کا آغاز 1944 سے ہوا۔ جب انھوں نے امرتسر کے ایک مشاعرے میں اپنی نظم 'تاج محل' سنائی۔ یہ نظم ساحر کی شاعری کا تعارف ثابت ہوئی، پوری دنیا کے اردو حلقے میں ساحر کے فن کو سراہا گیا۔ مہمان اعزازی پروفیسر ارتضیٰ کریم (دہلی یونیورسٹی) نے کہا کہ ساحر کی شاعری میں عورتوں کے تقدس کی پامالی کا جو اس قدر احساس ملتا ہے وہ اسی سماجی وتاریخی اور استحصالی رویہ سے عبارت ہے۔ معروف ادیب سہیل اختر وارثی نے کہا کہ ساحر کی شاعری کا محور انسانیت کا فروغ ہے، اس کے فلمی گیتوں کا مرکزی خیال یہی ہے۔ اس نے فلم کو ادب سکھایا، یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جہاں تک بالی ووڈ میں اردو شاعری کا تعلق ہے تو آرزو لکھنوی کے بعد ساحر اور مجروح ہی تھے جو اپنی فلمی شاعری میں بھی اپنے آہنگ کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے اور اپنے فن کو فلمی دنیا کی نذر نہیں ہونے دیا۔ ساحر کا

اردو زبان سے ایک جذباتی رشتہ ہے اور یہ رشتہ غیر مشروط ہے۔ مہمان ذی وقار پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ ساحر اپنی شاعری کے حوالے سے لوگوں کو ظلم و تشدد کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عشقیہ رنگ کی آمیزش کر کے اسے دلچسپ اور دلکش بنا دیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 جنوری 2022

مشاعرہ کے ذریعے اردو زبان کا فروغ

سونگڑہ: 9 جنوری 2022 کو بدیئی بابا جیو یوک سنگھ (براہی پور) نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے دریاپور (سونگڑہ) میں ایک سیمینار بعنوان 'مشاعرے کے ذریعہ اردو زبان کا فروغ' اور کل اڈیشا مشاعرہ منعقد کیا، سیمینار کی صدارت ادبی محاذ کے مدیر جناب سعید رحمانی نے فرمائی اور مولانا زعیم الاسلام قاسمی نے نظامت کے فرائض انجام دیے، سب سے پہلے ادارے کی جانب سے شری بھوتی

بھوشن سوائیں نے استقبالیہ تقریر کی اور مہمانوں کی گلدستوں سے پذیرائی کی۔ مولانا سید علی اسرار قاسمی کی دل پذیر تلاوت کے بعد جناب سید نور الہی ناطق، جناب غلام سرور اور جناب محمد جلال مرکزی نے نعتیہ کلام پیش کیے۔ بعد ازاں مولانا زعیم الاسلام قاسمی نے سیمینار کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے سب سے پہلے مولانا سید علی اسرار قاسمی کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی، اسی طرح سیمینار میں جناب سعید رحمانی، جناب خاور نقیب، جناب احمد فرحان، جناب عبدالمتین جامی، جناب مولانا اصغر حسین قاسمی، جناب صلاح الدین تسکین، جناب یوسف عاصم وغیرہ قلم کاروں نے یکے بعد دیگرے عنوان ہذا پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سامعین کے مذاق شعر و سخن کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے اپنے کلام بھی پیش کیے۔

اہم بات یہ ہے کہ اس سیمینار میں اڈیشا کے مشہور و معروف عالم دین، صاحب طرز انشا پرداز اور مجاہد آزادی مولانا سید محمد اطہر سونگڑوی کی یاد میں اردو کے معتبر شاعر و ادیب، محقق و ناقد جناب خاور نقیب کو 'مولانا اطہر ایوارڈ 2022' سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ادبی اعزاز 'مولانا اطہر میموریل فاؤنڈیشن' کی جانب سے جناب سید محمد علیم (سکریٹری) اور جناب سعید رحمانی (مدیر، ادبی محاذ، کٹک) کے ہاتھوں پیش کیا گیا، اس موقعے پر جناب سید علی اسرار قاسمی نے مولانا سید محمد اطہر کی حیات و خدمات پر مفصل روشنی ڈالی، ان کا مضمون جناب خاور نقیب کی مرتبہ کتاب 'سلاخوں کے پیچھے' کے مشمولات و مآخذ پر مشتمل تھا۔ ملحوظ رہے کہ 'سلاخوں کے پیچھے' مجاہد آزادی مولانا اطہر کی برہم پور جیل میں تحریر کردہ جیل ڈائری کا مجموعہ ہے جو تحریک آزادی کے سلسلے میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذکورہ بالا سیمینار اور مشاعرے کے اختتام پر ادارے کی جانب سے شری بھوتی بھوشن سوائیں نے شرکائے اجلاس اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: خاور نقیب، دریاپور، کٹک، اوڈیشا، 12 جنوری 2022

اکبر الہ آبادی کی شاعری موجودہ تناظر میں

نئی دہلی: انسٹی ٹیوٹ آف لرننگ مانیا کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے تکونہ پارک جامعہ نگر اوکھلا گاؤں کے چوپال میں 'اکبر الہ آبادی کی شاعری موجودہ تناظر میں' ایک روزہ سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں بطور مہمان خصوصی شہاب الدین، ابرار احمد مکی، ڈاکٹر عظیم ایڈوکیٹ، آصف ایڈوکیٹ، رضوی اور اسرالدین خان وغیرہ نے شرکت کی۔ اس موقعے پر ایڈوکیٹ طیب علی نے مہمانوں، مقالہ نگاروں اور سامعین کا استقبال کیا۔ انسٹی ٹیوٹ آف لرننگ مانیا کی صدر شمع خان اور چیف گیسٹ شہاب الدین کے ہاتھوں مہمانوں کو مومنٹو پیش کیا گیا۔ سیمینار میں اسکالرس نے اکبر الہ آبادی کی شاعری موجودہ تناظر میں کے عنوان پر پر مغز مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر اکبر الہ آبادی کی زندگی پر مبنی کوئز مقابلے میں مختلف اسکولوں کے طلبا و طالبات نے حصہ لیا، اس فریضہ کو سمایا عثمانی صاحبہ نے بحسن و خوبی انجام دیا اور طلبا نے بحسن و خوبی تمام جوابات دیے۔ مہمان خصوصی نے اپنے خطاب میں اکبر الہ آبادی کی شاعری کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی اور مقالات پر مقالہ نگار حضرات اور انسٹی ٹیوٹ آف لرننگ مانیا کی صدر کی محنتوں اور اقدامات کو سراہا، نظامت کے فرائض نجم الدین اور طوبی خان نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ سیمینار میں ڈاکٹر انوار الحق، ڈاکٹر ابراہیم افسر، ڈاکٹر خالد الہ آبادی، دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر شاہد اقبال، عبدالباری قاسمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسکالر عبدالواحد رحمانی اور ابو دردا ندوی وغیرہ نے مقالات پیش کیے۔ آخر میں انسٹی ٹیوٹ آف لرننگ مانیا کی صدر شمع خان نے شکریہ کی رسم ادا کر کے پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 فروری 2022

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

قومی اطفال ایوارڈ 2022 کے فاتح لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ مودی کی بات چیت

نئی دھلی: وزیراعظم نریندر مودی نے 24 جنوری کو ملک کے لڑکوں اور لڑکیوں سے ہندوستان کو جدید اور ترقی یافتہ بنانے کے عزم اور ملک میں تیار ہونے والی اشیا خریدنے کی مہم میں شامل ہونے کی اپیل کی۔ مسٹر مودی نے کہا کہ

ماحولیاتی تحفظ جیسے شعبوں میں ہندوستان کے عزم اور اقدامات کا فائدہ پوری دنیا کو ملے گا۔ وزیراعظم نے قومی اطفال ایوارڈ 2022 کے فاتح لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہندوستان جلد ہی اپنے بل بوتے پر ایک انسان بردار مشین خلا میں بھیجے گا، جس کے لیے نوجوان طاقت پوری تندہی سے کام کر رہی ہے۔ مودی نے کہا کہ آج ہمیں فخر محسوس ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے نوجوان اختراعات کر رہے ہیں اور ملک کو آگے لے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب سے کچھ دیر بعد ہندوستان اپنے دم خم پر پہلی بار ہندوستانیوں کو خلا میں بھیجنے والا ہے۔ اس گگن یان مشن کا دارومدار بھی ہمارے نوجوانوں کے کندھوں پر ہے۔ جن نوجوانوں کو اس مشن کے لیے منتخب کیا گیا ہے وہ اس وقت سخت محنت کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج ہمیں فخر محسوس ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام بڑی کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو آفیسرز (سی ای او) جن کی بات لوگوں کی زبان پر ہے وہ ہمارے ہی ملک کے بچے ہیں۔ یہ اس ملک کی نوجوان نسل ہے جو آج دنیا پر راج کر رہی ہے۔ ہندوستان کے نوجوان اسٹارٹ اپس کی دنیا میں اپنا جھنڈا لہرا رہے ہیں۔ 'میں' سوچھ بھارت ابھیان کی کامیابی کا بہت سا کریڈٹ ہندوستان کے بچوں کو بھی دیتا ہوں۔ آپ لوگوں نے گھر گھر بچہ سپاہی بن کر، سوچھ گرہی بن کر اپنے خاندان کو صفائی مہم کے لیے ترغیب دی جس طرح آپ صفائی مہم کے لیے آگے آئے، اسی طرح آپ کو ووکل فار لوکل مہم کے لیے بھی آگے آنا چاہیے۔ گھر کے لوگوں سے گزارش کریں کہ مستقبل میں جب بھی کوئی سامان خریدنا ہو تو ملک میں بنی اشیا ہی خریدیں۔ انھوں نے کہا کہ اس سے نہ صرف ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوگا بلکہ روزگار کے نئے مواقع بھی پیدا ہوں گے۔ وزیراعظم نے کہا کہ ہندوستان میں ہر دور میں چھوٹے بچوں نے بہادری کی تاریخ لکھی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 25 جنوری 2022

فروغ اردو کے لیے موجودہ حکومت کے اقدامات قابل قدر: پروفیسر شاہد اختر

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے سابق وائس چیئرمین اور مائناریٹی ایجوکیشن انسٹی ٹیوشن کے ممبر پروفیسر شاہد اختر نے اپنے ایک بیان میں موجودہ حکومت کے ذریعے مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی ستائش کرتے ہوئے کہا ہے کہ وزیراعظم نریندر مودی کی قیادت میں یہ حکومت 'سب کا ساتھ، سب کا وکاس اور سب کا وشواس' کے نعرے اور نصب العین کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ انھوں

نے کہا کہ ملک کے ہر طبقے تک پہنچنے اور تمام شہریوں کی تعلیمی، معاشی و سماجی ترقی کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہے جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آرہے ہیں۔ انھوں نے خصوصاً اردو کے حوالے سے حکومت کے اقدامات کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہمارے وزیراعظم نریندر مودی اور وزیر تعلیم دھرمیندر پردھان ملک کی تمام زبانوں کو آگے بڑھانے اور ان کے تحفظ و فروغ کے ساتھ اردو کے فروغ پر بھی خاص توجہ دے رہے ہیں اور انھوں نے بارہا اس زبان کی دلکشی اور شیرینی کا اعتراف بھی کیا ہے، اسی وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نہ صرف ہندوستان کی سطح پر اردو کے کاز کو آگے بڑھانے والا سب سے بڑا ادارہ بنے بلکہ وہ عالمی سطح پر بھی لوگوں کو اس زبان اور اس کے ادب سے مربوط کرے۔ انھوں نے کہا کہ وزیراعظم کی سربراہی میں کونسل نے پچھلے سات سال میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 فروری 2022

دھلی

ترکی کے تعلیمی اداروں میں عربی زبان کی تدریس

نئی دھلی: ریسرچ اسکالرس فورم، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام تیسویں ان ہاؤس سیمنار کا پروفیسر عبدالماجد قاضی صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں آن لائن انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شعبۂ عربی، آسام یونیورسٹی، سلچر کے استاذ پروفیسر بشیر احمد نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں ریسرچ اسکالرس فورم کی سکریٹری ثمینہ خانم نے مہمان خصوصی، اساتذہ کرام اور ریسرچ اسکالرس کا استقبال کیا۔ اس کے بعد شعبے کے ریسرچ اسکالر نورالدین نے 'ترکی کے تعلیمی اداروں میں عربی زبان کی تدریس' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا، مقالے کے آغاز میں انھوں نے ترکی کے مختلف اداروں کا تعارف پیش کیا اور ان کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خصوصیت کا تذکرہ کیا نیز ترکی کے تعلیمی اداروں میں عربی زبان و ادب کے کورسیز اور طریقہ تدریس پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس کے بعد ریسرچ اسکالرس کی جانب سے مختلف سوالات کیے گئے جن کے جوابات ریسرچ اسکالر نورالدین نے دیے۔ مہمان خصوصی پروفیسر بشیر احمد نے فورم کے ذمہ داروں کو ان ہاؤس سیمنار کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی اور ریسرچ اسکالر نورالدین کو ایک علمی اور تحقیقی مقالہ پیش کرنے پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ آج ہمیں ترکی کے تعلیمی اداروں اور وہاں عربی زبان کی تدریس کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ پروگرام کے اخیر میں پروفیسر عبدالماجد قاضی نے اپنے صدارتی خطاب میں مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی شخصیت ایک علمی شخصیت ہے اور اپنی انتظامی مصروفیات کے باوجود بھی آپ نے ہمارے اس پروگرام میں شرکت کی۔ یہ ہمارے لیے عزو شرف کی بات ہے۔ پروفیسر عبدالماجد قاضی نے ریسرچ اسکالر نورالدین کے مقالے پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں اپنے مشوروں سے بھی نوازا۔ پروگرام کے آخر میں فورم کے ایڈوائزر ڈاکٹر نسیم اختر ندوی نے مہمان خصوصی، اساتذہ کرام اور ریسرچ اسکالرس کا شکریہ ادا کیا۔ اس سیمنار میں شعبے کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 جنوری 2022

زندانی ادب

نئی دھلی: مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی نے 'ادب السجون' (قید و بند میں رہتے ہوئے ادبا کی ادبی تخلیقات) کے عنوان کے تحت ایک سمپوزیم کا انعقاد آن لائن زوم پلیٹ فارم پر کیا۔ مرکز کے صدر پروفیسر رضوان الرحمٰن نے استقبالیہ کلمات پیش کیے اور اسکول آف لینگویجز کے ڈین پروفیسر مظہر آصف نے مہمانوں اور شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ ادب ہر دنیا کی سبھی زبانوں میں پایا جاتا ہے اور شاید اس کا آغاز حضرت یوسف علیہ السلام کی قید سے ہوا اور آج بھی قیدی مصنفین اپنی کاوشوں سے لائبریریوں کو مالا مال کر رہے ہیں۔ انھوں نے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کو اس موضوع پر مزید تحقیقاتی مضامین لکھنے کی ترغیب دی۔ ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب، سمپوزیم کے آرگنائزر نے موضوع کی اہمیت اور غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور نظامت بھی کی۔ ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی، سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے افتتاحی خطبہ دیا۔ انھوں نے بتایا کہ عصر حاضر میں ادب زنداں کا اطلاق ان تمام ادبی اصناف پر ہوتا ہے جو قید خانہ کے اندر لکھی گئی ہوں یا اس کے باہر لیکن قید و بند سے متعلق ہوں۔ انھوں نے ادب زنداں کی تاریخ اہم کتابوں اور ان کے مصنفین کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے ادب زنداں کی بہترین تخلیقات کا تذکرہ کیا جس میں احمد حسین کی 'وراء القضبان' سے لے کر صنع اللہ ابراہیم کی 'شرف'، طاہر بن جلون کی 'تلک العتمۃ الباہرۃ'، نوال السعداوی کی 'تجربتی فی سجن النسا'، عبدالرحمٰن منیف کی 'شرق المتوسط'، نبیل سلیمان کی 'السجن' اور اسماعیل فہد اسماعیل کی 'المستنقعات الضوئیۃ' تک شامل ہیں۔

اس کے بعد صدر شعبۂ مطالعات مشرق قاہرہ یونیورسٹی ڈاکٹر جلال سعید الحفناوی نے ادب زنداں کے حوالے سے گفتگو کی۔ آپ نے ادب زنداں کی بہت سی کتابوں کا تذکرہ کیا۔ بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب 'غبار خاطر' کا تجزیہ پیش کیا جس کا ترجمہ خود انھوں نے عربی میں کیا ہے۔ کلیدی مقرر پروفیسر ڈاکٹر مصطفیٰ عطیہ جمعہ، جو کہ کویت میں ادب و نقد کے استاذ کے ساتھ ساتھ جامعہ اسلامیہ منیسوتا، امریکہ میں مہمان استاذ بھی ہیں، نے توسیعی خطبہ دیا۔ انھوں نے ادب زنداں کے فن پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی۔ شعبہ عربی قاہرہ سے پروفیسر سامی سلیمان پروگرام کے مہمان خصوصی نے صدارتی کلمات پیش کیے اور چند نکات کی طرف اشارہ بھی کیا۔ آخر میں ڈاکٹر محمد اجمل نے سبھی مقررین و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر سونو سینی، ڈاکٹر سندیشہ، محمد صادق اور ابوحمزہ نے ٹیکنیکل مدد فراہم کی۔ سمپوزیم میں ملک و بیرون ملک سے اساتذہ و اسکالرز کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 فروری 2022

ہندی کی عالمی صورتِ حال

نئی دھلی: عالمی یوم ہندی کے موقعے پر شعبۂ ہندی، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 'ہندی کی عالمی صورت حال' کے موضوع پر ایک روزہ ویبی نار کا انعقاد کیا گیا۔ ویبی نار کا آغاز پروفیسر اندوویریندر صدر شعبۂ ہندی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے پروگرام کے صدر، مہمان خصوصی، مہمانان اعزازی اور علم و ادب کے دیگر ارباب فن کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ، نائب شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ویبی نار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ پروفیسر موصوفہ نے عالمی سطح پر ہندی کی درس و تدریس پر زور دیتے ہوئے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے شعبہ ہندی کو اس موقعے پر مبارکبادی اور نیک خواہشات کا بھی اظہار کیا۔ اس دوران ڈین فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ ہیومنی ٹیز پروفیسر محمد اسدالدین بھی موجود ہے۔

بھگونت یونیورسٹی، راجستھان کے ڈاکٹر سندیپ اوستھی نے روس اور دیگر ممالک میں ہندی کے دائرے پر تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ ہندی کو عالمی سطح پر اہم شناخت ملی ہے۔ اب تو غیر ملکی افراد بھی بڑے پیمانے پر ہندی سیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے آگے کہا کہ صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے بھارتی پرواسی ایوارڈ یافتہ پچاس برس کی نیلو گپتا اب تک تقریباً پندرہ ہزار غیر ملکیوں کو ہندی زبان کی تربیت دے چکی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غیر ملکی لوگ بھی بڑے پیمانے پر ہندی سیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نوتن پانڈے اسسٹنٹ ڈائرکٹر، مرکزی ہندی ڈائرکٹوریٹ نے ہندی زبان کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا اور ہندی کے بڑھتے اثر و نفوذ پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ ہندی عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کر چکی ہے۔ تقریباً ایک سو پچاس ملکوں میں ہندی زبان پر تحقیق ہو رہی ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں ہندی کو پہنچانے میں غیر ملکوں میں آباد ہندوستانیوں کا بیش قیمت تعاون شامل رہا ہے۔ انھوں نے آگے کہا کہ تقریباً تین کروڑ ایسے ہندوستانی ہیں جو ہندوستان سے

باہر ہندی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہیں۔ اگر نصاب کو ذرا اور سہل بنایا جائے تو غیر ملکی لوگوں کو ہندی سکھانے میں مزید آسانی ہوگی۔

پروگرام میں مرکزی ہندی سنستھان، آگرہ کی ڈائرکٹر ڈاکٹر بینا شرما نے ہندی زبان کے اندرون میں توانائی اور فعالیت کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے ہندی زبان کی بڑے پیمانے پر تبلیغ و تشہیر کو اہمیت دی اور ہندی میں علوم کے خزینے کو انتہائی زرخیز مانا۔ ویبی نار میں جامعہ کے شعبہ ہندی اور دیگر شعبوں کے فیکلٹی اراکین اور طلبا نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ ڈاکٹر مکیش کمار میرٹھی اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ہندی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پروگرام کی نظامت کے فرائض کے ساتھ ساتھ شکریہ کی رسم بھی ادا کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 11 جنوری 2022

تقی عابدی کی رثائی خدمات

نئی دهلی: امروہہ فاؤنڈیشن کی جانب سے 7 جنوری کے روز اردو ادب میں رثائی ادب پر ڈاکٹر سید تقی عابدی کی خدمات پر ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس جلسے کے مہمان خصوصی ڈاکٹر تقی عابدی تھے جو ہارٹ سرجن ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادیب، شاعر، محقق اور نقاد ہیں۔ کناڈا میں مقیم مسٹر عابدی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جلسے میں ہندوستان کے معروف ادیب و شعرا نے شرکت کی۔ پروگرام میں کچھ معروف ادبا نے تقی عابدی کی اردو خدمات پر اظہار خیال کیا اور مبارکباد پیش کی۔ اس جلسے کی صدارت اسلامی اسکالر پروفیسر اختر الواسع نے کی اور نظامت معروف شاعر آل انڈیا ریڈیو اردو سروس کے سابق اناؤنسر عرفان اعظمی نے کی۔ اس کے علاوہ فاروق ارگلی کو ان کی اردو خدمات کے سلسلے میں اور صبیحہ سنبل کی اردو شاعری کے عوض لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور پیمبر نقوی کو جون ایلیا ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ دیگر خطاب کرنے والوں میں کلیم اصغر، ڈاکٹر فرحت نادر رضوی اور ڈاکٹر سید حسنین اختر شامل ہیں۔ اس جلسے کے آخری سیشن میں شعری نشست کا اہتمام کا گیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی، فاروق ارگلی، شاہد انور، صبیحہ سنبل اور رضیہ حیدر اور پیمبر نقوی نے کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 جنوری 2022

اترپردیش

ڈراما: فن اور روایت

میرٹھ: ''جب ہم ڈراما کرتے ہیں یا اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں تو ہم صرف زندگی کو پیش نہیں کرتے بلکہ وہ وجوہات جو ہمارے ذہن میں ہیں ان تمام کو ہنرمندی اور خوبصورتی کے ساتھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ عام انسان بہتر انسان بننے کی کوشش کرے۔ ڈراما ہمارے یہاں مختصر ہے مگر یہ اتنا مختصر بھی نہیں کہ اس میں سماج کی ہر شے کو نہ سمایا جاسکے۔'' یہ الفاظ تھے کولکاتا کے معروف ڈراما نگار ظہیر انور کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام منعقد 'ڈراما: فن اور روایت' موضوع پر اپنی صدارتی تقریر میں آن لائن ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اقبال نیازی، اسلم پرویز کے ساتھ ساتھ صادقہ نواب سحر نے بھی ڈرامے لکھے جن سے ڈرامے کی روایت مستحکم ہوئی ہے۔ اگر ہم ڈرامے میں ڈوب کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ اس میں انسانی سوجھ بوجھ اور انسانی شعور بھی شامل ہوتا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ نئے ڈرامے لکھے جائیں گے۔ پروگرام کی صدارت معروف ڈراما نگار محترم ظہیر انور نے انجام دی اور مہمان خصوصی کے بطور صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی پروفیسر شبنم حمید اور ممبئی سے معروف ڈراما نگار محترم اقبال نیازی نے شرکت کی جب کہ مہمان مقررین کے طور پر دہلی یونیورسٹی سے پروفیسر محمد کاظم، حیدرآباد سے معروف ڈراما نگار محترم انیس اعظمی، ممبئی سے معروف ڈراما نگار اسلم پرویز اور میرٹھ سے معروف ڈائریکٹر اور ڈراما نگار محترم بھارت بھوشن شرما آن لائن موجود رہے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی، نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ادا کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 جنوری 2022

عربی زبان و ادب تمام علوم و فنون کا سرچشمہ ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل

علی گڑھ: 11 جنوری 22 کو علی گڑھ میں واقع ابن سینا اکادمی کے زیر اہتمام بین الاقوامی یوم عربی کے تعلق سے اساتذہ عربی کو اعزاز و اکرام کے لیے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عقیل احمد ڈائرکٹر این سی پی یو ایل تھے۔ پدم شری پروفیسر سید ظل الرحمن نے جلسے کی صدارت کی۔ شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالباری، پروفیسر سید احتشام احمد ندوی، پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی، ڈاکٹر طارق مختار، پروفیسر سید محمد یوسف، پروفیسر مسعود انور علوی، پروفیسر محمد ثناء اللہ ندوی کا شال اور مومنٹو پیش کر کے اعزاز و اکرام کیا گیا۔ ڈاکٹر فخر عالم ناظم جلسہ نے ہندوستانی جامعات میں شعبۂ عربی کے تعلق سے اپنی رپورٹ میں کہا کہ ہندوستان کی مختلف جامعات وکلیات میں اساتذہ کی ایک لمبی فہرست ہے جو اس زبان کی خدمت کر رہی ہے۔ پروفیسر عبدالباری نے زبان کی لطافتوں اور نزاکتوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس زبان کو ہر خاص و عام تک پہنچانا چاہیے۔ پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی نے خصوصیات زبان کو بیان کرتے ہوئے عربی زبان کے مترادفات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پروفیسر محمد ثناء اللہ ندوی نے عربی زبان و ادب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنی تیس سالہ علمی زندگی میں جو تخلیقات و کارنامے مشرق و مغرب میں عربی کے ذخیرے میں دیکھے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس زبان پر مستشرقین کے بہت احسانات ہیں۔ خاص طور سے انھوں نے تاریخ التراث العربی اور دانتے کا خصوصی طور پر ذکر کیا۔ متھرا سے آئے ڈاکٹر ظہیر الدین کی کتاب 'غالب اور کیٹس' کی رسم اجرا مہمان خصوصی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ عربی زبان تمام علوم و فنون کا سرچشمہ ہے اور اس کو ہندوستان میں جو پذیرائی ملنی چاہیے وہ نہیں ملی، ہم سب کو اس کی ترویج و اشاعت کے لیے عملی اقدام کرنے چاہئیں اور ہمارا ادارہ قومی کونسل اس کام کے لیے پابند عہد ہے۔ صدر جلسہ پروفیسر سید ظل الرحمن نے اس بات پر زور دیا کہ عربی صرف زبان ہی نہیں بلکہ ہماری تہذیبی میراث بھی ہے، لہٰذا ہمیں اس کی ہر ممکن حفاظت کرنی چاہیے۔ طلبا و اساتذہ کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ جلسے کے کنوینر پروفیسر سید ضیاء الرحمن صاحب نے تمام شرکا و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر فخر عالم ندوی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' 12 جنوری 2022

'اردو آنگن'

دیوبند: سماجی تنظیم پرچم کے 'اردو آنگن' کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر صحافی ڈاکٹر شاہد زبیری نے اردو کی بقا میں شعر وادب کے کردار کے حوالے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی شعر وادب کی محفلوں کا اپنا الگ ایک کردار ہے۔ انھوں نے کہا کہ صرف اس پر انحصار کر کے اردو کی بقا اور ترقی ممکن نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کے لیے اردو کی درس و تدریس ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی زبان محض اپنے شعری اور ادبی سرمایہ کے بل بوتے زندہ نہیں رہ سکتی، جب تک اس زبان کی درس و تدریس نہ ہو اور وہ روزمرہ کے استعمال میں نہ آتی ہو۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے، نئی نسل اس طرف توجہ نہیں دے رہی ہے، اس لیے ہم لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ ہم نئی نسل کو اردو کی طرف راغب کریں اور اردو داں طبقہ تھوڑا بہت وقت نکال کر ان بچوں کو اردو سکھائے۔ انھوں نے کہا کہ سنسکرت اور فارسی اس کی مثالیں ہیں، ہمارے ملک میں دونوں زبانیں عوام میں نہ بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور نہ لکھی اور پڑھی جاتی ہیں جب کہ دونوں کا شعری اور ادبی سرمایہ وافر مقدار میں موجود ہے۔ اپنے صدارتی کلمات میں پروفیسر جلال عمر نے کہا کہ اردو کی شاعری آج بھی عوام کے دلوں پر راج کرتی ہے۔ اردو کے نغمے اور غزلیں لوگ شوق سے سنتے اور سر دھنتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مشاعروں میں عوام بلا لحاظ مذہب وملت شرکت کرتے ہیں۔ پرچم کی صدر اور ہندو گرلس انٹر کالج کی پرنسپل ڈاکٹر قدسیہ انجم نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اردو آنگن کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ 'اردو آنگن' کے زیر اہتمام کورونا وبا کے دوران آن لائن خواتین کے آل انڈیا مشاعروں کا سلسلہ کامیاب رہا اور نئی نسل کی شاعرات نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا اور کہنہ مشق شاعرات نے بھی اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ پروگرام کی صدارت اسلامیہ انٹر کالج کے سابق پرنسپل پروفیسر جلال عمر نے کی اور نظامت ریسرچ اسکالر نصرت پروین نے انجام دی۔

روزنامہ 'صحافت' 6 جنوری 2022

سفرنامہ

میرٹھ: سفر دنیا کی تخلیق کا سبب، علم، ظفریابی اور فتح یابی کا ذریعہ ہے۔ ان کے ذریعے دوربینی اور جہاں بینی کا ہنر آتا ہے۔ برطانوی قوم اس کی عمدہ مثال ہے کہ اس قوم نے اسفار کے ذریعے ہی دنیا بھر میں حکومت کی۔ یہ قوم سفر کے ذریعے ہی تاجر بنی، تاجر سے سیاسی اور سیاسی سے سلطان بن گئی۔ یہ الفاظ تھے سابق ڈائرکٹر NCPUL اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے پروفیسر خواجہ اکرام الدین کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام منعقد 'سفرنامہ' موضوع پر خصوصی مقرر کی حیثیت سے آن لائن ادا کر رہے تھے۔ اس ادب نما پروگرام کی سرپرستی معروف ادیب عارف نقوی، جرمنی نے فرمائی اور صدارت کے فرائض سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے پروفیسر خالد محمود نے انجام دیے۔ مقالہ نگار کے بطور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد کے لکھنؤ کیمپس سے ڈاکٹر عشرت ناہید نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ادا کی۔ اس موقعے پر محترمہ عشرت معین سیما نے اپنے سفرنامے کے تجربات اور مختلف ممالک میں سفر کے دوران لکھے گئے سفرناموں کی اہمیت کو واضح کیا۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے پروگرام کے مقاصد کے علاوہ 'سفرناموں کے بدلتے رنگ اور اکیسویں صدی کے سفرنامے' عنوان سے پرمغز مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ صدیوں کے سفرناموں میں واقعات وحالات کے ساتھ ساتھ مصنف کی شخصیت بھی نمایاں طور پر شامل رہتی تھی مگر اکیسویں صدی کے سفرناموں میں سفرنامہ نگار کی شخصیت معدوم سی ہوگئی ہے اور اسلوب کے اعتبار سے افسانویت کا غلبہ ہونے لگا ہے جو سفرناموں کے لیے نیک فال نہیں ہے کیونکہ سفرناموں میں بڑھتے افسانوی رنگ نے ان کی حقیقت پسندی کو نقصان پہنچایا ہے۔

عارف نقوی نے صنف سفرنامہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سفرناموں میں مطالعہ و مشاہدہ اور زبان و اسلوب دونوں کی اہمیت مسلم ہے۔ اگر مطالعہ ومشاہدہ ناقص ہے یا زبان و اسلوب پر مضبوط گرفت نہیں ہے تو سفرنامے کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ یوں تو حقیقت نگاری ادب کی تمام اصناف کی بنیاد کہی جا سکتی ہے لیکن سفرنامے میں اس کی اہمیت کہیں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ یہ صنف ہماری تہذیبی و ثقافتی، سیاسی و سماجی اور معاشی و معاشرتی تاریخ کو متاثر کرنے کی بے پناہ قوت رکھتی ہے۔ حقیقت سے پرے یا افسانوی رنگ میں بیان کردہ واقعات پڑھنے میں تو دلچسپ مگر سماج کو گمراہ کرنے کا سبب ہو سکتے ہیں۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر خالد محمود نے سفرناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سفرنامے کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ سفر بغرض سیاحت اور سفر بغرض مقصد۔ اول الذکر کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں کوئی تجارتی، علمی یا کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہیں ہوتا بلکہ اس کی پوری توجہ وہاں کے حالات وواقعات پر مرکوز رہتی ہے جب کہ ثانی الذکر میں مقصد اولیت پر رہتا ہے۔ اس موقعے پر سیدہ مریم الٰہی، محمد شمشاد، عظمیٰ پروین، فیضان ظفر، محمد شمشاد، شاہانہ پروین وغیرہ آن لائن موجود رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 21 جنوری 2022

بہار

آزادی کے 75 سال: خواب اور چیلنج

جہان آباد: 1857 کی جنگ میں جہان آباد کے جانباز فرزند اور آزادی کے متوالے بابو کنور سنگھ کے معاون قاضی ذوالفقار علی شہادت کو فراموش کرنا ناممکن ہے۔ یہ باتیں پروفیسر اوم پرکاش نے جہان آباد میں 'آزادی کے 75 سال: خواب اور چیلنج' کے موضوع پر منعقد مذاکرے کو خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے اپنے خطاب میں ذوالفقار علی کو 1857 کا ہیرو قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی شہادت کو فراموش کرنا دراصل جنگ آزادی کے متوالوں کو فراموش کرنے کے مترادف ہے۔ ان کے مطابق 1857 کی جنگ سے قبل ہی ضلع سمیت پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف چھوٹی چھوٹی لڑائیاں جاری تھیں جن میں وطن کے لیے کئی جانبازوں نے اپنی جان نثار کردی لیکن آج گمنام ہیں۔ ملک کی مشترکہ تہذیب کی وکالت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہمیں اس رواداری اور گنگا جمنی تہذیب کو برقرار رکھنا ہوگا، نیز 1857 کی جنگ میں جہان آباد اور ارول کے شہدا کو تلاش کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر کمار پرویز نے اپنے خطاب میں ویر کنور سنگھ، ذوالفقار علی، اشفاق اللہ خان، ساوتری بائی فاطمہ شیخ کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ مشترکہ تہذیب ہی ہماری اصل وراثت ہے۔ ڈاکٹر کملیش شرما نے کہا کہ جنگ آزادی کے درمیان گاؤں گاؤں میں جنگ چھڑی تھی ہمیں اس جنگ میں شہید ہونے والوں کے نام سامنے لانے ہیں۔ ماہر تعلیم راج کشور شرما نے اپنے خطاب کے دوران 1857 میں بابو کنور سنگھ کے ذریعے جہان آباد کے فرزند اور جانباز ذوالفقار علی کو کیتھی ہندی میں لکھے تین خط کو پڑھ کر بتایا کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ 1857 کی جنگ منصوبہ بند طریقے سے لڑی گئی تھی۔ اس موقعے پر خطاب کرنے والوں میں وصی احمد، محمد ثقلین، رفیق جمالی، ہارون رشید، شہاب الدین انصاری، رامادھار سنگھ اور اجے کمار سنگھ وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جنوری 2022

تلنگانہ

جنوبی ایشیا میں سماجی علوم

حیدرآباد: ہمیں نیچرل سائنس کے علاوہ سماجی علوم میں مہارت کی جانب توجہ دینی چاہیے۔ سماجی علوم کے تحت ہم گزری نسلوں کی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں اور اسے مزید بہتر بنانے کی تجویز پیش کر سکتے ہیں۔ استاد اور شاگرد کو ایک ساتھ مل کر ایسا علم دریافت کرنا ہوگا جو عملی زندگی میں کارآمد اور موثر ہو۔ ان خیالات کا اظہار محترمہ زلیخا رفیق، صلاح کار برائے نسواں افغانستان، اقوام متحدہ نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں منعقدہ آن لائن بین الاقوامی اردو سماجی علوم کانگریس کے افتتاحی اجلاس کے دوران اپنے کلیدی خطبہ میں کیا۔ اسکول برائے سماجی علوم کے زیر اہتمام منعقدہ کانگریس کا عنوان 'جنوبی ایشیا میں سماجی علوم' تھا۔ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر، مانو نے صدارت کی۔ پروفیسر محمد مزمل، سابق وائس چانسلر، ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی، آگرہ اور ایم جے پی روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی مہمانِ خصوصی تھے۔ محترمہ زلیخا رفیق نے اپنے تجربات کی روشنی میں خواتین کو درپیش چیلنجز کا احاطہ کیا۔ پروفیسر سید عین الحسن شیخ الجامعہ مانو نے صدارتی خطاب میں یورپ سے مستعار لی جانے والی علمی تحریکات کا مختصر محاکمہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان تحریکات کا اثر جہاں آزادی کے بیانیہ پر پڑا وہیں بہت سے اور محاذوں پر بھی ان کے اثرات نے قدیم جنوبی ایشیائی تحریکات کو پیچھے ڈال دیا۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، نائب شیخ الجامعہ نے اپنے استقبالیہ کلمات میں یونیورسٹی اور اسکول برائے فنون و سماجی علوم کی کارکردگی کا مختصر تذکرہ کیا۔ ساتھ ہی انھوں نے اردو میں منعقد ہونے والی اس کانگریس کی معنویت پر روشنی ڈالی۔ اسکول برائے فنون و سماجی علوم کی ڈین پروفیسر فریدہ صدیقی، کنوینر کانگریس نے کانگریس کی غرض و غایت اور اس کے عنوان 'جنوبی ایشیا میں سماجی علوم' کا جامع مگر مختصر تعارف پیش کیا۔ ان کے علاوہ دیگر مقررین میں پروفیسر شاداں زیب خان، سکریٹری سنٹرل وقف کونسل نئی دہلی نے بھی خطاب کیا۔ افتتاحی پروگرام کے مہمانِ خصوصی پروفیسر محمد مزمل، سابق وائس چانسلر، ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی آگرہ نے اپنے قیمتی کلمات سے

نوازا۔ پروفیسر ایس کے اشتیاق احمد، رجسٹرار، مانو نے اپنی شرکت سے پروگرام کو زینت بخشی۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین، صدر شعبۂ تعلیماتِ نسواں و کوآرڈینیٹر کانگریس نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 3 فروری 2022

شہزادی نیلوفر پر خصوصی لیکچر

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ہارون خان شیروانی سنٹر فار دکن اسٹڈیز کے زیر اہتمام 2 فروری کو ایک آن لائن خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر بتول بشاران، پروفیسر تاریخ و کوآرڈینیٹر خواتین، جنس، اور مطالعۂ جنسیت، سینٹ میریز کالج آف میری لینڈ امریکہ نے آن لائن لیکچر پیش کیا۔ اس میں انھوں نے شہزادی نیلوفر کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ لیکچر کی صدارت پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے کی۔ یہ لیکچر پروفیسر بتول بشاران کی تحقیق کا حصہ تھا۔ پروفیسر بتول نے بتایا کہ جب شہزادی نیلوفر 7 سال کی تھیں تو سلطنت عثمانیہ کا باضابطہ طور پر زوال ہو چکا تھا۔ شہزادی کو 1924 میں استنبول چھوڑ کر اپنی والدہ کے ساتھ فرانس منتقل ہونا پڑا جہاں انھوں نے اردو کے ساتھ فرانسیسی زبان پڑھنی اور لکھنی بھی سیکھی۔ 1931 میں نیس، فرانس، میں شہزادی نیلوفر کی شادی نظام دکن میر عثمان علی خان کے چھوٹے شہزادے معظم جاہ سے ہوئی۔ اس طرح حیدرآباد کے ساتھ ان کے رشتے کا آغاز ہوا۔ یہاں قیام کے دوران انھوں نے سماجی مخیر خاتون کا کردار ادا کیا۔ پروفیسر بتول بشاران کے مطابق 1923 اور 1948 کے درمیان، نیلوفر ایک فیشن کی علامت بن گئی تھیں۔ ان کے ذریعے دنیا حیدرآباد سے روشناس ہوئی۔ ان کی ساڑیاں، زیورات کا انتخاب، ان کا طرزِ زندگی پوری دنیا میں موضوعِ بحث بن گیا تھا۔ ان کا شمار دنیا کی دس خوبصورت ترین خواتین میں ہوتا تھا۔ شہزادی نیلوفر کے حسن کا پرتو ان کی فلاحی خدمات میں نظر آتا ہے۔ ان کا سماجی خدمت کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا، خواتین اور بچوں کی صحت کے مسائل کے تدارک کی کوششیں، اس مقصد کے لیے ویمن اینڈ چلڈرن میڈیکل ایڈ ایسوسی ایشن کا آغاز، جس نے بعد میں مشہور زمانہ نیلوفر اسپتال کی شکل اختیار کر لی نے انھیں لازوال شہرت اور عزت دلائی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 فروری 2022

کرناٹک

مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور فن

میسور: 20 جنوری 2022 کو کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی میسور کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ایک روزہ قومی ویبینار بعنوان 'مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور فن' کا کامیاب انعقاد ہوا جس کی صدارت یونیورسٹی کے عزت مآب وائس چانسلر پروفیسر ودیا شنکر نے کی۔ مہمانوں کا استقبال

شعبۂ اردو کے انچارج چیرمین پروفیسر راما ناتھم نائیڈو نے کیا۔ شعبۂ اردو کی سابقہ صدر و پروفیسر جہاں آرا بیگم نے شعبۂ اردو اور موضوعِ ویبینار پر اپنے خیالات پیش کیے۔ ڈاکٹر زبیر شاداب خان، ڈپٹی ڈائریکٹر سی پی ڈی یو ٹی (اردو اکادمی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ مولانا آزاد کی شخصیت کے نمایاں پہلو پیش کیے اور ان کی خدمات کا احاطہ کیا اور کہا کہ مولانا آزاد ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔

صدارتی خطاب عزت مآب شیخ الجامعہ پروفیسر ودیا شنکر صاحب نے کیا اور مولانا آزاد کی جملہ خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آپ ایک سچے محبِ وطن تھے کئی بار دیش کے لیے جیل گئے، آزاد ہند کے پہلے وزیر تعلیم کے طور پر آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

اس نشست میں پروفیسر کامیلے اشوک ڈین اکادمک بھی شامل رہے شکریہ کے ساتھ اس افتتاحی تقریب کا اختتام ہوا۔ اس کے فوراً بعد پروفیسر رفعت النساء بیگم سابق صدر شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی کی صدارت میں مقالے پڑھے گئے جن میں ڈاکٹر شکیلہ بیگم گوری خان، ڈاکٹر ذبیح اللہ، ڈاکٹر حافظ عمران احمد، عرشیہ فردوس، رضیہ بیگم، مومن پاشاہ، فاطمہ زہرا، مہر افروز کاٹھیواڑی وغیرہ شامل تھے۔ دوسری ٹیکنیکل نشست کی صدارت مدراس یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو، پروفیسر سید سجاد حسین نے کی۔ اس نشست میں ڈاکٹر یاسمین فاطمہ، خوشتری بیگم، ڈاکٹر طیب خرادی، ڈاکٹر نجمہ سلطانہ، ڈاکٹر تمیم احمد نے مقالے پیش کیے۔ تیسری ٹیکنیکل نشست کی صدارت سری شنکر اچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر عطاء اللہ خان سنجری نے کی۔ اس نشست میں ڈاکٹر عتیق الرحمٰن، ڈاکٹر نصیر النساء، ڈاکٹر خدیجہ تسنیم، زرینہ عبدالقادر شیخ، ڈاکٹر زاہدہ خانم دمام سعودی عربیہ، ڈاکٹر اعجاز لطیف اور سجاد احمد نے مقالے پیش کیے۔

اس ویبنار میں مولانا آزاد کی شخصیت اور فن پر کل 20 مقالے پیش کیے گئے۔ خاص بات یہ رہی کہ یونیورسٹی کے اساتذہ و ریسرچ اسکالر، ڈگری کالج، پی یو کالج، ہائی اسکول و پرائمری اسکول کے اساتذہ بھی مقالہ نگاروں میں شامل تھے۔ سبھی مقالے بڑی محنت سے تیار کیے گئے اور صدور حضرات نے سبھی مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کی۔

پریس ریلیز: تنویر احمد خلیل، کرناٹک، 22 جنوری 2022

اعزاز و اکرام

سیفی سرونجی

نئی دہلی: اس سال 'چھبیسویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ، دوحہ قطر 2022' جیوری کی میٹنگ کووڈ کی وجہ سے

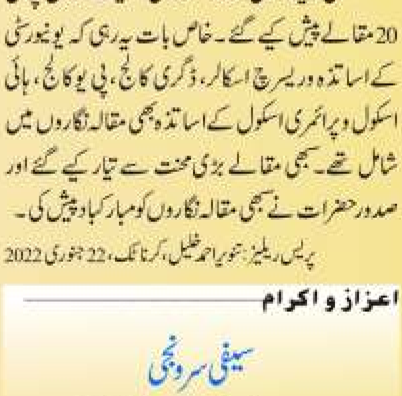

آن لائن منعقد ہوئی جس میں اردو کے معروف نقاد، محقق، شاعر، ادیب و صحافی سیفی سرونجی کو یہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا جو ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے۔ میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے جیوری کے چیئرمین پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان و ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں جیوری کی متفقہ رائے کی بنیاد پر اس سال کے ایوارڈ کے لیے سیفی سرونجی کے نام کا فیصلہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر سیفی سرونجی سرونج کے ایک گاؤں مہوا کھیڑا میں 28 اپریل 1952 میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے ادبی سفر کی شروعات ایک بیڑی مزدور کے طور پر کی۔ ان کی اب تک سیکڑوں غزلیں اور مضامین، آٹھ شعری مجموعے، دیگر سوانح، سفرنامہ، افسانے، انشائیے، ناول، تحقیقی و تنقیدی مضامین اور فن و شخصیت پر مشتمل 75 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ سیفی سرونجی پچھلے چالیس برسوں سے پابندی کے ساتھ مشہور اردو رسالہ سہ ماہی 'انتساب عالمی' شائع کر رہے ہیں جس کے دو درجن سے زیادہ ضخیم خصوصی نمبر شائع ہو کر ادبی دنیا میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ساتھ ہی پچھلے چھ برسوں سے رسالہ ماہنامہ 'عالمی زبان' بھی شائع کر رہے ہیں۔ مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کا یہ پروقار ادبی ایوارڈ ہر سال ایک ہندستانی اور ایک پاکستانی ادیب کو دیا جاتا ہے۔ ہندستانی ایوارڈ یافتگان میں آل احمد سرور، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، کالی داس گپتا رضا، گوپی چند نارنگ، جوگیندر پال، سریندر پرکاش، نثار احمد فاروقی، سیدہ جعفر، جاوید اختر، صلاح الدین پرویز، عبدالصمد، گلزار، رتن سنگھ، شموئل احمد، مشرف عالم ذوقی، نند کشور وکرم، سید محمد اشرف، ف س اعجاز، نورالحسنین اور شمیم حنفی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

پینل آف ججز کا آن لائن اجلاس جیوری کے چیئرمین اور اردو کے ممتاز نقاد و دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اراکین جیوری میں پروفیسر شافع قدوائی، جناب شین کاف نظام، ڈاکٹر عبدالنصیب خاں اور جناب ماہر منصور شامل تھے جبکہ کوآرڈینیٹر کفایت دہلوی اور محمد موسیٰ رضا بھی موجود تھے۔ ایوارڈ کا فیصلہ اتفاق رائے سے کیا گیا۔ مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے پیٹرنس کے سرپرست اردو کے فعال خدمت گزار جناب محمد عتیق صاحب ہیں۔ یہ ایوارڈ بانی مجلس جناب مصیب الرحمٰن نے شروع کیا تھا تب سے اب تک 25 ادیبوں کو اس ایوارڈ سے سرفراز کیا جا چکا ہے۔

پریس ریلیز: موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 7 فروری 2022

ڈاکٹر انیس صدیقی

گلبرگہ: گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ کے زیر اہتمام ایک پرشکوہ تقریب میں اردو کے ادیب و محقق ڈاکٹر انیس صدیقی کو ان کی کتاب 'اشارات صحافت' کے لیے پرسارنگا کا

راجیہ اتسو ایوارڈ، پروفیسر بی کے تلسی مالا، وائس چانسلر، کرناٹک اسٹیٹ اکا مہادیوی ویمنس یونیورسٹی، وجے پور نے تفویض کیا۔ ڈاکٹر صدیقی متعدد تحقیقی و تنقیدی کتابوں کے مؤلف ہیں اور اشارات صحافت ان کی تازہ تالیف ہے، جس پر انھیں اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر انیس صدیقی، گلبرگہ، 25 جنوری 2022

عالمی یونانی میڈیسن ڈے ایوارڈ

نئی دہلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے قومی صدر پروفیسر مشتاق احمد نے تنظیم کی ایوارڈ کمیٹی کی سفارشات پر عالمی یونانی میڈیسن ڈے ایوارڈ 2022 کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ مذکورہ ایوارڈ 3 حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں اکیڈمک اور ریسرچ، دوسرے حصے میں صوبائی میڈیکل آفیسرز اور یونانی پریکٹشنرز، تیسرے حصے میں دیسی (یونانی، آیورویدک) دواساز اداروں کو شامل کیا گیا ہے۔ تنظیم ہذا نے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے یوم پیدائش کی مناسبت سے 2011 سے عالمی یونانی میڈیسن ڈے کے اہتمام کا آغاز کیا۔ ملک بھر سے منتخب ایوارڈ یافتگان میں پروفیسر تسنیم فاطمہ (پرووائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ) کو پروفیسر محمد شفیع علیگ انٹرنیشنل ایوارڈ، ڈاکٹر آفتاب احمد (میڈیسن ڈپارٹمنٹ، جامعہ ہمدرد) کو ڈاکٹر اے یو اعظمی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، پروفیسر ونود چتیا (نوڈل آفیسر کووڈ 19، میڈیسن ڈپارٹمنٹ، صفدر جنگ ہاسپٹل) کو حکیم اجمل خان انٹرنیشنل ایوارڈ، ڈاکٹر محمد ذاکر (حیدرآباد) کو حکیم صیانت اللہ امروہوی ایوارڈ، ڈاکٹر محمد افصح الکلام (سرینگر) کو حکیم علامہ کبیرالدین انٹرنیشنل ایوارڈ، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن (بھوپال) کو حکیم عبدالحمید انٹرنیشنل ایوارڈ، پروفیسر بی ڈی خان (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کو حکیم عبداللطیف فلفی انٹرنیشنل ایوارڈ، پروفیسر ضمیر احمد (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کو ابن سینا انٹرنیشنل ایوارڈ، ڈاکٹر عبدالرحیم (انچارج، یونانی میڈیکل سنٹر، ڈاکٹر آر ایم ایل

ہاسپٹل، نئی دہلی) کو حکیم عبدالرزاق انٹرنیشنل نیشنل ایوارڈ، ڈاکٹر شبیر احمد (صدر شعبہ تشریح البدن، آیورویدا اینڈ یونانی طبیہ کالج، نئی دہلی) کو حکیم الیاس خاں شروانی انٹرنیشنل ایوارڈ، ڈاکٹر آر پی سنگھ (نئی دہلی) کو حکیم رام لبھایا انٹرنیشنل ایوارڈ، ڈاکٹر وی حبیب اللہ (چنئی) کو حکیم ابوالقاسم زہراوی انٹرنیشنل ایوارڈ کے لیے شامل ہیں۔

اس کے علاوہ حکیم اجمل خاں سپر اسٹار ایوارڈ کے لیے ڈاکٹر طیب انجم (دیوبند)، ڈاکٹر ایس ایم یعقوب (ناگپور)، ڈاکٹر لائق علی خان (کاس گنج)، ڈاکٹر سیف الابرار وانی (سرینگر)، ڈاکٹر شعیب سی ایچ (ملاپورم)، ڈاکٹر لقمان ایم اے (ارناکولم)، ڈاکٹر ڈی آر سنگھ (دہلی)، ڈاکٹر ندیم عثمانی (بھیونڈی)، ڈاکٹر محمد ارشد غیاث (میوات)، ڈاکٹر یاسر قریشی (احمد آباد)، ڈاکٹر روبینہ انصاری (رائے پور)، ڈاکٹر خبیب احمد (مئو)، ڈاکٹر اعزاز علی قادری (لکھنؤ)، ڈاکٹر شوکت علی انصاری (جے پور)، ڈاکٹر محمد روشن (اجمیر)، ڈاکٹر سلمان خالد (لکھنؤ)، ڈاکٹر شجاع الدین احمد (لکھنؤ)، ڈاکٹر سنجے دھینگر (نئی دہلی)، ڈاکٹر محمد عبدالسلام خاں (رامپور)، حکیم عطاء الرحمٰن اجملی (دہلی)، حکیم مرزا صفی اللہ بیگ (حیدرآباد) شامل ہیں۔ جبکہ فارمیسی کے لیے ہرماس یونانی فارماسیوٹیکل (کیرلا)، نیچر اینڈ نرچر (دہلی)، نیورائل پروڈکٹس (دہلی)، الوطن ہربلس (حیدرآباد)، دین دیال انڈسٹریز (گوالیار) کو بہترین دیسی دوا بنانے کے لیے حکیم اجمل خاں فارمیسی ایوارڈ سے سرفراز کیا جائے گا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 جنوری 2022

رسم اجرا

اساس فکر

لکھنؤ: مومن ساہتیہ ادب سبھا اور بزم بقائے ادب کے زیر اہتمام معروف و پختہ کار شاعر، مبصر و ناظم رحمت لکھنوی کی اول شعری تصنیف 'اساس فکر' کی رسم رونمائی ہوٹل میزبان انٹرنیشنل (لاٹوش روڈ) پر ہوئی۔ فریضۂ صدارت ممتاز افسانہ نگار و صحافی احمد ابراہیم علوی نے انجام دیتے ہوئے کہا کہ بڑی عظمت وہی ہے جو رحمت لکھنوی نے قلمی کاوشوں سے حاصل کرلی ہے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیئرمین سید اطہر صغیر زیدی نے نہ صرف شرکت کی بلکہ اردو کی ترقی و بقا میں اپنی ہر طرح کی شمولیت کا وعدہ کیا۔ نظامت شاعر و صحافی رضوان فاروقی نے کرتے ہوئے شاعر کی شعری صلاحیتوں کے ساتھ ان کی انسانی صفات کا ذکر خوبصورت پیرائے میں کیا، نیز اشعار کا انتخاب پیش کیا۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے مختلف شخصیات نے شرکت کی۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر واصف فاروقی نے کہا کہ مشاعروں کے حوالے سے میری شہرت زیادہ ہوسکتی ہے مگر شاعری رحمت لکھنوی نے زیادہ متاثر کن کی ہے۔ پروفیسر صابرہ حبیب نے فرمایا کہ رحمت کی شاعری میں علم و حکمت کے موتیوں کی تلاش فضول نہیں ہے۔ ہر غزل میں کوئی نہ کوئی شعر ایسا ضرور ہے جو دل کو چھو لیتا ہے۔ درگاہ شاہ عبدالرحمٰن (تیرگاؤں) کے سجادہ نشین صوفی سید اظہار علی نے کہا کہ زبان کا رچاؤ اور شعر کہنے کا خصوصی شعور رحمت لکھنوی کو منفرد بنا دیتا ہے۔ چودھری شرف الدین نے شاعر کے تیور، انداز اور لہجے کے بانکپن کی داد دی۔ صحافی و ادیب غفران نسیم نے پرمغز مقالہ پڑھا۔ شاعر کی مذہبی فکر اور ستھرے انداز کی تعریف کی۔ ڈاکٹر پروین شجاعت نے اپنے مقالے میں کہا کہ شاعر نے لکھنوی روایات کو مزید استحکام و اعتبار عطا کیا۔ معروف قلم کار خلیل احسن نے رحمت رسول اور احسان دانش کی زندگی میں مماثلت بتائی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 جنوری 2022

قطوف الہند

نئی دهلی: عالمی تخلیقی تنظیم برائے امن، لندن، (شاخ ہندوستان) نے ایکسیلنس اکیڈمی، ہندوستان کے تعاون سے عراق کی مشہور ناول نگار ڈاکٹر وفا عبدالرزاق کی صدارت میں 'ادب، تخلیق اور سماج' کے موضوع پر ایک روزہ بین الاقوامی ورچوئل سیمینار منعقد کیا، جس میں لیبیا، مصر، الجزائر، تیونس سمیت ہندوستان کے عربی زبان وادب کے تخلیق کار، ناول و افسانہ نگار اساتذہ، ریسرچ اسکالرس او رطلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ اپنے صدارتی کلمات میں ڈاکٹر وفا عبدالرزاق نے تمام شرکا کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ ادب کا رشتہ سماج سے بہت گہرا ہوتا ہے، سماج اور اس کے مسائل سے منہ موڑ کر کوئی بھی ادب مکمل نہیں ہوتا، آن لائن ادبی عربی مجلّہ 'قطوف الہند' کے اجرا پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی ادبی وصحافتی تاریخ میں یہ ایک انقلابی مجلّہ ہوگا، اور انھوں نے اس کے لیے مجلّہ کے مدیر اور تمام تخلیق کاروں کو مبارکباد پیش کی۔ سہ ماہی آن لائن عربی ادبی مجلّہ 'قطوف الہند' کا تعارف اور اس کے مقصد پر گفتگو کرتے ہوئے مجلّہ کے مدیر اور جے این یو شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن نے کہا کہ یہ مجلّہ اپنی نوعیت کا ہندوستان میں پہلا تخلیقی ادبی مجلّہ ہے، جس میں اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبا کی ادبی تخلیقات جیسے افسانہ، کہانی، ڈراما اور اشعار شائع ہوں گے، اس کے علاوہ اس میں ہندوستانی ادب کے شہ پاروں کے عربی ترجموں کو بھی جگہ ملے گی۔ مہمان خصوصی کے طور پر مشہور ناول نگار اور سوربون یونیورسٹی، فرانس کے پروفیسر ڈاکٹر واسنی اعرج شریک ہوئے، مجلّے کا اجرا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج کی دنیا میں ایسے ادب کی سخت ضرورت ہے جس میں انسانیت، بھائی چارہ، پرامن بقائے باہم جیسے حساس موضوع کو جگہ دی جائے۔ اس پروگرام میں شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ثناء اللہ ندوی، لیبیا کے مشہور ناقد و ناول نگار ڈاکٹر احمد ہادی رشراش، الجزائر کے ناول نگار ڈاکٹر یامین قومی، مصر کے صحافی، ناول نگار ادیب محمد برکہ، جے این یو شعبۂ عربی کے استاد ڈاکٹر محمد قطب الدین و ڈاکٹر محمد اجمل خصوصی طور پر شریک ہوئے اور 'قطوف الہند' کے تئیں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور ہر ممکن تعاون کا وعدہ کیا۔ پروگرام کے اخیر میں ایکسیلنس اکیڈمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد صابر نواس نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 جنوری 2022

لائبریری کی تاریخ اور بین الاقوامی لائبریریاں

ناگپور: انجمن گرلز ڈگری کالج کی لائبریرین محترمہ ڈاکٹر روحینہ سید کی تصنیف 'لائبریری کی تاریخ اور بین الاقوامی لائبریریاں' کا اجرا انجمن حامیِ اسلام کے اکیڈمک ایڈوائزر

جناب حفظ الرحمٰن صاحب کے ہاتھوں گذشتہ دنوں عمل میں آیا۔ یہ کتاب نیشنل کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے الفاظ پبلی کیشن کامٹی نے شائع کی ہے۔ سادہ اور پروقار تقریب اجرا کے موقعے پر معروف ادیب اور اسکالر ڈاکٹر اظہر حیات بہ حیثیت مہمان خصوصی موجود تھے۔ موصوف نے کتاب کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی اور کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر روحینہ سید کو مبارکباد دی۔ جناب حفظ الرحمٰن نے کتاب کو لائبریری سائنس میں کیریئر بنانے والے طلبا کے لیے مفید قرار دیا۔ اس موقعے پر کالج کی پرنسپل ڈاکٹر ناہید سوری، انجینئر فیض احمد اور انجمن آئی ٹی آئی کے پرنسپل جناب رشید بھی موجود تھے۔ تقریب کے اختتام پر مصنفہ نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: روحینہ خان، ناگپور، 13 جنوری 2022

ڈاکٹر محمد ناصر علی امینی: شخصیت و خدمات

کولکاتا: شہر نشاط کولکاتا گذشتہ دنوں حاجی نگر (جو مضافاتی علاقہ ہے) میں 'ڈاکٹر محمد ناصر علی امینی: شخصیت و خدمات' کی رسم رونمائی ہوئی۔ حاجی نگر شہر نشاط کولکاتا سے تقریباً 50 کیلومیٹر دور مضافاتی علاقہ ہے۔ جہاں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد ہے۔ اس سرزمین پر ایک گراں قدر علمی وادبی شخصیت نے جنم لیا جنھیں ڈاکٹر ناصر علی امینی کے نام سے دنیا جانتی ہے۔ گذشتہ 2021 میں ان کا انتقال ہوا۔ ڈاکٹر وحید الحق صاحب نے ناصر علی امینی صاحب کی شخصیت، حیات اور خدمات پر مشتمل ایک کتاب ترتیب دی ہے جس کا نام 'ڈاکٹر محمد ناصر علی امینی: شخصیت وخدمات' ہے۔ مورخہ 9 جنوری 2022 کو اس کی شاندار رسم اجرا بدست جاوید احمد خان (ایم-ایل-اے) رادھا رانی بالیکا ودیالیہ حاجی نگر میں انجام پائی۔

پریس ریلیز: مظفر نازنین، 24 جنوری 2022

گوہر نایاب

ہری دوار: معہد القرآن الکریم حسنہ والا ہری دوار میں اردو زبان وادب کے بے لوث خادم منشی عبدالغفور مرحوم ناظم مدرسہ انوار القرآن نعت پور کی کتاب گوہر نایاب شرح اردو زبان کی چوتھی کتاب کا اجرا مفتی راشد اعظمی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مفتی راشد نے منشی جی کی اس تالیف کو اردو زبان کا اہم علمی کارنامہ قرار دیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر سید اسد رضا نے منشی جی کی اس کاوش کو سراہا اور اس تالیف پر منشی جی مرحوم اور آپ کے پسماندگان بالخصوص مولانا عبدالخالق ندوی کو مبارکباد پیش کی۔ پروگرام کا اختتام صدر جلسہ مولانا ریاض احمد مظاہری کی دعا پر ہوا۔ خطبۂ استقبالیہ معہد کے رفیق مولانا فیضان الحق نے پیش کیا۔ نظامت مولانا ڈاکٹر محمد فرحان قاسمی علیگ نے کی۔ اخیر میں پروگرام کے کنوینر مولانا عبدالخالق ندوی مدیر معہد القرآن الکریم حسنہ والا نے تمام مہمانان کرام کا شکریہ ادا کیا اور منشی جی سے اپنے نسبتی تعلق اور مادر علمی سے دلی وابستگی کا اظہار کیا۔ پروگرام میں کثیر تعداد میں علما وطلبہ کے علاوہ عوام الناس نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 جنوری 2022

اجالے ان کی یادوں کے

مراد آباد: جیمنی ساہتیہ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ٹاؤن ہال میں کتاب 'اجالے ان کی یادوں کے' کا اجرا کیا گیا۔ کتاب کے مصنف اور سماجی کارکن ڈاکٹر محمد جاوید نے بتایا کہ یہ کتاب ان کے والد ماسٹر ننھے حسین کی زندگی پر مبنی ہے جنھوں نے نامساعد حالات اور دیہی ماحول میں رہ کر نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ اپنی پوری زندگی تعلیم کی ترقی کے لیے وقف کردی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں چھ اسکول قائم کیے جن میں سے تین سرکاری اور تین پرائیویٹ ہیں۔ یہ کتاب ہمیشہ نئی نسل کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرائے گی اور حصول تعلیم کی ترغیب دیتی رہے گی۔ ڈاکٹر محمد جاوید نے بتایا کہ ان کے والد ماسٹر ننھے حسین 17 نومبر 2020 کو 86 سال کی عمر میں عارضہ قلب کے باعث انتقال کر گئے، ان کی پوری زندگی اس کتاب میں ایک یادداشت کے طور پر لکھی گئی ہے تاکہ نوجوانوں کو ان کی زندگی سے نئی سمت اور تحریک ملتی رہے۔ ادیب، ڈاکٹر وشواوتار جیمنی نے کہا کہ ماسٹر ننھے حسین تعلیم سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت، شائستگی اور تہذیب کا عظیم امتزاج تھے۔ ڈاکٹر منوج رستوگی نے کہا کہ سماج کو سمت دینے والے لوگوں کی زندگی کو کتابی شکل میں مرتب کرنا بہت ضروری ہے، جو ڈاکٹر جاوید نے کیا ہے۔ ڈاکٹر جگ ویر سنگھ نے کتاب کے کچھ اقتباسات بھی پڑھ کر سنائے۔ کتاب کا اجرا سی ایم او ڈاکٹر ایم سی گرگ، ڈی ٹی او ڈاکٹر این کے کوربیجا، ڈی ایس او ڈاکٹر پروین شریواستو، ڈاکٹر رام کشور سنگھ، نائب امام شہر مفتی سید فہد علی، سردار گروبندر سنگھ، دھیر شانت داس، پادری پال سارسوت، پادری ڈینیل مسیح، ڈاکٹر کاویہ سوربھ رستوگی نے کیا۔ اس موقعے پر گجیندر سنگھ، منوج پراشر، شانتو پانڈے، انوج شرما، نرمل پانڈے موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 جنوری 2022

انسانیت کا پیکر: گلشن کھنہ

سرونج: ہر سال انتساب پبلی کیشنز کے زیر اہتمام گلشن کھنہ کی یاد میں پروگرام کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس بار 6 جنوری کو ان کی تیسری برسی کے موقعے پر سیفی لائبریری میں ڈاکٹر سیفی سرونجی کی کتاب 'انسانیت کا پیکر: گلشن کھنہ' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت بھوپال کے مشہور شاعر ظفر صہبائی نے فرمائی اور مہمان خصوصی کے طور پر اقبال مسعود، ڈاکٹر اعظم اور پروین صبا نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ظفر سرونجی نے بخوبی انجام دیے۔ صدر محترم ظفر صہبائی نے سیفی سرونجی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ''سیفی سرونجی اپنے سے محبت کرنے والوں کو، اردو سے محبت کرنے والوں کو ہمیشہ یاد کرتے رہتے ہیں، جن میں گلشن کھنہ بھی شامل ہیں۔'' اقبال مسعود نے کہا کہ ''گلشن کھنہ کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں انگریزی، اردو، ہندی اور پنجابی میں ہیں۔ سب سے زیادہ مبارکباد کے مستحق سیفی سرونجی ہیں۔'' سیفی سرونجی نے اپنی کتاب کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''اس کتاب میں گلشن کھنہ پر مضامین، نظمیں، غزلیں اور ان کی کئی یادگار تصاویر شامل ہیں۔ یہ ہم نے عہد کیا ہے کہ ہم ہر سال گلشن کھنہ کی یاد کو اس طرح زندہ رکھیں گے۔'' اس کے بعد شعرا نے کھنہ صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 جنوری 2022

پروفیسر احمد شاندار کے انگریزی غزلیہ مجموعے کا اجرا

نئی دہلی: پروفیسر احمد شاندار بنیادی طور پر بایو انفارمیٹکس کے ایک ممتاز سائنس داں ہیں۔ اس میدان میں ان کے

چار ہزار سائٹیشن ان کا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ شعر وادب، موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کے علاوہ مختلف علوم وفنون سے بے پناہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مستقبل کی دنیا میں شعر وادب کے امکانات روشن ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر احمد شاندار کی انگریزی غزلوں کے مجموعے کا اجرا کرتے ہوئے عہد حاضر کے ممتاز شاعر پروفیسر شہپر رسول نے کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر احمد شاندار کی رہائش گاہ لوٹس اسپیا نوئیڈا میں شعری نشست کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں صدر محفل پروفیسر شہپر رسول کے علاوہ پروفیسر احمد شاندار، ڈاکٹر عبدالنصیب نصیب خان، معین شاداب، ڈاکٹر رحمان مصور، ڈاکٹر خالد مبشر اور سفیر صدیقی نے اپنا کلام پیش کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 6 جنوری 2022

کشکول اردو ادب

کٹک: 30 جنوری 2022 بروز اتوار بوقت صبح 10 بجے رابطۂ مدارس اسلامیہ اڈیشا کے اجلاس عام سونگڑہ ضلع کٹک

میں مولانا محمد فاروق صاحب قاسمی (امیر شریعت اڈیشا، صدر رابطۂ مدارس)، مولانا ارشد صاحب قاسمی (صدر جمعیۃ علماء اڈیشا)، مفتی نقیب الامین صاحب قاسمی (جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء اڈیشا، مہتمم جامعہ مرکز العلوم سونگڑہ) ان برگزیدہ شخصیات کے ہاتھوں مولانا محمد مطیع اللہ نازش کی 384 صفحات پر مشتمل 'کشکول اردو ادب' کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ کتاب مولانا موصوف کی چھٹی ادبی تخلیق و تصنیف ہے۔ 'عکس بصیرت، اڈیشا میں اردو نثر نگاری اور کشکول اردو ادب خالص ادبی تخلیق ہے۔

پریس ریلیز: مولانا محمد مطیع اللہ نازش، 1 فروری 2022

نامے

میرٹھ: ''خطوط ہماری زندگی کی اس خوبصورتی کو پیش کرتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتی۔ خط کس کو لکھا جائے یا بھیجا جائے، ان میں دونوں کی شخصیت نظر آتی ہے۔ اس سلسلے کی یہ کتاب 'نامے' نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف ادیب و نقاد پروفیسر شارب رودولوی، لکھنؤ کے

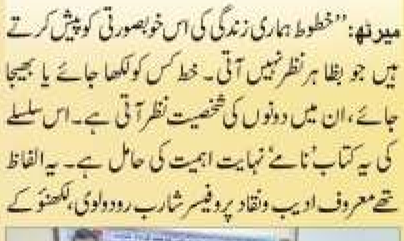

جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیر اہتمام 4 فروری 2022 کو منعقد پروفیسر اسلم جمشید پوری کی نئی کتاب 'نامے' کے اجرا کے پروگرام میں اپنی صدارتی تقریر میں آن لائن ادا کر رہے تھے۔ اس سے قبل پروگرام کا آغاز ایم اے کی طالبہ عظمیٰ پروین نے کیا۔ بعد ازاں سعید احمد سہارنپوری نے مرزا غالب کی غزل اپنی مترنم آواز میں پیش کی۔ اس ادب نما پروگرام کی سرپرستی معروف ادیب عارف نقوی جرمنی نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کے بطور نائب شیخ الجامعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ پروفیسر وائی وملا نے آن لائن شرکت کی۔ مقررین کے بطور پروفیسر صغیر افراہیم علی گڑھ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد سے صدر شعبۂ اردو پروفیسر فاروق بخشی، پٹنہ سے صفدر امام قادری گیا، بہار سے ڈاکٹر احمد صغیر اور کشمیر سے ڈاکٹر ریاض توحیدی شریک رہے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر آصف علی نے انجام دی۔

پریس ریلیز: محمد شمشاد، میرٹھ، 4 فروری 2022

وفیات

لتا منگیشکر

ممبئی: لجنڈ گلوکارہ لتا منگیشکر کا 6 فروری کی صبح ممبئی کے پرائیویٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 92 سال کی

تھیں۔ 8 فروری کی شام میں ہی ممبئی کے شیواجی پارک میں پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ آخری رسوم ادا کی گئی۔ ان کی میت کو ترنگے سے لپیٹا گیا اور مسلح افواج کے جوانوں نے آخری سلامی دی۔ آخری رسوم میں وزیر اعظم مودی بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ کرکٹر سچن تینڈولکر، بالی ووڈ کے کنگ شاہ رخ خان سمیت تمام مشہور شخصیات نے بھی آخری رسومات میں شرکت کی۔ عظیم گلوکارہ کی آخری رسوم دیکھنے کے لیے لوگ دوپہر ایک بجے سے ہی پارک پہنچنا شروع ہوگئے تھے۔ قابل ذکر ہے کہ گذشتہ کل لتا منگیشکر کی حالت بگڑ گئی تھی جس کے بعد انھیں وینٹی لیٹر پر منتقل کیا گیا تھا۔ گلوکارہ کو کورونا وائرس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے 9 جنوری کو ممبئی کے بریچ کینڈی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں وہ زیر علاج تھیں۔ لتا منگیشکر جنوری میں نمونیہ سے صحت یاب ہوئی تھیں، گلوکارہ کا علاج کرنے والے ڈاکٹر پریت صمدانی نے ان کی موت کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ لتا دیدی کی حالت بگڑنے کے باعث انھیں کل ایک بار پھر وینٹی لیٹر پر منتقل کیا گیا تھا لیکن کورونا سے جنگ جیتنے اور کورونا منفی ہونے کے بعد وہ زندگی کی جنگ ہار گئیں۔ لتا منگیشکر کے انتقال سے ملک اور دنیا بھر میں سوگ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ صدر رام ناتھ کووند نائب صدر ایم وینکیا نائیڈو، وزیر اعظم نریندر مودی اور کانگریس رہنما سونیا گاندھی، راہل گاندھی سمیت مختلف ریاستوں کے گورنر، وزرائے اعلیٰ اور سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں نے لتا منگیشکر کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کیا۔ مسٹر کووند نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ ''لتا جی کا انتقال میرے لیے بھی ویسے ہی دل دہلا دینے والا ہے، جیسا کہ دنیا بھر کے لاکھوں لوگوں کے لیے ہے۔ انھوں نے ایک دوسرے ٹویٹ میں کہا کہ ایک ایسے فنکار کی پیدائش صدیوں میں ہوتی ہے۔ لتا دیدی ایک غیر معمولی انسان تھیں، وہ ہمیشہ گرم جوشی سے ملتی تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 فروری 2022

فیاض رفعت

لکھنؤ: اردو کے ممتاز افسانہ نگار، دوردرشن پٹنہ کے سابق ڈائرکٹر 82 سالہ فیاض رفعت کا 8 فروری 2022 کو انتقال ہوگیا۔ وہ پروسٹیٹ کینسر میں مبتلا تھے۔ تکلیف بڑھنے پر انھیں اسپتال لے جایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کا

اصل نام فیاض محمد خاں تھا، شروعاتی دور میں انھوں نے اسی نام سے لکھا۔ ان کی پہلی کہانی 'بوالہوس' میگزین 'للکار' میں شائع ہوئی۔ بعد میں انھوں نے اپنا قلمی نام فیاض رفعت رکھ لیا اور فیاض رفعت کے نام سے ان کی پہلی کہانی 'قاتل' شائع ہوئی۔ فیاض رفعت دوردرشن لکھنؤ کے ڈائرکٹر اور روزنامہ 'اودھ نامہ' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ فیاض رفعت کی کتابوں میں بنارس والی گلی، اردو افسانے کا پس منظر، بیتی رتوں کا منظر نامہ، خوابوں کا شہر، زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی، زندہ اپنی باتوں میں، سامان خیال، میرے حصے کا زہر، نئے عہد نامے کی سوغات، نقد آگہی (عصری ادب کے حوالے سے)، ہزار راتیں کے علاوہ ان کی مرتبہ کتابوں میں اندرا گاندھی: ایک شخصیت اور دلی جو ایک شہر تھا شامل ہیں۔ فیاض رفعت نے یوں تو تحقیق اور تنقید کے میدان میں بھی کام کیا اور جزوی طور پر شاعری بھی کی لیکن بنیادی طور پر وہ ایک افسانہ نگار تھے۔ روزنامہ ممبئی اردو نیوز، ممبئی میں ندیم صدیقی کی رپورٹ کے مطابق فیاض رفعت 11 نومبر 1940 میں ویل نگر، ضلع اٹاوہ اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علی گڑھ کے گورنمنٹ اسکول سے ہائی اسکول کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور پھر سیاسیات میں آگرہ یونیورسٹی اور ادبیات میں دلی یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن کی اسناد حاصل کیں۔ فیاض رفعت نے کئی پروفیشنل کورس بھی کیے جس میں پرسنل مینجمنٹ، مینجمنٹ اینڈ ایڈمنسٹریشن، بیسک ٹی وی پروڈکشن کورس وغیرہ بھی شامل ہیں۔ علی گڑھ سے شائع ہونے والے ہندی ہفتہ وار 'پراودا' اور 'مارچ آف دی نیشن دہلی' سے بھی فیاض رفعت کی وابستگی رہی ہے۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ فیروزہ خان اور بیٹا فہد خان شامل ہیں۔ محترمہ فیروزہ خان کا نام ممبئی کے پرانے اردو والوں میں انجانا نہیں۔ یہ منترالے ممبئی میں ایک اہم عہدے پر فائز تھیں اور مہاراشٹر گورنمنٹ کے مشہور اردو جریدے 'قومی راج' کی ایک مدت تک ادارت بھی کی۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ / ممبئی اردو نیوز، ممبئی، 9 فروری 2022

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی

نئی دہلی: معروف عالم دین اور اسلامی اسکالر مولانا منظور نعمانی کے بڑے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا 23 جنوری کو دہلی میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 96 برس تھی۔ پسماندگان میں 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔ ان کی تدفین اور نماز جنازہ سنبھل میں ادا کی گئی۔ مولانا ایک ممتاز علمی شخصیت اور کئی اہم اور فکر انگیز کتابوں کے مصنف تھے جن میں 6 جلدوں میں محفل قرآن نام سے ایک شاہکار تفسیر اور

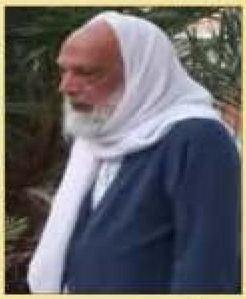

'واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر' بہت مشہور ہیں۔ وہ حضرت مولانا منظور نعمانی کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ مولانا کی تعلیم دار العلوم دیوبند میں ہوئی جہاں انھوں نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے استفادہ کیا۔ 1947 میں فراغت کے بعد رسالہ الفرقان کے طویل عرصے تک ایڈیٹر رہے۔ 1960 کی دہائی میں انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حفیظ نعمانی کے ساتھ ہفت روزہ 'ندائے ملت' نکالا، جس کے سرپرست مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی تھے۔ اسی دور میں مسلم مجلس مشاورت کے قیام میں فعال کردار ادا کیا۔ مولانا سنبھلی کے مضامین نہایت فکر انگیز ہوا کرتے تھے۔ وہ آزادی کے بعد ہندوستان کے اہم اصحاب قلم میں شمار ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے ان کی تحریریں رہنما سمجھی جاتی ہیں۔ 1967 میں برطانیہ منتقل ہوگئے جہاں ان کی علمی خدمات اور مسلمانوں کے مسائل کے تئیں متحرک کردار جاری رہا۔ مولانا اپنے خلوص، سادہ معیار زندگی اور شرافت و وضع داری میں پچھلے زمانوں کی یادگار معلوم ہوتے تھے۔ علالت اور کبرسنی کے عوارض کی وجہ سے وہ کئی سال سے دہلی میں اپنے صاحب زادے مولانا عبیدالرحمٰن سنبھلی کے ساتھ مقیم تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 جنوری 2022

حبیب الرحمان چغتائی

پٹنہ: خدا بخش لائبریری کے سابق ڈائرکٹر حبیب الرحمٰن چغتائی کا 1 فروری کو انتقال ہوگیا۔ وہ کینسر کے مہلک مرض میں مبتلا تھے۔ دہلی میں ان کا علاج چل رہا تھا۔ چغتائی 1996 میں خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر کے عہدے پر متمکن ہوئے تھے۔ اس سے قبل وہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ڈپٹی لائبریرین کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے تھے۔

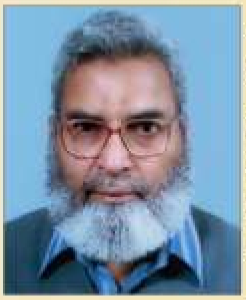

ان کا تعلق گنور سے تھا۔ ان کی کتابوں میں 'زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے' اور 'متاع فکر' قابل ذکر ہیں۔ 'زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے' میں پروفیسر سید بشیر الدین، مولوی محمد عزیز مرزا، یوسف حسین خان، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حکیم عبدالحمید، سید حامد، عطا کاکوی، پروفیسر قیام الدین احمد، ابن فرید، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، سید تقی رحیم، سید مصطفیٰ کمال ہاشمی، رضا مہدی اور نجوم ثلاثہ کے ذیل میں سرسید، خدا بخش اور عبدالحمید پر مضامین ہیں۔ انھوں نے سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی خودنوشت سوانح عمری کا ترجمہ 'پرواز' کے نام سے کیا تھا جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے 2005 میں شائع ہوا۔ انھوں نے خدا بخش لائبریری جرنل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 2 فروری 2022 اور دیگر ذرائع

خالد حامدی فلاحی

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ عربی کے پروفیسر و ایڈیٹر ماہنامہ 'اللہ کی پکار' خالد حامدی 19 جنوری کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ گھر جاتے ہوئے سیڑھی پر اچانک قلب کا شدید حملہ ہوا اور وہ وہیں گر پڑے اور ان کی روح پرواز کر گئی۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز عشا چار مینار مسجد میں ادا کی گئی اور شاہین

باغ قبرستان میں نم آنکھوں کے ساتھ بڑی تعداد میں طلبہ اور اساتذہ کی موجودگی میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کی مشہور کتاب 'تاریخ ادب عربی' ہے۔ حدیث کے موضوع پر انھوں نے پی ایچ ڈی کی تھی جو کئی جلدوں پر محیط ہے۔ وہ گذشتہ سال 2021 کو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ریٹائرڈ ہوئے اور ان کی خدمات تقریباً تین دہائیوں پر مشتمل تھی۔ پابندی کے ساتھ اللہ کی پکار نکالتے رہے۔ مرحوم کو علمی روایت ورثہ میں ملی تھی۔ درس قرآن بھی دیتے تھے۔ ان کی مشہور و معروف کتاب 'علم حدیث میں ہندوستان کی خدمات' ہے جو کہ 6 جلدوں پر مشتمل ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جنوری 2022

حیدر بیابانی

نئی دہلی: 19 جنوری کو آسمان ادب اطفال کا ایک روشن ستارہ بچوں کے شاعر حیدر بیابانی کی شکل میں غروب ہوگیا۔ انھوں نے اپنی ساٹھ سال سے زائد کی ادبی زندگی میں بچوں کے ادب میں گرانقدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ انھوں نے تقریباً پچپن کتابیں بچوں کے ادب میں شائع کیں جن کو پذیرائی حاصل

ہوئی۔ ہندوستان کی مختلف اکادمیوں، تنظیموں نے ان کو اعزاز و اکرام سے نوازا۔ ان کی بہت سی نظمیں نہ صرف ہندوستان کے مختلف صوبوں کے نصاب میں بلکہ پاکستان کے اسکولوں کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ ان پر دو ڈاکیومنٹری فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ اسی سال 8 جنوری کو ان پر ایک طالبہ نے پی ایچ ڈی مکمل کی تھی۔ حیدر بیابانی کے انتقال سے ادب اطفال کی ایک بڑی شخصیت سے لوگ محروم ہوگئے۔ حیدر بیابانی نے بچوں کے لیے کوئی ایسا موضوع نہیں چھوڑا جس پر انھوں نے نظمیں تحریر نہ کی ہوں۔ ادب اطفال میں حیدر بیابانی کے رخصت ہونے سے ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پر ہونا مشکل ہے۔ آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی کے صدر محمد خلیل سائنس داں، نائب صدر فیروز بخت احمد چانسلر مانو، بانی سکریٹری محمد سراج عظیم و دیگر عہدے داران نے ایک تعزیتی نشست میں اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے تعزیتی کلمات پیش کیے اور مغفرت کی دعا کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 20 جنوری 2022

اظہار عثمانی

امروہہ: تقریباً تین سو سے بھی زائد کہانیوں اور بیس کتابوں کے مصنف اظہار عثمانی امروہوی کا 31 جنوری 2022 کو دہلی میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ 73 سالہ مرحوم عثمانی کو عیدگاہ کے نزدیک ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ، ایک

بیٹا جو نیوزی لینڈ میں رہتا ہے، ایک بیٹی جو جنیوا میں ڈاکٹر ہے۔ مرحوم کافی دنوں سے علیل تھے اور دہلی کے جسولا وہار میں رہتے تھے۔ صبح ان کی میت کو یہاں لایا گیا اور تکیہ والی مسجد میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ ان کے انتقال سے اردو ادب کو نا قابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ اب تک ان کے پانچ افسانوی مجموعے، دو سفرنامے ہندوستان ہمارا اور سیر کر کے عنوان سے منظر عام پر آچکے ہیں جب کہ انھوں نے روشن ستارہ کے نام سے سوانح حیات بھی لکھی۔ اس کے علاوہ خون کی کہانی انگریزی سے ترجمہ، رتی ناتھ کی چاچی، سارا آکاش، جھونپڑی پر سورج کا عکس اور فن صنم تراشی ہندی سے انگریزی میں چھپ چکے ہیں۔ انھوں نے مغلیہ فرمان درگاہ خواجہ معین الدین چشتی کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ مرحوم اظہار عثمانی نے دہلی اردو اکادمی کے لیے بھی دلی والے، اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ اور اردو ادب میں پاپولر لٹریچر کا حصہ بھی ترتیب دی تھی۔ مرحوم عثمانی سب سے زیادہ اردو ماہنامہ 'شمع' میں چھپتے تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، یکم فروری 2022

عبدالاحد فرقانی

رامپور: قلم گوید کے خالق اور شہر کی معروف سماجی و ادبی شخصیت عبدالاحد فرقانی کا طویل علالت کے بعد 9 فروری 2022 کو انتقال ہوگیا۔ 70 سالہ سبکدوش اسٹیٹ بینک منیجر عبدالاحد فرقانی نے اپنی شاہ آباد واقع رہائش گاہ پر آخری سانس لی۔ مرحوم ادبی ذوق رکھنے والی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی

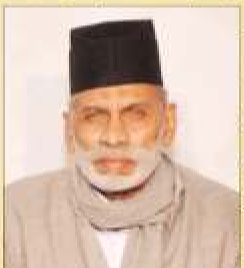

نماز جنازہ رات 10 بجے مزار ٹاٹ شاہ میاں واقع مسجد میں ادا کی گئی۔ بعدہ مزار کے احاطے میں تدفین عمل میں آئی۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں سماجی، ادبی و سیاسی شخصیات موجود رہیں۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ 2 بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ مرحوم عبدالاحد فرقانی نے ابتدائی تعلیم مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ حامد انٹر کالج سے ہائی اسکول و انٹر اور اعلیٰ تعلیم گورنمنٹ رضا پی جی کالج رامپور سے حاصل کی۔ بعدازاں اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں ملازم ہوگئے اور برانچ منیجر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ مرحوم عبدالاحد فرقانی نے 'قلم گوید' کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے جو منظر عام پر آنے کے لیے تیار ہے۔ اس کتاب میں رامپور کی مقتدر ادبی و سماجی شخصیات کو متعارف کرایا گیا ہے۔ مصنف کی خرابی صحت کے سبب رسم اجرا کی تاریخ زیرِالتوا تھی۔ اس کے علاوہ مرحوم کے مقالات بھی بڑی تعداد میں اخبار کی زینت بنے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 فروری 2022

کمال خان

لکھنؤ: ٹی وی نیوز چینل این ڈی ٹی وی سے وابستہ سینئر صحافی کمال خان کا حرکت قلب بند ہوجانے کے سبب انتقال ہوگیا۔ رہائش

گاہ بٹلر پیلس کالونی میں صبح قریب 5 بجے ان کی طبیعت بگڑی، انھیں ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے ان کی موت کی تصدیق کی۔ کمال خان کے اچانک انتقال سے ہر شعبۂ حیات میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ سیاسی و سماجی شخصیات نے رنج و غم کا اظہار کیا۔ ان کی عمر تقریباً 61 برس تھی، پسماندگان میں بیوی روچی اور بیٹا امن ہیں۔ ان کی تدفین سوگواروں کی کثیر موجودگی میں عیش باغ واقع کربلا ملکہ جہاں میں عمل میں آئی۔ ان کی نماز جنازہ مولانا سید کلب جواد نقوی نے پڑھائی اور اس سے قبل منعقدہ مجلس کو بھی مولانا نے خطاب کیا۔

کمال خان 22 سال سے 'این ڈی ٹی وی' سے جڑے رہے اور یوپی بیورو چیف کے طور پر کام کیا۔ ٹی وی صحافت سے قبل وہ لکھنؤ کے متعدد انگریزی و ہندی اخبارات میں کام کر چکے ہیں۔ ان کی اہلیہ روچی کمار انڈیا ٹی وی کی پولیٹیکل ایڈیٹر ہیں۔ کمال خان آبائی طور پر جونپور کے سپاہ محلّہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام حیدر حسین خان ہے۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد صحافت کی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ سے مکمل کی۔ متعدد اخبارات میں کام کرنے کے بعد 2003 سے این ڈی ٹی وی سے وابستہ ہوئے اور آخر وقت میں وہ یوپی ہیڈ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ کمال خان کو ان کی بہترین صحافت کے لیے 'رام ناتھ گوئنکا ایوارڈ' ملا، جو ہندوستان میں صحافت کے میدان میں سب سے باوقار ایوارڈ میں سے ایک ہے۔ انھیں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے 'گنیش شنکر ودیارتھی' ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ کمال خان نے بے باک صحافت و منفرد انداز سے صحافت کی دنیا میں اپنی الگ پہچان بنائی۔ الفاظ کا شاندار انتخاب کرتے تھے۔ وہ مشکل سچائیوں کو شاعرانہ مہارت کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ طرز گفتگو اور انداز بیان کی وجہ سے انھوں نے ملک و بیرون ملک لوگوں میں اپنی خاص جگہ بنائی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جنوری 2022

میگھ راج شریمالی

جے پور: راجستھان کے صحافی، شاعر، مصنف اور ریاست کے پانچ وزرائے اعلیٰ کے پریس اتاشی رہے میگھ راج شریمالی کا انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 91 برس تھی۔ ان کا انتقال 18 جنوری کی رات تقریباً 11.15 بجے جے پور کے ویشالی نگر میں واقع ان کی رہائش گاہ پر ہوا۔ مسٹر شریمالی بیکانیر میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ڈونگر کالج، بیکانیر سے گریجویشن مکمل کیا۔ تین سال قبل ان کی نظموں کا مجموعہ پھر کویتا کا روپ بدلتا بھی شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک آزاد صحافی کے طور پر ہفتہ وار اخبار 'جوالا' سے کیا تھا جو 70-1960 کی دہائی میں سیاسی تبصروں اور سماجی برائیوں کے خلاف تحریک کے طور پر جانا جاتا تھا۔ بعد میں وہ جے پور سے نکلنے والے دینک نوجیگ سے جڑ گئے اور سفیر سے بھی وابستہ رہے۔ جب مسٹر کرپور چند کولش نے راجستھان پتریکا کی شروعات کی تب مسٹر شریمالی ان کی ادارتی ٹیم میں تھے۔ میگزین میں انھوں نے منجھدار میں ندگی کالم شروع کیا اور کئی برسوں تک مسلسل لکھا۔ وہ ورکنگ جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے بانی رکن بھی تھے۔ سنہ 1958 میں سرکاری ملازمت میں شعبۂ تعلقات عامہ میں تعینات ہوئے۔ اس دوران ریاست کے اس وقت کے وزرائے اعلیٰ کے ساتھ پریس اتاشی کے طو ر پر کام کیا۔ انھوں نے راجستھان نہر (اندرا گاندھی نہر پروجیکٹ) پر پہلی ڈاکیومنٹری بنوائی۔ بانواڑہ، جودھ پور، جیسلمیر، اودے پور اور جے پور میں ضلع پبلک ریلیشن آفیسر تھے۔ وہ سال 1991 میں جوائنٹ ڈائرکٹر کے ساتھ قائم مقام ڈائرکٹر کے طور پر خدمات انجام دیتے ہوئے ریٹائر ہوئے۔ مسٹر شریمالی نے مقبول

ٹیلی ویژن سیریل بالیکا ودھو کے دو ہزار سے زیادہ اقساط کے سلوگن لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ ان کی اہلیہ کا بھی دو ماہ قبل انتقال ہوگیا تھا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 20 جنوری 2022

ڈاکٹر پردیپ مہندی رتا

لکھنؤ: اردو زبان و ادب اور لسانیات کے قائد ڈاکٹر پردیپ مہندی رتا کا انتقال امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔ اردو-ہندی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے دوسرے ممالک خصوصاً امریکہ میں متعارف کرانے والے اور زبانوں کے فروغ کو اپنا نصب العین اور ہدف بنانے والے ڈاکٹر پردیپ مہندی رتا کا تعلق ملتان پاکستان سے تھا اور آپ کی پیدائش بھی ملتان میں ہوئی تھی، تقسیم ملک کے بعد آپ بھی ملتان سے ہجرت کرکے ہندوستان منتقل ہوئے اور کچھ سال انبالہ اسٹیشن کے قریب سخت زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے اور اس دوران کافی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں، مگر ثابت قدم رہے اور لسانیات کی خدمت کو اپنا نصب العین اور مقصد حیات بنائے رکھا اور اردو زبان و تہذیب کے فروغ کے لیے لکھنؤ میں اردو پروگرام کا آغاز 2000 میں کیا جو آج بھی جاری ہے۔ ڈاکٹر مہندی رتا کو اردو زبان سے قلبی لگاؤ تھا کیونکہ آپ کا بچپن ملتان میں گزرا تھا، اس لیے اردو زبان اور تہذیب سے بہت قریب تھے۔ آپ بہت مہذب، شائستہ، نرم دل اور ہر دلعزیز شخصیت کے مالک تھے، جو بھی آپ سے ایک بار ملتا آپ کا گرویدہ ہوجاتا، اپنی کاوش اور نیک نیتی سے امریکہ میں ہندوستانی زبانوں اور تہذیب کے فروغ کے لیے 1962 میں امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز کا قیام کیا جو بعد میں ایک عظیم ادارے کی شکل اختیار کرگیا۔ مہدی رتا ابتداء سے اس ادارے کے ڈائرکٹر جنرل رہے او رپھر تادم مرگ ادارے کے نائب صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 جنوری 2022

وسیم کپور

کلکتہ: مغربی بنگال کے مشہور مصور اور پرنٹر وسیم کپور کا 24 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ وسیم کپور اردو کے مشہور شاعر اور مغربی بنگال اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین سالک لکھنوی کے صاحب زادے ہیں، تاہم فنون لطیفہ اور مصوری کے شعبے میں ان کی اپنی ایک علاحدہ شناخت تھی۔ وہ کئی سالوں سے فالج کے شکار تھے۔ انھوں نے

ہندوستان کی کئی نامور شخصیات کی تصویروں کی پرنٹنگ کی ہے۔ وسیم کپور 1951 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے انڈین کالج آف آرٹس اینڈ کرافٹ مین شپ سے فائن آرٹس میں فرسٹ کلاس ڈگری کے ساتھ گریجویشن کیا۔ انھیں 71-1970 میں اکادمی آف فائن آرٹس سے آل انڈیا ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1984 میں انھیں برلا اکڈمی آف آرٹ اینڈ کلچر سے آل انڈیا ایوارڈ ملا۔ 1984 میں انھیں ریاستی حکومت سے اعزاز ملا۔ 1985 میں انھیں ایشین پینٹس سے شرومنی ایوارڈ ملا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 25 جنوری 2022

نظام الدین

نئی دهلی: دہلی کی جامع مسجد کے اردو بازار میں واقع کتب خانہ انجمن ترقی اردو کے مالک اور اردو کتابوں کے سب سے بڑے تاجر نظام الدین کا مختصر علالت کے بعد 17 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 64 برس تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ان کی تدفین بعد نماز مغرب سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں دہلی گیٹ قبرستان میں عمل میں آئی۔ انھوں نے تعلیم اینگلوعربک اسکول میں حاصل کی تھی۔ ان کے کتب خانہ کی تاریخی اہمیت یہ تھی کہ ان کے والد منشی نیاز الدین مرحوم کے زمانے میں فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، مولانا منظور نعمانی جیسی اہم شخصیات تشریف لاتی تھیں۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے بتایا کہ نظام الدین کی خوبی یہ تھی کہ انھیں مختلف اور متنوع موضوعات کی ہزاروں اردو کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام ازبر تھے۔ انھوں نے ہر موضوع کی کتابوں کا ایک الگ رجسٹر بنایا تھا، جس میں مصنف کا نام، ناشر اور سنہ اشاعت بھی درج تھا۔ سیکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی اردو کتابوں کی ان تفصیلات کو اردو کتابوں کے انسائیکلوپیڈیا کی صورت میں شائع کرنے کی میری گزارش کو انھوں نے قبول کرلیا تھا، مگر اس سے پہلے ہی انھوں نے رخت سفر باندھ لیا۔ معصوم مرادآبادی نے بتایا کہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کے بانی ان کے والد منشی نیاز الدین مرحوم کی طرح بھائی نظام الدین بھی میرے کرم فرما تھے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جنوری 2022

محمود الحسن دلشاد

بتیا: نرکٹیا گنج کی مشہور ادبی تنظیم بزم کہکشاں کے بانی و سکریٹری، سینئر صحافی اور شاعر محمود الحسن دلشاد کا 6 جنوری بتیا کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 70 سال تھی۔ مرحوم کافی عرصہ سے بیمار چل رہے تھے۔ مرحوم نہایت ہی خلیق، ملنسار، خوش اخلاق اور نیک دل انسان تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک لڑکا اور چار لڑکیاں ہیں۔ ان کی پہلی نماز جنازہ بعد نماز ظہر نرکٹیا گنج کے شیو گنج میں ادا کی گئی، جبکہ دوسری نماز جنازہ بعد نماز عصر مرحوم کے آبائی گاؤں ساٹھی کے دھرم پور کے نیشنل پبلک ہائی اسکول کے احاطے میں مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی کے سینئر مدرس مولانا مشتاق احمد قاسمی نے پڑھائی اور تدفین ساٹھی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ انجمن اسلامیہ نرکٹیا گنج کے سکریٹری و جمعیۃ علما نرکٹیا گنج کے سرپرست نگر یز اختر نے مرحوم کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم دینی، سماجی اور ادبی کاموں میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ پروفیسر قمر الزماں قمر نے مرحوم کے انتقال کو چمپارن کے اردو شعر و ادب کے لیے ناقابل تلافی نقصان بتایا۔ مرحوم کے انتقال پر مختلف علمی شخصیات نے اظہار تعزیت کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 جنوری 2022

صداقت حسین

مظفر نگر: ضلع مظفر نگر، سندھاولی کے معروف مرثیہ خواں استاد صداقت حسین زیدی کا 11 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 87 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ، بیٹے اور بیٹیوں کے علاوہ پوتے و پوتیاں ہیں۔ ان کی تدفین آبائی قبرستان میں سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں عمل میں آئی۔ نماز جنازہ مولانا یوسف امنی نے پڑھائی۔ جنازے میں مولانا مظفر حسین، مولانا حسن مہدی، مولانا اطہر زیدی اور مولانا شبیہ حیدر کے علاوہ معروف شاعر اہل بیت شعیب نوگانوی، نواز عارفی شاہ پوری، ظفر عارفی، معروف نوحہ خواں شبیہ عباس عارفی، سوز خواں حیدر مہدی سمیت مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے شرکت کی۔ واضح رہے کہ مرحوم صداقت حسین زیدی فن سوز خوانی کے ماہر استادوں میں شمار ہوتے تھے اور مختلف بستیوں میں ان کے شاگرد موجود ہیں۔ مرحوم کے بڑے بھائی اور عالمی شہرت یافتہ سوز خواں استاد ریاض حیدر زیدی کا 14 روز قبل ہی پاکستان

کے کراچی میں انتقال ہوا ہے۔ مرحوم کے انتقال پر سوز وسلام ومرثیہ پڑھنے والوں کی دنیا میں غم کی لہر قائم ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 جنوری 2022

احسان بھارتی

نئی دھلی: معروف قوال اور گھنگھرو آواز کے بادشاہ احسان بھارتی کا راجدھانی میں انتقال ہوگیا۔ گنیز بک

آف ورلڈ ریکارڈ میں نام اندراج کرانے والے فنکار کافی وقت سے بیمار چل رہے تھے اور ان کی عمر تقریباً 71 سال تھی۔ پسماندگان میں بیوی انیسہ انجم، ایک بیٹا کرم حسن اور ایک بیٹی تسکین ہیں۔ واضح رہے کہ احسان بھارتی کو گلے سے 56 گھنگھرو کی آواز نکالنے کی وجہ سے 2 نیشنل ایوارڈز سے نوازا جاچکا تھا۔ یہ اطلاع محمد اجمل جو کہ احسان بھارتی کے بھتیجے ہیں نے دی۔ احسان بھارتی کے انتقال پر موسیقی کی دنیا اور ان سے جڑے لوگوں نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ پنچکوئیاں روڈ کے اندھ دوایالیہ بستی میں مقیم احسان بھارتی کے انتقال پر معزز شخصیات نے اظہار تعزیت پیش کی اور دعائے مغفرت کی، ان میں معروف گلوکار جاوید علی، مشہور قوال چاند نظامی، ہمسر حیات نظامی، عالمی امن کمیٹی کے کنوینر ماسٹر زاہد حسین، سوشل ورکر محمد قمر احمد، مومن کانفرنس کے ذمہ دار ڈاکٹر تاج الدین انصاری ودیگر کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی

عبداللطیف

پٹنہ: صحافی عبداللطیف کا 25 جنوری کو برین ہیمرج ہوگیا۔ آنا فاناً انھیں اندرا گاندھی کارڈیالوجی لایا گیا، جہاں جانچ کے بعد ڈاکٹر نے انھیں مردہ قرار دے دیا۔ وہ تقریباً 47 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹی اور ایک بیٹے کے علاوہ والدین حیات ہیں۔ جسد خاکی آبائی وطن لال مانی، گڈا جھارکھنڈ لے جایا گیا جہاں 26 جنوری کو تدفین عمل میں آئی۔ ان کے انتقال پر صحافی عبدالواحد رحمانی نے کہا کہ مرحوم دو دہائیوں سے روزنامہ راشٹریہ سہارا کولکاتا اور پٹنہ سے وابستہ تھے۔ اپنے طویل کیریئر میں انھوں نے جس خاموش مزاجی، سادگی اور ایمانداری کے ساتھ کام کیا، وہ دوسروں کے لیے مشعل راہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ دیر رات اپنے بورنگ روڈ دفتر سے کام کرکے نکلے تھے، کسی کو اندازہ نہیں تھا اب واپس نہیں لوٹیں گے۔ وہ ایک مستند عالم دین تھے، برسوں 'جمعیت اہل حدیث' دہلی سے بھی وابستہ رہے اور لکھنے پڑھنے کی خدمات انجام دیں۔ بھائی عبداللطیف چلے گئے، لیکن ان کی تواضع، خوش اخلاق، سادگی، اور خاموش مزاجی ہم سب کے بیچ گونجتی رہے گی۔ ان کے انتقال پر مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، مولانا کلیم اختر، ثناء اللہ ثناؔ دوگھروی، مصطفیٰ کمال، ماجد افضل، محمد نسیم اختر، ذاکر حسین، رئیس اعظم، محمد سلطان، ارشد اللہ، فروغ احمد، فرہاد انور وغیرہ نے غم کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جنوری 2022

معین الدین محورنوری

نئی دھلی: معروف اور بزرگ شاعر معین الدین محورنوری کا طویل علالت کے بعد 6 فروری کو انتقال ہوگیا، جس سے ادبی حلقوں بالخصوص ان کے معاصر شعرا میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ مرحوم دمے کے عارضے میں مبتلا تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ ادبی نشستوں میں بمشکل شریک ہو پا رہے تھے۔ ان کی عمر تقریباً 73 سال تھی، پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ 2 بیٹے اور 5 بیٹیاں ہیں، تدفین لونی کے قبرستان میں ہوئی۔ مرحوم کا ایک مجموعہ کلام 'سکوت کے بعد' عوام وخواص سے داد حاصل کرچکا ہے، ان کی شاعری میں جہاں خالص غزل کا عنصر پایا جاتا تھا، وہیں زندگی اور حالات حاضرہ کا کرب بھی بدرجہ اتم دیکھنے کو ملتا تھا۔ اظہار تعزیت کرتے ہوئے معروف شاعر سیف سحری نے کہا کہ محورنوری کے انتقال کے ساتھ ہی ہم نے ایک اچھے دوست اور شاعر کو کھودیا۔ یہ سچ ہے کہ عرصہ دراز سے وہ شدید عارضے میں مبتلا تھے کہیں آنا جانا نہیں ہوتا تھا، ملاقات بھی نہیں ہو پاتی تھی، مگر ان کی موجودگی ہمیں ایک الگ احساس اور تقویت بخشتی تھی جواب میسر نہیں ہوگی، اللہ مغفرت فرمائے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 فروری 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر............................... بتاریخ.............................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing 7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

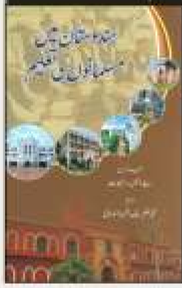

ترتیب وتدوین: جے ایس راجپوت

مترجم: محمد غطریف شہباز ندوی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 484، قیمت 245 روپے

مغربی تعلیم اور مسلمان

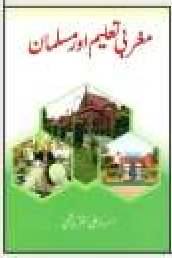

مصنف ومترجم: مسرور علی اختر ہاشمی

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 240

قیمت: 130 روپے

دیوان داراشکوہ

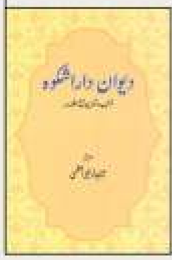

مترجم: شاہد نوخیز اعظمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 208

قیمت: 125 روپے

علم البیان: اقسام نثر ونظم

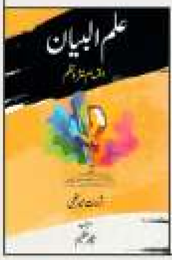

مصنف: ثروت میرٹھی، مرتب: نگار عظیم

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 258

قیمت: 140 روپے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

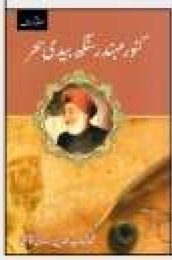

مصنف: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 135

قیمت: 85 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

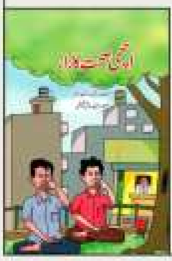

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, मार्च-२०२२,वर्ष:२४, अंक:३
URDU DUNIYA Monthly, March-2022, Vol.24, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/02/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

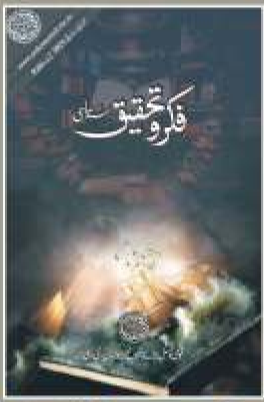

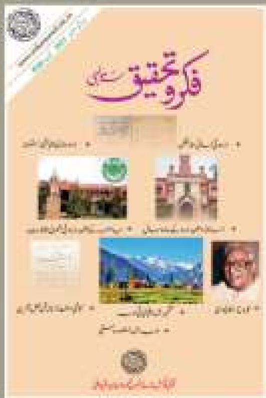

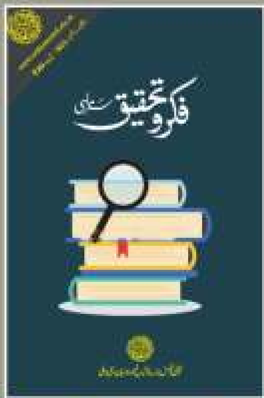

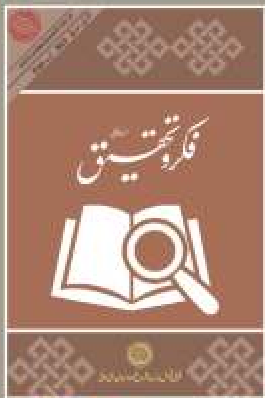

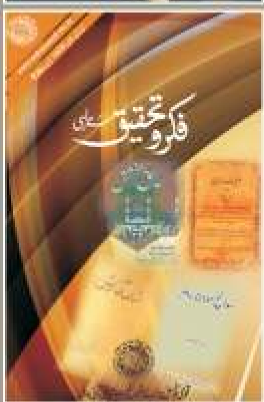

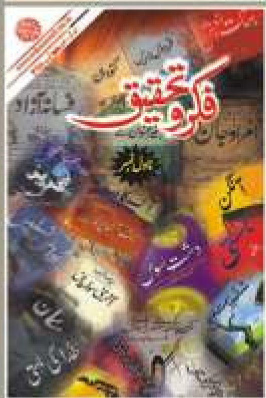

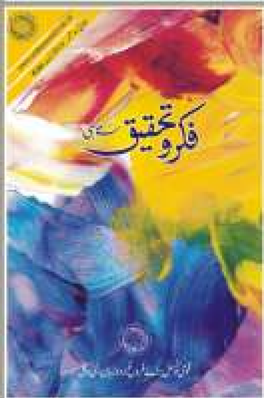

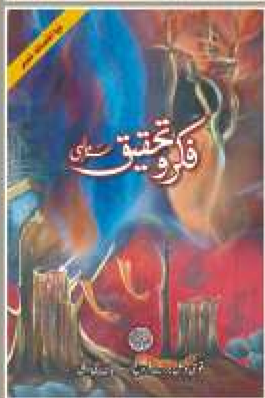

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6